

ترقی اسی میں ہے کہ صحیح چیز بناؤ اور دھوکا نہ دو

انٹرویوڈ کا فریچر ۲۰ سال بعد بھی کیوں خراب نہیں ہوتا؟

اُردو ڈائجسٹ

اپریل 2012

10 بڑی پیشین گوئیاں

جو آپ کو حیران کر دیں گی

وطن عزیز کی نئی پہچان بننے والی ۱۰۰ اہم کمپنیاں

پاکستان 100

پاکستان کی
پہلی آسکر
جیتنے والی فلم

سیونگ فیس

کا اصل ہیرو کون؟

شوگر و شبہات
میں چھپی اصل کہانی



۱۲۳	تجی رشید اعوان	گلی داؤدی کی ہر چار اقسام	گل رنگ
۱۲۹	ڈاکٹر ندیم اکرام	بڑے لوگوں کا اقبال	گوشہ اقبال
۱۳۶	پروفیسر غلام اعظم	یہ پچاسی میری خوش قسمتی ہوگی	تلخی حالات
۱۳۹	امیر حمزہ	جس درجے سے کوئی متعلق نہیں گیا	تذکرہ کرنل امام
۱۴۳	عمر وسیم پنہو	ایک ہفتے میں ۱۰۰ روپے	گدھاؤں میں ڈراما
۱۴۷	حافظ افروغ حسن	فروری ہیگم	محبت بھری یادیں
۱۶۱	رضیہ جمیل	دوسرا موقع	
۱۷۱	زر قافاطہ	نقصان	
۱۷۷	صداقت حسین ساجد	روٹی کا کلرا	
۱۸۵	آقامی حسین قلی مستغان	داڑے	کھانیاں
۱۹۳	روٹی فرناٹس	پھتری کی گواہی	
۱۹۹	نوبید انور	مسکراہٹ	
۲۰۱	نجمہ ثاقب	گیارہواں کٹی	
۲۰۹	غزالہ محمود	مقدر	
۲۲۱	انجم فاروق ساحلی	بہرپ	
۲۲۵	صبا شفیق	دنیا کے مشہور پل	ذہنی معلومات

۱۴	الطاف حسن قریشی	علم پرور ماں کا مثالی کردار	کچھ اپنی زبان میں
۱۸	الطاف حسن قریشی	تاریخ کی میزان	بہم کیوں گھڑے ہیں
۲۷	ڈاکٹر اختر حسین عزی	مجھے کی تاک	اسلامی زندگی کی کھینک
۳۱	عرویم پنہو	سیس میٹریت/سم ہمارا	لمحہ فکر
۳۳	انٹروڈ کے سربراہ فاروق ملک سے ملاقات	انٹروڈ کے سربراہ فاروق ملک سے ملاقات	انٹرویو
۴۱	ذکیہ احمد	کیا پاکستانی قوم ابھی تیار نہیں؟	فلاہی ریاست کا تصور
۴۷	امین رحمان	اصل بیرو کون؟	پاکستان کا نیا جیسرہ
۵۳	وصی شاہ	اصل بیرو والا وارڈ کے متعلق نہیں؟	موضوع سخن
۵۹	عاطف مرزا	پاکستان ۱۰۰	بزنس رول ماڈل
۶۵	نوبید اسلام صدیقی	ملک کے ترقی	گوشہ ست رنگ
۹۲	عاطف مرزا	خلائ میں دنیا بسانے کا تصور	ٹیلنٹ
۹۹	سید عامر محمود	بڑی پیشین گوئیاں	مستقبلیات
۱۰۵	محمود جمال	تجاوزیلوے اور سلطنت عثمانیہ	تاریخ کے آئینے میں
۱۱۱	اختر عباس	خوبصورت بابا	یاد رفتگان
۱۱۷	سلیم احمد	قسمت کے کھیل زلے	یہ مثل داستان
۱۲۰	ہادی حسین	آئی پی ایل کا جن بوتل سے باہر آگیا	بھارتی کرکٹروں کی خفیہ زندگی

لوگوں کا اقبال



خلا میں دنیا بسانے کا تصور

۲۵۳

۲۷

۹۲

۲۲۹	ہادی حسین	بیوی فالس	ہیوان عجیب
۲۳۱	سلطان مسعود احمد	لوڈ شیڈنگ کا توڑ	ذرا غور کیجیے
۲۳۵	عاطف مرزا	ایک کے بدلے ایک	سماجی خدمت
۲۳۹	پروفیسر ارشد جاوید	انگریزی پڑھنا..... مجبوری کیوں ہے؟	توجہ طلب
۲۴۱	عاصم محمود	تیز ترین انٹرنیٹ آگیا	کمپیوٹر سائنس
۲۴۳	صغیرہ بانو شیریں	دیوان گلہ مفتوں	ناقابل فراموش
۲۴۹	صغیرہ بانو شیریں	مشورہ حاضر ہے	مستقل سلسلہ
۲۵۳	قیوم نظامی	اقبال کی سوچ کا مرکزی خیال	اقبال اور اخلاقیات
۲۵۸	نوشین ناز	وزن کم کیجیے صحت نہیں	ایسا وزن منہا لائیے
۲۶۲	سلیم منقل	قصہ کوئز	کوئز
۲۶۴	راناج محمد شاہد	کھیلوں کی دنیا	کھیل کھلاڑی
۲۶۸	منظر ایوبی	حوالہ میری پسند کا	شعر و شاعری
۲۷۳	نوبہ اسلام صدیقی	مطالعے کی میز پر	کتاب گھر
۲۷۹	قارئین	چمن خیال	خطوط
۲۸۴	سروے	میری زندگی کو حیران کرنے والی کتاب	آئیے بات کرتے ہیں
۲۸۶	اختر عباس	درد پد دستک	مستقل کالم

علم پر درماں کا مشالی کردار

ہمیں ۲۱ اپریل کی تاریخ اس لیے یاد رہتی ہے کہ ۱۹۳۸ء میں اس دن حکیم الامت اور مصور پاکستان حضرت اقبالؒ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ وہ اپنے پیچھے ایک جہان افکار و معانی اور اسلامی افکار کی تشکیل جدید کا پیش قیمت خزانہ چھوڑ گئے تھے۔ ان کی شاعری، خطبات اور متوبات میں روح عصر کا جمال و جلال جھلکتا ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے رازداں اور مستقبل میں دور تک دیکھنے والے ایک دیدہ ور تھے۔ عشق رسولؐ ان کی داخلی قوت کا حقیقی سرچشمہ تھا اور وہ تب و تاب رازی اور سوز و کداز رومی کی لذتوں سے آشنا اور فلسفہ و حکمت کی بلندیوں پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنی عظمت کا راز، اپنی نظم و والدہ مرحومہ کی یاد میں، میں بیان کیا ہے اور زندگی و موت کی اہل حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے۔ اس نظم کے کچھ اشعار ماں کی رفعت کردار کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

ترہیت سے میں تیری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کی سبق تیری حیات
جرتی ہوں میں تیری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
زندگانی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
کتنی مشکل زندگی کس قدر آسان ہے موت
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں
موت ہے ہنگامہ آرا قلمز خاموش میں
ذوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

روحانی اعجاز سے کسی طرح کم نہیں کہ ہماری والدہ فردوسی بیگم کا انتقال بھی اپریل کے مہینے میں ہوا۔ ان کی روح نے یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو دار بقا کی طرف پرواز کی تھی اور ہم بہن بھائی مادری شفقت سے محروم رہ گئے تھے۔ ان کی رحلت کے صرف ۳ روز بعد ہم دونوں بھائی (ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، الطاف حسن قریشی) سول مارشل لاک کے تحت گرفتار کر لیے گئے تھے اور ہمیں طویل آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ آج ہماری والدہ کو اس دنیا سے کوچ کے ۴۰ برس ہو چکے ہیں، مگر ان کی زندہ جاوید شخصیت کا پرتو ہمیں آج بھی بھلائی کا راستہ دکھا رہا ہے۔ ہم نے اردو ڈائجسٹ کی اشاعت کے ۵۱ برسوں میں اس امر کا پوری طرح خیال رکھا کہ یہ جزیہ ذاتی یا خاندانی شہرت کا ذریعہ نہ بنے یا نہ اور اس نے ۳ برسوں کی ذہنی آبیاری کا جو فریضہ انجام دیا ہے اسے قوی سرمائے کے طور پر محفوظ رکھا جائے، مگر حضرت علامہ اقبالؒ کی والدہ ہوں یا ہم جیسے کم حیثیت اولاد کی ماں، وہ سب مسلمانوں کی قابل قدر اور مشترک میراث ہیں۔ مغرب تو ماں کی عظمت سے نا آشنا ہے اور احترام کی مصنوعی فضا پیدا کرنے کے لیے ”مرد ڈنے“ منانے کی رسم چل نکلی ہے جبکہ آقائے نامدار حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت آباد ہے۔

ہماری والدہ متوسط اور دین دار گھرانے کی ایک مثالی خاتون تھیں۔ ان کے نمایاں اوصاف سادگی، کفایت شعاری، غربی نوازی، مشرقی روایات کی پاسداری اور باہمی تعلقات کی چارہ گری تھے۔ انہوں نے رشتے داروں اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی توجہ دی اور ان کے اندر یہ شعور جاگزیں کر دیا کہ محدود وسائل کے ذریعے بھی اعلیٰ تعلیم اور بلند مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی خواہشات قلیل اور ان کے عزائم جلیل تھے۔ وہ چھائی کا ساتھ دیتیں اور امانت و دیانت کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ قرآن سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے افروز حسن کو حافظ قرآن بنایا۔ ہم ہند سے پہلے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم اور اچھی ملازمتوں کے مواقع انتہائی محدود تھے، اس لیے ہمارے سب سے بڑے بھائی جناب گل حسن میٹرک پاس کرنے کے بعد محکمہ انہار میں سکیٹن کے طور پر ملازم ہو گئے۔ برادر مکرّم اعجاز حسن قریشی بانی سکول سرسہ میں انٹرنش کے امتحان میں اول آئے اور مالی وسائل کی تنگی کے باوجود ان کا عشق علم انہیں علی گڑھ یونیورسٹی لے گیا جو پورے ہندوستان کی ایک منفرد مسلم یونیورسٹی تھی۔ جب اگست ۱۹۴۷ء کے اواخر میں مسلمانوں کا ایک باقاعدہ پیمپ قائم کیا گیا تو اعجاز صاحب نے کمانڈر کے طور پر بڑی جاں فشانی سے کام کیا اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ اس دوران ہماری والدہ

نے کمال فیاضی سے کام لیتے ہوئے ان کے پاس جو کچھ تھا، دوسرے علاقوں سے آنے والی خواتین میں تقسیم کر دیا۔
میں اسی سال اپنے باپ کی سکول سے میٹرک پاس کرنے والے طلبہ میں اول آیا تھا۔

ہمارے والد بزرگوار کو شیخ عبدالقادر، سعدی، رومی، غالب اور مولانا ظفر علی خان کے ہزاروں اشعار اور قرآن حکیم کی طویل سورتیں یاد تھیں، وہ ملازمت کے سلسلے میں مفتوں گھر سے باہر گزارتے اور جب آتے تو ہم سب بہن بھائیوں کو فجر کی نماز سے پہلے بیدار کرتے اور ہم سے قرآن کی سورتیں سننے اور ہمیں نصیحت آموز اشعار اور اللہ کے احکام سناتے۔ ان کی تلاوت میں ایک تاثیر اور ایک گداز تھا۔ ایک بار ان کا تادلہ ایسے گاؤں میں ہوا جس کی تمام آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ وہ معمول کے مطابق نماز تہجد میں بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کرتے تو ایک ماں بندھ جاتا اور وہاں کے مردوزن تہجد کی نماز کے وقت خاصی تعداد میں ان کی رہائش کے سامنے جمع ہو جاتے۔ والد صاحب نے ایک نہایت سادہ گھر سروسہ قصبے میں بنایا تھا اور وہ جب بھی دور سے واپس آتے، تو گاہے گاہے خواہش کا اظہار کرتے کہ میری اولاد میں سے بھی کوئی مولانا ظفر علی خان کے جیسا نڈر صحافی بنے۔ وہ مولانا کی بے باکی، شعلہ چٹائی اور برجستہ شاعری کے بہت مداح تھے۔ میں ان کی باتیں سن کر اکثر دل میں سوچتا کہ ہم پنجاب کے ایک پسماندہ علاقے میں آباد ہیں جہاں کسی علمی، صحافتی اور قومی تحریک سے استفادہ کرنے کا شاذ و نادر ہی کوئی امکان ہے۔ ایک پارسی خیال کا اظہار میں نے ابائی سے کیا تو انہوں نے بڑی رسانی اور بڑے اقبالانہ سے جواب دیا تھا کہ انسان کے اندر عزم ہو تو اللہ تعالیٰ اسباب یقیناً فراہم کر دیتے ہیں۔

ہمارا خاندان بے سرو سامانی کی حالت میں ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ یہاں فوری مسئلہ معاش کی تلاش تھا۔ میں نے برادر بزرگ جناب گل حسن سے سنگلنگ کی ٹریننگ لی اور بڑے بھائی اعجاز حسن کے ساتھ حمکمر انہار میں ملازمت اختیار کر لی اور حافظ افروغ حسن ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کے ایک سکول میں سچے تعینات ہو گئے۔ معاشی اعتبار سے ہمارے لیے آگے بڑھنے کے راستے اظہار مسدود تھے مگر والدہ صاحبہ نے بہتہ پیم اور کوشش ناتمام کی ایک ایسی جوت ہمارے سینوں میں جگا لی تھی کہ اس نے اعلیٰ تعلیم کا برف انکھوں سے اوجھل نہیں ہونے اور ہم تینوں بھائی ملازمتوں کے دوران اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہیں تلاش کرتے رہے۔ اعجاز حسن صاحب نے ایک جست میں بی۔ ایڈ اور ایم اے تاریخ کے امتحان پاس کر لیے اور انہیں جرمی کی ایک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لیے وظیفہ مل گیا۔ ۱۹۵۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کا یہ ایک نادر موقع جو والدہ کی دعاؤں سے میسر آیا تھا۔ اسی دوران حافظ افروغ حسن نے بی ایڈ اور ایم اے اسلامیات کے مراحل طے کر لیے اور وہ ۲۶ سال تک پوری ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کے منصب پر فائز رہے۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے اسے ایک مثالی تعلیمی ادارے کی حیثیت دی، قصبے کی فضا میں قرآن حکیم کے ساتھ پیشگی پیدا کی اور ہزاروں طالب علموں کی اخلاقی تربیت کا قابل رشک اہتمام کیا۔ یہ بلاشبہ ہماری والدہ کا فیضانِ نظر اور تربیت کا ثمر تھا۔ مجھے بھی پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے سیاسیات کے امتحان میں

اول آنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اور پھر قدرت ہم ۲۲ بھائیوں کو میدان صحافت میں لے آئی اور ہم ۳۳ ساتھیوں نے انتہائی قلیل سرمائے سے ماہنامہ آردوڈائجسٹ کا آغاز کیا۔ اس میدان میں ہم تقریباً نوادرتے تھے مگر ہمیں اپنے مقاصد کی عظمت پر کامل یقین تھا ہمارا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہمارے ادب اور صحافت میں جوش نگاری، اسلام سے بے زاری اور وطن سے بے تعلقی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، اس کا مقابلہ صاف ستھری، حقیقی اور صحت مند زندگی سے جدید انکشافات کی حیرت نایکوں اور عامی ادب سے مزین و دلچسپ تحریروں سے کیا جاسکتی ہے اور قارئین کے اندر تاریخی شعور، وطن سے محبت اور ہم جونی کی امنگ بھٹکی کی جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چند ہی برسوں میں ماہنامے کو وہ مقبولیت عطا کی جسے آردو صحافت میں ایک مہمہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ ملکی اور غیر ملکی مشاہیر کے انٹرویوز، ایب خاں کی جاہلانہ حکومت کی ہیبت ختم کرنے اور نوجوانوں کے اندر جڑے، اپنی شناخت کا شعور ابھارنے میں ناقابلِ فروغوش کردار ادا کیا۔ مولانا ظفر علی خان کا سب سے بڑا کارنامہ انگریز اور ہندو سامراج کا رعب تحلیل کرنا اور مسلمانوں کے ذہنوں اور دلوں میں احیائے علوم کا جذبہ بیدار کرنا، ایک اعتبار سے یہی کام ایک قدرے مختلف انداز سے ماہنامہ آردوڈائجسٹ انجام دے رہا ہے۔

ایک صدی کا خون جو خود لکھنیاں جاتی تھیں، انہوں نے قرآنی تعلیمات اور اپنے حسن عمل سے ہمیں تحریک و ہنر سکھایا جس کی آب و تاب خدائے رحمن و رحیم کے فضل سے آج بھی قائم ہے اور خلق خدا میں ایک بادقار اور آزاد زندگی بسر کرنے کا عزم واضح کر رہا ہے۔ ہماری والدہ مرحومہ کی داستان حیات ایک یا چند خاندانوں کی سرگزشت تک محدود نہیں بلکہ اس میں کم وسائل طبقات کے لیے آفاقی پیغام یہ ہے کہ وہ بھی خدا داد صلاحیتوں کو صحیح طور پر بروئے کار لا کر انجم کے ہم قسمت بن سکتے ہیں۔ دراصل فردوسی بیگم ایک جیتا جاگتا اور زندہ رہنے والا کردار ہے اور ان کی داستان سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ دلکش اور حوصلوں کو ہمیز لگانے والی ہے۔ محترم جناب حافظ افروغ حسن نے آج سے ۲۷ عیشوں پہلے ان کی حکمت زندگی قلم بند کی تھی جسے ہم دوبارہ شائع کر رہے اور امید رکھتے ہیں کہ ہماری نسل ایک نئی حرارت اور ایک نئی پیش سے بہرہ ور ہوگی جو بیت کھوٹ پگھلا دیتی اور عمل کے سونے کو کندہ بناتی ہے۔ انہوں نے اپنی اولاد میں خیر خوی اور اخوت کے اعلیٰ جذبات کی یاد دہانی کے پہلو پہلے اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ اخلاقی تربیت کا اہتمام عبادت کے طور پر کیا تھا اور دیادہی مال و متاع پر کردار سازی کو فوقیت دی تھی۔ آج ہماری قوم کو نوجوانی بنیادی اوصاف کی زباہ ضرورت ہے۔ ایسے عظیم الشان کردار کی حامل ہستیاں روز بروز پیدا نہیں ہوتیں، ان کے پایزہ عمل کی خوشبو سے گلشنِ ہستی میں رنگ بھرا جاسکتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ والدہ مرحومہ کی قبر پر آسمان شہنشاہی کرے، عین ان کے روح پرور مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا کرے۔ اب خدائے لم یزل ہمارے برادر بزرگ جناب گل حسن، ان کی اہلیہ اور مرحومہ بھائی رضیہ اعجاز پر دنیا و آخرت میں اپنی رحمتیں نازل فرمائے جنہوں نے ہمارے والدین کی خدمت گزاری کی نہایت عمدہ مثال قائم کی جو ہم سب کے لیے سرمایہ اخذ ہے۔

الطافہ حسن قصبی

ہم کہاں کھڑے ہیں



الطاف حسن قریشی کے مسلم

تاریخ کی میزان

پاکستان سلام و اوقات کے ٹل صراط سے گزر رہا ہے۔ معاشرے کا شیرازہ کبھی مضبوط اور یکجہ منتظر دکھائی دیتا ہے، جبکہ حوادث کے ٹھیسرے ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر سکتے ہیں مگر یہی ٹھیسرے ہمارے عسکرانوں کی ہوش آرد میں اضافہ کیے دیتے ہیں حالات حاضرہ کا تجزیہ، الطاف حسن قریشی کے مسلم سے

انڈین کانگریس نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد صوبوں میں اپنی حکومتیں قائم کیں اور ایک ڈیڑھ سال ہی میں اس کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ سکولرازم اور جمہوریت کی مالا جتنے والی اس جماعت نے مسلمانوں کی تہذیبی، دینی اور معاشرتی شناخت مٹانے میں بھی حربے استعمال کیے اور وہ اس جنون میں حد سے گزرتی چلی گئی۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ نے اس کی چہرہ دستیوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جو "پیر پور رپورٹ" کے نام سے ایک دستاویز منظر عام پر لے آئی جس کے بطن سے قرارداد لاہور نے جنم لیا۔ یہ قرارداد منٹو پارک میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پیش ہوئی جو ۲۴ مارچ کو حضرت قائد اعظم کی زیر صدارت منظور ہوئی تھی۔ اس میں کامل اتفاق رائے سے ایک لاکھ سے زائد مجمع کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان تاریخی تہذیبی، سیاسی تصورات اور مذہبی عقائد کے اعتبار سے دو الگ قومیں ہیں، اس لیے برصغیر کے مسلمان اپنے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ سات برسوں پر محیط سیاسی اور آئینی جدوجہد کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست وجود میں آئی جو بیسویں صدی کے سب سے بڑے سیاسی معجزے کے طور پر یاد رکھی جانی رہے گی۔

☆☆☆

پاکستان کے آئینی خدوخال کے تعین کی خاطر پہلی دستور ساز اسمبلی میں وزیر عظمیٰ لیاقت علی خاں نے ۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو "قرارداد مقاصد" پیش کی جو ۱۲ مارچ کو منظور ہوئی۔ یہ دستاویز اسلام کے آفاقی اور جمہوریت کے جدید تصورات کا ایک حسین امتزاج تھی جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہے اور اس نے جمہور کو جو اختیارات تفویض کیے ہیں وہ مقدس امانت ہیں اور انہیں صرف عوام کے منتخب نمائندے استعمال کرنے کے حق دار ہوں گے۔ اس میں ایک طرف یہ عہد کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر قرآن و سنت کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا اور دوسری طرف یہ ضمانت دی گئی تھی کہ اقلیتوں کو اپنے مذہب اور اپنی ثقافت کی ترویج کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اس تاریخی دستاویز میں عدلیہ کی "آزادی"، قانون کی حکمرانی کی تحریروں و تقریر کی آزادی اور تمام شہریوں کے مابین برابری کے اسلامی اصولوں کے مطابق معاشرہ تعمیر کیا جائے گا۔ "قرارداد مقاصد" کو ہماری تاریخ میں مکیانہ کارنامہ کی حیثیت حاصل رہی ہے اور ہمارے تمام دستاویزی اس کی روشنی سے فیض یاب ہوئے ہیں، یہ الگ بات کہ ہمارے حکمران صراطِ مستقیم سے ہٹنے اور شخصی حکومتیں قائم کرنے کے مہلک تجربات کرتے رہے۔

اصولی طور پر قرارداد مقاصد کی بنیاد پر دستور سازی کا مرحلہ بہت جلد طے پا جانا چاہیے تھا، مگر بعض سیاسی مشکلات اور مول اور ملٹی بورور کریسی راستے میں حائل ہوتی رہیں۔ پہلی دستور ساز اسمبلی نے وزیر اعظم محمد علی بوگرا کی قیادت میں باہمی رضامندی سے اور جمہوری تقاضوں کے عین مطابق ایک دستور منظور کر لیا تھا جسے

تاریخ

عالم اور قصص القرآن میں قوموں اور امتوں کے عروج و زوال کے اصول بیان ہوئے ہیں جن میں سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ کوئی تمدن یا کوئی معاشرہ جب تک اخلاقی اور علمی طاقت کی امانت اور اہلیت کا مظاہرہ کرتا ہے اسے عروج حاصل رہتا ہے اور اس میں ترقی اور خوشحالی کے امکانات روشن تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، جب سوسائٹی کی مقتدر طاقتیں سرکشی پر آتی ہیں اور اس کے حکمران اخلاقی اور سماجی بندشوں سے نیکر آزاد ہو کر حد سے گزرنے لگتے ہیں، تو وہ بولناک تباہی سے دوچار ہوتے اور بعض اوقات صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ رومن ایسپائز کے آثار و قدیمہ اس کے زوال کی عبرت ناک داستان سناتے ہیں اور ہماری تاریخ بھی مختلف سلطنتوں کے عروج و زوال کی حکایتوں سے بھری پڑی ہے، لیکن ہم بیسویں صدی کے ابتدائی تین عشروں کے جائزے سے اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ برہمن قیادت کی تنگ نظری اور عاقبت نااندیشی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی جو یواریں اٹھائی گئی تھیں، ان کے شدید منفی اثرات آج بھی پاک بھارت روابط میں پوری شدت سے محسوس ہو رہے ہیں۔

قائد اعظم کے یوم ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو نافذ ہونا تھا، لیکن آئینی اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے گورنر جنرل ملک محمد عامر نے اسمبلی تحلیل کر دی ہے آئینی جواز فراہم کرنے کے لیے پاکستان کے چیف جسٹس محمد منیر نے ”قانون ضرورت“ ایجاد کیا جو کئی بار دفن کیے جانے کے باوجود آج بھی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ گورنر جنرل اپنی مرضی کا دستور کو کنٹینر بلا کر اپنی پسند کا آئین مسلط کر دینا چاہتے تھے، مگر فیڈرل کورٹ نے حکومتی ریفریس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک نئی دستور ساز اسمبلی تشکیل دینے کا پابند کر دیا۔ نئی دستور ساز اسمبلی نے چند بنیادی معاملات پر سمجھوتہ کرتے اور دونوں بازوؤں کے جائز تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے دستور منظور کیا جو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ ہوا۔ پورے ملک میں اس عظیم کارنامے پر شادیاں بچائے گئے اور مشرقی پاکستان میں خوشیوں کا ایک سیلاب اُٹھ آیا تھا، کیونکہ پاکستان اب ڈومنین آسٹریلیس سے نکل کر ”اسلامی جمہوریہ“ بن گیا تھا اور ہمیں اسی روز جن معنوں میں تاج برطانیہ سے گلو خلاصی حاصل ہوئی تھی۔ اس اہم پیش رفت کے بعد سرکاری سطح پر ۲۳ مارچ ”یوم پاکستان“ کے طور پر منایا جانے لگا اور ان شاء اللہ رقی دنیا تک منایا جاتا رہے گا۔

☆☆☆

پاکستان نے حصول آزادی کے بعد جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑے بڑے کمالات دکھائے وہاں حکمرانوں کی بد مستیوں، سرکشیوں اور اخلاقی بد عنوانیوں کے باعث اسے تاریخ کی بدترین شکست و ریخت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے ”سیاسی زور بازو“ پر قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی تھی، مگر اس وقت کے فوجی حکمران اور پیپلز پارٹی کے چیزمین مشر بہو انیس اقتدار منتقل کرنے کے لیے کسی طور آمادہ نہیں تھے، چنانچہ انہی کی ملی بھگت سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیڈروں کے مابین سیاسی مذاکرات کا نام ہوئے اور یوم پاکستان کے صرف ۲۸ روز بعد یعنی ۲۵ مارچ کی رات مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہوا۔ شیخ مجیب الرحمن گرفتار کر کے میانوالی جیل بھیج دیے گئے جبکہ مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندے کھلتے کے بھارتی کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے بعد میں جلاوطن حکومت قائم کرنے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ سیاسی معاملات میں خون کی ہولناک آمیزش کے باوجود بیک جھیلوں کے ذریعے سیاسی مصالحت کی ایک راہ نکال بھی لی تھی، مگر جنرل یحییٰ خاں حد سے گزرتے گئے اور اُن کی بے حساب شراب نوشی اور لُٹس پرستی کے سبب پاکستان کو اپنے مشرقی بازو سے بالآخر ہاتھ دھونے پڑے اور پوری دنیا کے سامنے اسے ذلت و رسوائی کا سامنا بھی رہا۔ تاریخ میں حد سے گزرنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

چیف سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر مشر بہو برسر اقتدار آئے اور بڑھ سال کی سیاسی ریاضت کے بعد متفقہ دستور بنانے میں کامیاب رہے جس میں پریس کی آزادی، عدلیہ کی خود مختاری اور صوبائی حقوق کی

ضمانت دی گئی تھی، لیکن علمی طور پر ان تمام ضمانتوں کی قیادت کے باوجود چاک ہوتی رہی۔ مشر بہو پیپلز پارٹی کے علاوہ کسی دوسری جماعت کی حکومت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج کے مطابق نیپ نے بلوچستان میں حکومت بنالی تھی جس کے وزیر اعلیٰ سر دار عطاء اللہ میگل منتخب ہوئے تھے۔ صوبہ سرحد میں جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے نیپ کے تعاون سے کابینہ تشکیل دی۔ مشر بہو نے مختلف الزامات لگا کر سر دار عطاء اللہ میگل کی حکومت پر طرف کر ڈالی جس کے رد میں بعض بلوچ قبائل پہاڑوں پر چلے گئے اور ایک نیم بغاوت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لشکروں کی سرکشی فرو کرنے کے لیے بلوچستان میں فوجی آپریشن کا اعلان ہوا جس میں فوج کے تین ڈویژن استعمال ہوئے۔ سر دار عطاء اللہ میگل کی برطرفی پر احتجاجاً مفتی محمود بھی مستعفی ہو گئے اور یوں بلوچستان اور سرحد میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں مصنوعی آئین کے ذریعے کھڑی کر دی گئیں۔ اس دوران نیپ کی جماعت کو غیر قانونی قرار دے دے کر اس کی قیادت پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کے لیے حیدر آباد ریجنل قائم کیا گیا جس میں انصاف کے قتل عام کی بدترین مثالیں دیکھنے میں آئیں۔

☆☆☆

وزیر اعظم بھٹو ”ڈیموکریٹ“ ہونے کے باوجود پریس اور عدلیہ کی آزادی کے سخت مخالف تھے۔ اُن کے ”ایام جمہوریت میں اردو ڈائجسٹ زندگی“ پنجاب، پنج، سن، آؤٹ لُک، جہازت اور حریت بار بار بند ہوئے اور اختلاف کا اظہار کرنے والے صحافی پس دیوار زنداں بھیج دیے گئے اُن کے اخبارات و جراند پر ٹیکس کی چوری کے مقدمات بنانے کے علاوہ اُن کے پریس بھی ضبط کر لیے گئے۔ سیاسی آوازیں دبانے کے لیے فیڈرل سیکوری فورس کی ایک نئی تنظیم کھڑی کی گئی جس کے سیاہ کار ناموں کا شمار کر کے آج بھی دل دہل جاتا ہے۔ جیلوں میں امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد اور مسلم لیگ کے راہنما ملک محمد قاسم پر جس نوعیت کا تشدد ہوا اس نے انگریزی دور کے مظالم کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات کم کرنے اور انہیں پسند کے قالب میں ڈھالنے کے لیے جناب وزیر اعظم نے آئین میں چار بار ترمیم کراتے اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اعلیٰ عدالتوں کے فاضل چیف جسٹس تبدیل کرتے رہے۔ اُن کے دور کا بدترین واقعہ جو تاریخ میں محفوظ ہو چکا ہے۔ پیر آف پگڈا کے ایک ایٹمی اے ہر طرح کے پھکنڈوں کے باوجود پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ ہوئے اور اصولوں پر ڈٹے رہے۔ اُن کے خلاف حکومت نے مقدمات کے بے دریغ وار شروع کر دیے۔ ایک سر ملے بروہیشن جج سنگھریج عدالت میں پیش ہوئے اور اپنی داستان الم بیان کی۔ حکومت کا موقف سن لینے کے بعد فاضل جج نے درخواست پر فیصلہ لکھنا شروع کیا کہ سارے مقدمات میں ضمانت لی جاتی ہے اور حکومت کو ہدایت کی جاتی ہے کہ نیا مقدمہ بنانے سے پہلے عدالت کی منظوری لی جائے۔ وہ ابھی فیصلہ لکھ ہی رہے تھے کہ پولیس کے افسر عدالت کے اندر داخل ہوئے اور جج صاحب کو پھکنڈیاں پہنا کر عدالت سے باہر

لے گئے۔ بڑی مشکل سے درپردہ کوششوں کے بعد انہیں رہائی ملی تھی اور عدالتی نظام کو بہت دھچکا پہنچا تھا۔
 پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ مشر بنھو نے سیاسی مخالفین کے ساتھ ساتھ اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی سبق سکھانا شروع کر دیا۔ محمد حنیف رائے، مسٹر جے اے رحیم ثواب خان، اکی غلام مصطفیٰ گھر، رائے منور، محمد سلیمان، رانا مختار اور معراج محمد خاں ان کے عتاب کا نشانہ بنے۔ جناب جے اے رحیم پینلر پارٹی کی ایک عظیم شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے جنہوں نے اس جماعت کی تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان سے ناراض ہوئے تو مشر بنھو نے انہیں بڑی اذیت سے دوچار کیا۔ اسی طرح جناب معراج محمد خاں جن کو بھٹو صاحب نے اپنا جان نشین نامزد کیا تھا، ان پر جیل میں اس قدر تشدد کیا گیا کہ ان کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ بھٹو صاحب کا پانچ سالہ دور حکومت جمہوریت شناس اُصناف پسند اور دینی مزاج رکھنے والے اہل وطن کے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔
 اقتدار کی ہوس نے ان کا سیاسی اور ذہنی توازن یکسر بگاڑ دیا تھا۔ تاریخ میں بلا مقابلہ غیب ہونے کا اعزاز اور پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کا جوں ان کے اعصاب پر اس شدت کے ساتھ سوار ہوا کہ اس نے انہیں ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دو تہائی پیمانے پر بے رحمی سے ہند کر دیا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ حد سے گزرتے اور اللہ کی بکڑ کا سزا اور سبھرتے جا رہے ہیں۔ ان سے غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہوتی گئیں اور اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے لگے۔ متقبل پر نگاہ رکھنے والے اہل بیتش ان کے المناک انجام پر بہت صدمہ پہنچا تھا، جبکہ انہوں نے بعض اچھے کام بھی کیے تھے، مگر شاید قدرت ان کے بارے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

جنرل ضیاء الحق مشر بنھو کے خلاف عوامی تحریک سے پیدا ہونے والا خلا پر کرنے کے لیے مارشل لاء نافذ کر کے برسر اقتدار آئے۔ ان کے دور میں سابق وزیراعظم بھٹو کو پھانسی دی گئی جس کا گہرا اثر ہماری تاریخ ابھی تک مندرل کرنے میں نا کام رہی ہے۔ جنرل صاحب کو آغاز میں عالمی برادری کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا ہوا، تاہم افغانستان پر سویت یونین کی یلغار نے معاملات بڑی حد تک ساڑا کر بنا دیے تھے۔ وہ اسلام کی طرف مائل تھے، مگر خارجی نواہر میں اُلجھ کے رہ گئے تھے جس کے نتیجے میں فرقہ واریت کو ہوا ملی۔ عراق اور ایران کی چپقلش نے پاکستان کی سیاست کو بڑی طرح متاثر کیا اور بیرونی ممالک سے ملنے والی امداد سے پورے ملک میں فتنی مسلک کی بنیاد پر مدر سے اور مسلح تنظیمیں قائم ہوتی گئیں۔ وسائل سے مالا مال مسلم ممالک، امریکا اور یورپی یونین کے تعاون سے افغانستان میں سویت یونین کی تاریخی شکست پر خوشی سے وہ شرار ضرور ہوئے، مگر وزیراعظم جونہی وحدہ و بصیرت اور امریکی شاطرانہ پالیسی کے سبب وہ ایک ناقابل رشک انجام کی طرف دھکیل دیے گئے۔ ان کا موقف تھا کہ جینوا معاہدے سے پہلے افغانستان میں ایک وسیع اہلیا و حکومت کے قیام پر امریکا، روس اور پاکستان کے مابین سمجھوتہ ضروری ہے تاکہ افغانستان خانہ جنگی سے محفوظ رہے۔ ان کی سوچ بلاشبہ

نہایت گہرے تدبیر کی آئینہ دار تھی، مگر امریکہ کے دماغ میں جلد سے جلد جینوا معاہدے پر دستخط کر کے باقاعدہ طور پر دنیا کی واحد سحر پاور بن جانے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ وزیراعظم محمد خاں جونیجو نے بڑی سادگی سے آل پارٹیز کانفرنس بلائی، محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنے دائیں ہاتھ بٹھایا اور سیاسی قائدین سے جینوا معاہدے کی منظوری حاصل کر لی۔ اس حکومتی ہمہ میں سینیٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خاں بھی انہی کے ہمنوا تھے۔

جینوا معاہدے پر دستخطوں کے چند ہی روز بعد صدر جنرل ضیاء الحق نے جناب جونہی کی حکومت کو اس وقت برطرف کرنے کا اعلان کیا جب وہ جین کے دورے سے اسلام آباد پہنچے تھے۔ قومی اسمبلی جن الزامات پر تحلیل کی گئی تھی، وہ بادی النظر میں نہایت بودے اور مضحکہ خیز تھے۔ جنرل صاحب اپنے اس اقدام کے بعد پاکستان کے اندر اور پاکستان کے باہر تنہا ہوتے گئے۔ انہوں نے اپنے اقتدار کو سہارا دینے کے لیے چند تیز رفتار اقدامات بھی کیے، مگر وہ اندر سے اپنے آپ کو غیر محفوظ اور بے سہارا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں دشواری پیش آرہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے فوج بھی انہیں ایک بوجھ سمجھنے لگی ہو۔ میں نے ان کے پریس سیکرٹری بریگیڈیئر صدیق سالک کو بہت زیادہ دل برداشتہ اور غم زدہ پایا۔ ان کا خیال تھا کہ جو سیاسی نظام جنرل صاحب نے سخت آزمائشوں کے باوجود وضع کیا تھا، انہوں نے ایک لمحہ پریشان میں اسے زبیں بوس کر ڈالا تھا۔ ضیاء الحق جب ۱۲ اگست ۱۹۸۸ء کی تقریب سے خطاب کر رہے تھے تو ان کا چہرہ سفید کاند کی مانند ہو چکا تھا۔ تاریخ کی میزان میں ان کی زندگی کے دن تو لے چاکے تھے۔ ۱۲ اگست کی سہ پہر ان کا فوجی طیارہ ایک خوفناک حادثے سے دوچار ہوا جس میں بہت قیمتی جرنیلوں کے پرچے اڑ گئے، تاہم یہ عجیب منظر دیکھنے میں آیا کہ جنرل ضیاء الحق کے جنازے میں شرکت کے لیے عوام پورے ملک سے جوق در جوق چلے آئے تھے۔

☆☆☆

گروش دوران نے جنرل پرویز مشرف کو ۱۹۹۹ء کے آخر میں اسی کٹھن مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۷ء کے وسط میں کھڑے تھے۔ امریکا اور عالمی برادری ان کی حکومت کو سب جواز دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ناگاہ ناہن ایون کا ساتھ پیش آیا اور افغانستان پر حملے کے لیے امریکی انتظامیہ کو پاکستان کے تعاون کی سخت ضرورت تھی۔ اس موقع پر امریکی وزیر خارجہ کی ایک ٹیلی فون کال پر جنرل مشرف نے سارے مطالبات مان لیے اور یوں وہ مغرب کی آنکھوں کا تار بن گئے۔ انہوں نے اقتدار میں آنے کے چند ہی ماہ بعد پہلا پی سی او جاری کیا اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو اس پر حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس سعید الزماں صدیقی نے بڑی مردانگی سے یہ حکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، تو انہیں گھر میں بند کر دیا گیا اور فوجی دے اس وقت ہٹائے گئے جب دوسرے جج صاحبان پی سی او پر حلف لے چکے تھے۔ سپریم کورٹ اور سندھ ہائی کورٹ سے دو درجن کے لگ بھگ جج صاحبان فارغ کر دیے گئے اور جسٹس ارشد وحسن خاں

چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہوئے۔ انہوں نے 'قانون ضرورت' کے تحت فوجی انقلاب کو آئینی جواز فراہم کر دیا ۳۳ برس کے اندر انتخابات کرانے کی مہلت دے ڈالی اور درخواست گزار کی طرف سے کسی استدعا کے بغیر فوجی آمر کو آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی دے ڈالا۔ وہ ریٹائر ہوئے تو چیف الیکشن کمشنر کے منصب پر بٹھا دیے گئے جنھوں نے فوجی آمر کے تقاضوں کے مطابق عام انتخابات کا پورا سا بیج تیار کیا اور جنرل مشرف اپنی پسند کی قومی اسمبلی مسلط کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے، مگر جب افتخار محمد چودھری پاکستان کے چیف جسٹس بنے، تو عدالت عظمیٰ نے آزاد روش کا مظاہرہ شروع کر دیا جو آمر مطلق کے سینے میں ایک تیرہ نیم کش کی طرح ترازو ہوتی گئی۔

چشم فلک نے ۹ مارچ ۱۹۹۹ء کے روشن مینار کے مد مقابل ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو ہماری تاریخ میں ایک سیاہ باب نگہ ہوتے دیکھا۔ جنرل پرویز مشرف اس روز اپنے چار پانچ جرنیلوں کے درمیان جلوہ آراہتے جبکہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے قاضی القضاۃ سے کہا کہ ہمارے پاس آپ کے خلاف سنگین الزامات کی ایک طویل فہرست ہے اس لیے آپ اسی وقت مستعفی ہو جائیں۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ الزامات دیکھنے کے بعد ہی کوئی حتمی بات کہہ سکوں گا۔ پاکستان کے مختار گھل کی طبع نازک پر یہ جواب گراں گزرا اور وہ اپنے ساتھیوں کو 'مزاح درست' کرنے کا حکم صادر کر کے نماز جمعہ کے وقت صدارتی نیپ سے باہر چلے گئے۔ فاضل چیف جسٹس ارباب اقتدار کی شکن آلود جبینوں پر حزب انکار کا تیر چلا گئے تھے اور اس کی پاداش میں انہیں جب شام کے ۴ بجے باہر جانے کی اجازت ملی تو ان کی کار سے جھنڈا اتارا اور ان کی برطانی کا اعلان ہو چکا تھا۔ واپسی پر انہیں اپنی رہائش گاہ کے اندر قید کر دیا گیا۔ ان کے بچوں کو اسکوٹل جانے اور بیمار بیٹے کو دوا لینے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور رہائش گاہ کے ٹیلی فون کاٹ دیے گئے تھے۔ انہوں نے کئی روز حالت اسیری میں گزارے اور ۱۳ مارچ کی صبح جب وہ سپریم جوڈیشل کونسل میں پیشی کے لیے کھڑے ہوئے پیدل روانہ ہوئے تو سرکاری اہلکاروں نے انہیں بالوں سے کھینٹا اور ان کا دامن تار تار کر ڈالا۔ یوں اندھا اقتدار حد سے گزرا اور اپنے زوال کی تیر کو تار ہا۔

☆☆☆

فاضل چیف جسٹس پروحشا نے حملے کے خلاف سب سے پہلے سپریم کورٹ بار ایبوسی ایشن کے صدر جناب منیر اے ملک نے مردانگی کے ساتھ آواز اٹھائی اور وکلاء برادری سے پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جانے کے لیے دردمندانہ اپیل کی۔ اس وقت ملک صاحب کی بہن سعدیہ سندھ حکومت میں وزیر تھیں اور عام خیال تھا کہ وہ حکومت سے منکر نہیں لیں گے، مگر ان کی جرأت رندانہ نے آغا فانا عوامی مزاحمت کا ماحول پیدا کر دیا۔ اس کے فوراً بعد سندھ ہائی کورٹ بار ایبوسی ایشن کے صدر جناب رشید اے رضوی نے نعرۂ مستان بلند کیا کہ ہم جبر کے خلاف

ایک سیدہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوں گے اور وکلاء برادری عزیمت و استقامت کی ایک نئی تاریخ رقم کرے گی۔ ان توانا آوازوں میں سندھ ہائی کورٹ کے سابق جسٹس جناب مامون قاضی نے زبردست اضافہ کیا اور یہ اعلان بڑے پُر اعتماد دلچسپی میں کیا کہ ریاست کے ایک ادارے نے دوسرے ادارے پر حملہ کر دیا ہے جسے ناکام بنانے کی بھاری ذمہ داری وکلاء برادری اور سول سوسائٹی پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے والد بزرگوار جناب غلام رسول قاضی بھی ایک تاریخی عظمت کے حامل تھے کہ جب وہ وفاقی وزارت قانون میں جوینٹ سیکرٹری کے منصب پر فائز تھے، تو ایوب خاں چیف جسٹس کیانی کو گرفتار کرنے کے درپے تھے جب انہوں نے وزارت قانون کو اس ضمن میں سرری بھیجنے کے لیے ہدایت جاری کیں۔ اس وقت کے سیکرٹری قانون ایک انگریز تھے اور توہین عدالت کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جناب غلام رسول قاضی کو سرری تیار کرنے کے لیے کہا، 'سرری' لکھی تو اسے پڑھ کر درست کر دینے کا مشورہ دیا کہ وہ یہ سرری لے کر خود صدر ایوب خاں کے پاس چلے جائیں۔ صدر صاحب نے وہ سرری پڑھی، تو وہ بار بار کبھی آسمان اور کبھی قاضی صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ اس میں دیے ہوئے دلائل نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں اور ان کے لیے سرری کو داخل دفتر کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

☆☆☆

فاضل چیف جسٹس سے بدسلوکی کے سارے مناظر نے دی پر دکھائے جا رہے تھے جو عوام کے اندر شدید رد عمل پیدا کرنے کا باعث بنتے چلے گئے۔ فاضل چیف جسٹس کا مقدمہ لڑنے کے لیے بیرسٹر اعجاز احسن مردانہ وار آگے آئے اور وہ اپنے مضبوط دلائل اور عوام کی حمایت کے ۵ ماہ کی مدت میں انہیں منصب پر بحال کرانے میں سرخرو ہوئے تھے۔ اس تاریخی مقدمے کا فیصلہ فاضل جسٹس خلیل الرحمن رمدے نے لکھا اور غیر معمولی ذہانت اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا، مگر آری چیف جنرل پرویز مشرف نے اسی سال ۳۰ نومبر کو سپریم کورٹ کی فیصلہ کی غرضی نافذ کر ڈالی اور اپنے دور حکومت میں دوسری بار پی سی او جاری کیا جسے سپریم کورٹ کے سرکاری بیٹے نے آخری لمحات میں غیر آئینی قرار دے دیا اور بیج صاحبان کو اس پر حلف اٹھانے سے سختی سے منع کیا تھا۔ پی سی او پر حلف لینے سے انکار کرنے والے تمام بیج صاحبان برطرف کر دیے اور راست میں لے لیے گئے۔ اس طوفانِ بلاغیہ کے خلاف بیرسٹر اعجاز احسن شیریں کلف ثابت ہوئے۔ وہ سپریم کورٹ بار ایبوسی ایشن کے صدر منتخب ہو چکے تھے اور انہوں نے عدلیہ کی آزادی کا پرچم بڑی مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ وکلاء برادری نے غیر معمولی قوت برداشت اور قوت مزاحمت کا ثبوت دیا۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے بعد ایک سال سیاسی داؤ پیچ اور مفاہمت کی انجمن تقسیم کرنے میں گزر گیا۔ یہ بھی ایک عجیب تاریخی اتفاق تھا کہ فاضل چیف جسٹس کی ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کی برطرفی کے پورے ایک سال بعد ۹ مارچ ۲۰۰۸ء کے دن نواز شریف اور آصف زرداری کے مابین تحریری



عجسے کی ناک

معادہ ہوا کہ رنج صاحبان ایک مہینے کے اندر بحال کر دیے جائیں گے، لیکن ایک ماہ کے بعد زرداری صاحب نے ارشاد فرمایا کہ سیاسی وعدے قرآن وحدیث کی طرح مقدس نہیں ہوتے۔ یہ بھی اعلان کیا کہ برطرف رنج صاحبان میری لاش ہی پر بحال ہو سکیں گے۔ حالات نے پلٹا دکھایا اور ۱۵ مارچ ۲۰۰۹ء کے سنہرے دن لانگ مارچ شروع ہوا جس کی قیادت نواز شریف اور بیرسٹر اختر از حسن کر رہے تھے۔ وہ جب گوجرانوالہ پہنچے تو بیرسٹر صاحب کو آری چیف جنرل پرویز کیانی کا فون آیا کہ رنج صاحبان کی بحالی اسی رات عمل میں آجائے گی۔ اس وقت بیرسٹر صاحب کا ستارہ اونچ تر یا تھا اور وہ عوام کی طرف سے عزت واحترام کے بلند ترین مقام پر فائز اور چیلنجر پارٹی کی قیادت سے خاصے دور تھے اور عوامی تاثر یہ تھا کہ وہ صاحبان عدل کا ساتھ دینے کے جرم پر دھتکار دیے گئے ہیں۔

☆☆☆

پھر اچانک ۲۷ دسمبر ۲۰۱۱ء کی سہ پہر گرجھی خدا بخش میں اُن کے نصیب جاگ اٹھے اور جناب آصف زرداری نے اپنی تقریر کے بعد انہیں خطاب کی دعوت دی جو ایک واضح اشارہ تھا کہ پٹری کا کانا بدل چکا اور سفر کی سمت یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ اُن کے مشورے سے جناب وزیر اعظم نے چند روز پہلے اپنے دفاع میں سپریم کورٹ کے رو برو جو گزارشات پیش کی ہیں اور وہ خود جس غیر منطقی انداز اور جوہر اخلاق سے نبی دامن دلائل دے رہے ہیں، اُن سے عدالت عظمیٰ اور پورے عدالتی نظام کو شدید ضعف پہنچ جانے کا خطرہ منڈلائے لگا ہے جس کی آزادی، خود مختاری اور وقار واحترام کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی کے ۲۷ سال نچھاور کیے تھے اور ہماری تاریخ میں ایک درخشندہ باب رقم کیا تھا۔ وہ جس ادارے کو ایک عبادت گاہ سمجھتے تھے، اُسی کو آج ایک بت کدے کی طرح مسمار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میڈیا اور تمام تنجیدہ حلقوں میں یہ قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ سینیٹ کی ایک نشست اور مستقبل کے موہوم خوابوں نے اُن کی عظیم شخصیت کو پکنا چور کر ڈالا ہے۔ آج کے اس انتہائی نازک موڑ پر کوئی اُن کا حد سے گزرنادیکھے کہ دل پر ایک ایسی چوٹ لگی ہے جس کا کرب بہت گہرا اور روح کے اندر اتر جانے والا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ناگہانی صورت حال سے دوچار ہونے والے ہیں۔

کرب کی بات چلی ہے تو میں اپنے کرب کا اظہار بھی چاہتا ہوں کہ مہران گیٹ کی ایک فہرست میں مجھ پر آئی ایس آئی سے ڈھائی لاکھ روپے لینے کا الزام آیا ہے جس کی میں بار بار تردید کر چکا ہوں اور حیرت زدہ ہوں کہ ہمارے فی دی کے اہلکرم حضرات کی نظروں سے میری زندگی جو کھلی کتاب کی طرح ہے، کیسے اوچھل ہو گئی ہے۔ خفیہ استجوابی کے کارندے خود رقم ہضم کر کے دوسروں کے ناموں کی جعلی رسیدیں بنا لیتے ہیں۔ خدارا! بے بنیاد الزامات پر صحافیوں کی کردار کشی سے اجتناب کیا جائے کہ بہتان طرازی بہت بڑا گناہ اور قومی اعتبار سے بہت بڑا جرم ہے، جبکہ پوری فضا میں انسان بے زاری کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔

ایک مسلمان حاکم کا دل پذیر بند کر دہ، اسے اپنے لفظوں اور دینی اقتدار پر بہت مان تھا تاریخ ہمیشہ تختیوں سے جنسیں بھری ہوتی، اسے بدلنے والے، دلوں پر راج کرنے والے کبھی اسی تاریخ کا حصہ ہیں جو زندگی کو اچھا، خسیں بہت اچھا بنا دیتے ہیں

ڈاکٹر اختر حسین عری



حضور!

آپ نے شہر کے چوک میں خداوند یسوع مسیح کا مجسمہ تو دیکھا ہوگا؟“ مصری عیسائیوں کے وفد کے سربراہ ہشپ نے واپسی مصر عربوں سے عاقل سے کہا۔

”جی بابا دیکھا ہے، کیوں کیا ہوا اسے؟“ حضرت عمرو بن عاصؓ نے جبرانی سے استفسار کیا۔
 ”کل رات کسی نے اُس کی ناک اڑا دی اور ظاہر ہے کہ یہ کام کوئی مسیحی نہیں کر سکتا۔“
 ”تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ کسی نے کیا ہوگا؟“
 ”میں یقین ہے کہ یہ کام کسی مسلمان نے ہی کیا ہے کیونکہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ایسا واقعہ بھی رونما نہیں ہوا۔“

”ممکن ہے کہ یہ کام کسی مسلمان نے کیا ہو کیونکہ اسلام بتوں کی پوجا کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قرآنی اصولوں کے خلاف ہے کہ کسی دوسرے مذہب کے معبودوں کی تعظیم اور چرک کی جائے۔ مجھے اس واردات پر افسوس ہے۔ آپ اس کی مرمت کروائیں۔ مرمت کے اخراجات سرکاری خزانے سے آپ کو ادا کر دیے جائیں گے۔“ واپسی مصر نے مسیحی وفد کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”میں حضور! اب اس کی مرمت نہیں ہو سکتی کیونکہ کئی ناک ہمارے پاس نہیں اور موجود ہو بھی تو اسے جوڑنا ناممکن نہیں۔ لیکن ہم تو آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہم اپنے مذہبی شکاری تو ہیں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔“ مسیحی ہشپ کے مطالبے کی تاکید میں سارے ارکان وفد نے سر ہلائے۔

”اچھا آپ تادان مقرر کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا مقرر کردہ تادان آپ کو ادا کر دیا جائے گا۔“
 ”حضور! ہم یسوع کو خدا کا بیٹا اور خدا مانتے ہیں۔ اتنی بڑی توہین کا بدلہ چند رموز میں کیسے چکایا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک صورت ہے اگر آپ منظور فرمائیں تو.....“

”وہ کیا صورت ہے؟“ واپسی مصر پوری طرح ہمدرد متوجہ تھے۔

ہشپ نے دیگر ارکان وفد پر نظر ڈالی اور گویا ہوا:
 ”وہ یہ ہے کہ آپ اپنے رسول محمد ﷺ کا ایسا ہی بت بنوائیں اور ہم اسی طرح اس.....“

”خاموش اسے گستاخ!“ واپسی مصر کا جلال ان کی آواز اور چہرے کے تاثرات سے عیاں تھا۔ ان کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھا اور جسم تھر تھرنے لگا۔ مسیحی وفد کے اراکین ان کی اس حالت غضب کو دیکھ کر سکتے میں آگئے کہ شاید ابھی ان کے سر ان کے تن سے جدا کر دیے جائیں گے۔ آج انہوں نے پہلی بار مسلمان سپہ سالار کو غصے کی حالت میں دیکھا تھا۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں جب سے مسلمان مصر میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے، اہل مصر اپنی عیسائی حکومت کی نسبت مسلمانوں کی حکومت کو اپنے لیے زیادہ مہربان سرپرست کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کے حسن سلوک سے حدودہ متاثر تھے کیونکہ انہوں نے عیسائیوں کو پوری مذہبی آزادی دی ہوئی تھی۔ آج مسیحی عیسائیوں نے یسوع مسیح کے مجسمے کی یہ درگت بنی دیکھی تو ان کے درمیان سنسنی پھیل گئی۔ ان کے جذبات میں ایک اشتعال تھا۔ ان کے مذہبی قائدین نے اس مسئلے کی فریاد واپسی مصر حضرت عمرو بن عاصؓ سے کی تھی۔

☆☆

”تم لوگ انتہائی گستاخ اور سخت بدتمیز ہو، دو تو چاہتا ہے کہ تمہارے جسموں سے تمہاری گردنوں کا بوجھ اتار دیا جائے۔ تمہیں اعزازہ نہیں کہ ہم اپنے آقا حضرت محمد ﷺ سے نفرت محبت کرتے ہیں۔ ہمارا مال واسباب حوزت لیا جائے، ہمارے سامنے ہماری اولاد کے کلے کلے کر دیے جائیں، خود ہمارے جسم کا آخری بقا خون بہا دیا جائے، یہ سب ہمیں قبول ہے لیکن یہ شرط ناقابل برداشت ہے کہ کوئی خفیہ ساکھ بھی آقا محمد ﷺ کی شان کے خلاف نہیں۔ تم نے یہ نازیبا فقرہ بول کر ہمارا

دل دکھایا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ بت پرست نہیں اور نہ ہی بتوں کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہم اس بات کا تو گمان بھی نہیں کر سکتے کہ ہم اپنے آقا کا مجسمہ بنائیں۔ تمہارا یہ مطالبہ انتہائی لغو ہے۔ ہم اس قابل نہیں کہ تم سے بات کی جائے لیکن تمہاری اس جہالت کے باعث تمہیں یہ رعایت دی جانی ہے کہ اس ناقابل مطالبے کے علاوہ انصاف کی کوئی اور صورت ہو تو پیش کر دو جس سے تمہارے مذہبی جذبات کی تشنگی کا مداوا ہو سکے۔“

عمرو بن عاصؓ نے کہہ کر خاموش ہو گئے۔ انہوں نے وفد کے اراکین پر نظر ڈالی جو ابھی تک خوف و دہشت کی وجہ سے ہمت بیٹھے تھے کہ فاتح لشکر کا سالار نہ جانے ان کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے۔ بالآخر واپسی مصر نے مہر سکوت توڑی اور گویا ہوئے۔

”جس بت کو تم مقدس سمجھتے ہو، اس کی توہین سے یقیناً تمہیں رنج ہوا ہے، مجھے تمہارے جذبات کا پورا احساس ہے لیکن حضور ﷺ کا بت بنا کر اس کی ناک اڑانے سے بہتر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تم میں سے کسی ایک کی ناک کاٹو۔ اپنی رعایا کو انصاف مہیا کرنا ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔“

اہل مصر کا وفد جبران و پریشان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر سکوت رہا اور بالآخر ہشپ نے نہایت لاجبات سے کہلا:
 ”حضور ہمیں افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ رنجیدہ خاطر ہوئے۔ ہمیں اس بات کا قطعاً اعزازہ نہیں تھا کہ آپ اپنے نبی ﷺ سے اس قدر محبت کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کی پیش کردہ تجویز منظور ہے۔“

”خفیک ہے،“ واپسی مصر نے ہائی بھرتے ہوئے کہا
 ”تم شہر میں منادی کروادو کہ کل عوام اس شہر کے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں۔ یہ کام سب کے سامنے کیا جائے گا تاکہ آئندہ کسی کو کسی کے مذہبی شکاری توہین کی جرأت نہ ہو۔“

☆☆

دوسرے دن شہر کے بڑے میدان میں ہزاروں شہری

جمع تھے۔ اسلامی سپاہ بھی موجود تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ کچھ روز بعد واپسی مصر کھڑے پر سوار آئیچھے۔ انہوں نے عیسائی بطریق عظیم کے پاس کھڑے ہو کر سپاہ اسلامی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:
 ”آپ لوگوں کو شاید خبر نہ ہو کہ ہم یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ برسوں رات کسی آدمی نے چوک میں رکھے حضرت عیسیٰؑ کے مجسمے کی ناک کاٹ دی ہے۔“ مسیحی وفد نے ہم سے اس بات کی شکایت کی اور کہا کہ کوئی مسیحی اس بات کا تصور نہیں کر سکتا، یہ حرکت ضرور کسی مسلمان کی ہے۔“ یہ کہہ کر واپسی مصر نے چند لمبے لمبے توقف کیا، مسیحی عوام کے مجمع پر نظر ڈالی اور پھر مسلم سپاہ کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئے:

”مسلمانو! بت پرستی اور بت گری اگرچہ اسلام میں حرام ہے لیکن اسلام اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ آپ دوسروں کے مذہبی شکاری کی توہین کریں۔ اسلام ہمیں غیر قوموں سے بھی جس عدل و انصاف کا درس دیتا ہے اس کے پیش نظر ہم میں یہ معاملہ سے پلایا ہے کہ اہل شہر اسلامی سپاہ کے جس آدمی پر بھی شک کا اظہار کریں، اس کی ناک کاٹ لی جائے لہذا آپ میں سے جس آدمی کا وہ مطالبہ کریں، وہ آگے آجائے۔“

کچھ روز مجمع میں لوگوں کے آہستہ آہستہ بولنے کی جھنجھٹا ہٹ سی سنائی دی۔ مسیحی بطریق عظیم جو واپسی مصر کے قریب ہی کھڑا تھا، آہستہ آہستہ اسلامی سپاہ کی طرف بڑھنے لگا۔

”غیر! سالار لشکر نے بطریق عظیم کو کھڑنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔“ آپ جانتے ہیں کہ میں اسلامی سپاہ کا سالار ہوں اور اس حیثیت سے اس شہر کا حاکم بھی۔ میں نے ہی اہل شہر کو اپنے ہاتھ سے امان نامہ لکھ کر دیا ہے۔ میری موجودگی میں کسی کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تو میں اس کا ذمہ دار ہوں، اس لیے اس کا نتیجہ مجھے بھی جھٹکتا چاہیے، یہ تلوار حاضر ہے۔ آپ اس سے میری ناک کاٹ سکتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے

عمر و بن عباسؓ نے اپنی تلوار بطریق اعظم کی طرف بڑھا دی۔
مصری عوام کا تحم غفر خاف لشکر کے سالار کو مفتوح قوم
کے مذہبی راہنما کے سامنے خود کو ظلم کی حیثیت سے پیش
ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ساری فضا پر ایک گہرا سکوت
طاری تھا۔ حیرت زدہ بیٹھے لوگ عدل و انصاف کے اس
پیکر مجسم کو دیکھ رہے تھے جس کی جبین نیاز پر طہانیت کا
آفتاب صوفشاں تھا۔ اس سے پہلے کہ بطریق اعظم تلوار
اٹھاتا، پادہ اسلام میں سے ایک افسر آگے بڑھا اور کہنے لگا:
”کیا بدلے میں میری ناک نہیں کاٹی جا سکتی؟“ بھی
اس افسر کی پیشکش کا اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا کہ ایک
اور افسر آگے بڑھا۔

”سالار! لشکر کی جگہ میری ناک کاٹنے سے انصاف کا
تقاضا پورا ہوتا ہو تو میں حاضر ہوں۔“
سالار لشکر نے ان افسران کی طرف کچھ کہنے کے لیے
دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ افسروں کو کوئی جواب دیتے،
سپاہ اسلامی کا ہر سپاہی آگے بڑھ کر کہنے لگا کہ اس کی ناک
کاٹ لی جائے۔

”تم سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہو۔“ عمرو بن عاصؓ
نے آہستہ ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ
بطریق اعظم حضرت عمرو بن عاصؓ کی ناک کاٹنا چاہتا ہو۔
لوگ ایسا سکت و جادہ حالت میں تھے کہ
سپاہ اسلامی کی ایک طرف سے ایک گھڑسوار اپنے گھوڑے
کو دوڑاتے ہوئے اس جگہ کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا
جہاں بطریق اعظم ہاتھ میں تلوار پکڑے ہوگو کی کیفیت
میں کھڑا تھا۔ دھول اڑاتا گھڑسوار بالآخر بطریق اعظم کے
قریب آگیا۔ اس نے بطریق اعظم کے سامنے آ کر اپنے
گھوڑے کی لگا میں اس زور سے کھینچیں کہ گھوڑا اپنی جبین
۲ ناگوں پر کھڑا ہو گیا۔ سوار نہایت چھرتی سے نیچے اترا
اور آ بار باز بلند کیا کہ:

”میں اصل جرم ہوں اور یہ ہے مجھے کی وہ ناک جو
میں نے کاٹی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پتھر کی تراشیدہ
ناک بطریق کی طرف اچھال دی۔

”انصاف کا تقاضا ہے کہ تم میری ناک کاٹو۔“

عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی مآئدین یہ سمجھنے
سے قاصر تھے کہ یہ مسلمان انسان ہیں یا فرشتے۔ چند محلوں
کے سکوت کے بعد بطریق اعظم تلوار لیے حضرت
عمرو بن عاصؓ کی طرف بڑھا۔ چلتے چلتے سالار کے بالکل
سامنے آ کھڑا ہو گیا۔

”خداوند یسوع کی قسم! تم لوگ حضرت عیسیٰ کی
تعلیمات کا کامل ترین نمونہ ہو۔ تم زمین پر آسانی و دشا بہت
کا کامل انصاف مہیا کرنے والے ہو۔ حضرت عیسیٰ کے
مجھے کی ناک کاٹنا اگرچہ بہت بڑا ظلم تھا مگر اس غلطی کا تم
سے بدلہ لینا اس سے بڑا ظلم ہو گا۔ لہذا قیام عدل کے لائق
تلوار تمہارے ہاتھ میں ہی زیب دیتی ہے۔“ یہ کہتے
ہوئے اس نے تلوار حضرت عمرو بن عاصؓ کی طرف بڑھا
دی۔ وائی لشکر نے جب اپنی تلوار اپنے ہاتھ میں پکڑ لی
تو بطریق اعظم نے مسلمان سپاہ کی طرف رخ کرتے
ہوئے کہا:

”کس قدر چاہتی اور انصاف کا پیکر ہوگی وہ ہستی جس
کے تم پر دکاو ہو۔ کاش میں ان کے زمانے میں ہوتا اور
ان کے پاؤں جو دھوکہ پیتا۔ میں بطریق اعظم کی حیثیت
سے اہل شہر کی طرف سے تمہاری غلطی کو معاف کرتا ہوں
اور دعا گو ہوں کہ اس ملک پر تمہاری حکومت قیامت تک
قائم رہے۔“

بطریق اعظم کی اس تقریر پر اہل شہر نے تحسین کے
نعرے بلند کیے اور اب بطریق اعظم نے حضرت
عمرو بن عاصؓ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا:
”میں تم سب کو رب کے حضور گواہ بنا کر اس بات کا
اظہار کرتا ہوں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ
اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُہُ وَرَسُوْلُہُ۔ جب
عیسائیوں نے اپنے بطریق کو اس بات کا اظہار کرتے
ہوئے دیکھا تو ان میں سے کثیر تعداد نے بھی اس کی
بیروی کی اور باقی نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہوئے
اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

۲۰۰۹ء میں یو ایس ایڈ

نامی تنظیم نے ایک
اشتراک پاکستان

جڈرن ٹیلی ویژن پروگرام (PCTV) کے عنوان سے
ان پاکستانی لوگوں کو متوجہ کیا جو میڈیا میں دوپٹی رکھتے اور
اس تنظیم کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہوں۔ اس اشتہار
نے بہت سارے پاکستانیوں کی توجہ کو اپنی جانب مبذول
کرایا کیونکہ چار سالوں میں متوقع امداد ۴۰ ملین ڈالر تھی
لیکن قرعہ فال رفیع پیر تحفہ کے نام نکلا کیونکہ ان کا سابقہ
ریکارڈ بھی یو ایس ایڈ کی ہم نوٹی کا تھا مثلاً رفیع پیر تحفہ
والے فخر سے بتاتے ہیں کہ یہ پاکستان کی واحد کمپنی ہے جو
زیادہ تر یورپی کمپنیوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے۔ انھوں
نے ایک ٹوی ڈاٹس فیسٹول ۳۲ بین الاقوامی فیسٹول بھی
منعقد کیے۔ اور یہ کہ ان کی بنیادی توجہ کے حامل توجہ ان
اور بچے ہیں۔

پاکستان جڈرن ٹیلی ویژن کے ذریعے ۱۰ اکتوبر
۱۹۶۹ء کو شروع ہونے والا امریکی پروگرام، ہی سیم سٹریٹ
کو ”ہم سہ ہمارا“ کے نام سے شروع کرنا تھا۔ رفیع پیر تحفہ
پر ڈکشن ہاؤس نے اس پروگرام کو پاکستان کی ۳۲ علاقائی
پراواؤں سمیت آڈیو سنڈ بینا۔ ہی سیم سٹریٹ کو بنیادی طور
پر امریکا میں ۱۲ سے ۹ سال کے بچوں کے لیے جون کیمپ
کوئے اور بیوڈمورسٹ نے تخلیق کیا اس کا بنیادی مقصد

بچوں میں شعور آگاہی
کی تعلیم فراہم کرنا
تھا۔ یہ اس وقت
بہت مقبول ہوا۔ اس
میں جانور کا ایک
بنیادی کردار ہے اور
ہائی ایک گلی کے بچے
ہوتے ہیں۔ اسے
امریکا میں بچوں کا
مقبول ترین پروگرام

ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی کو بعد میں ۱۴۰۰ھ امریکا
میں پیش کیا گیا۔

یاد رہے پاکستان میں پہلے ہی یہ پروگرام انگریزی میں
پیش کیا جا چکا ہے لیکن اب اس کی افادیت بڑھانے کے لیے
پاکستان ٹیلی ویژن کے ذریعے ہر سطح پر پھیلا جا رہا ہے۔
قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ بھی بتانا چاہوں کہ ۱۹۶۸ء میں
پیش ہونے سے پہلے اس کو ۸ ملین ڈالر کی امدادی گئی جس
کی اکیٹ ۲۰۱۲ء میں تقریباً ۳۸ ملین ڈالر بنی ہے۔

سم سم ہمارا اور پاکستان

ہی سیم سٹریٹ پاکستان میں سم سم ہمارا کے نام سے
پیش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں یو۔ ایس۔ ایڈ رفیع پیر
تحفہ اور پاکستان ٹیلی ویژن کو مالی معاونت فراہم کرے
گا۔ یہ پاکستان میں ٹیلی ویژن، ریڈیو اور انٹرنیٹ کے
ذریعے پیش کیا جائے گا۔ ملک کے بعض اضلاع میں
لائسنس پروگرام بھی پیش کیے جائیں گے۔ یہ یو ایس پر بھی
موجود ہوں گے۔ عوام کی بہبود و فلاح کے لیے ہونے والی
اشیائی کمپنی میں بھی اس کی تقبیری کی جائے گی۔ شہری امرا
کے اسکول اس کی فزکلوپنا کر تعلیم دیں گے۔

پاکستان میں یہ پروگرام ۳ سے ۹ سال کے بچوں کے
لے پیش کیے جائیں گے۔ پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو
پراس کی ۸۰ اعطاء پیش کی جائیں گی۔ لیکن یہ بات اپنی
جگہ وجود رکھتی ہے کہ
تعلیمی شعور آج کل
کرنے والا یہ
پروگرام اپنے پیچھے
قصص کیے رکھتا ہے؟
اصل میں اس طرز
کے کارٹون پروگراموں
میں جو تکنیک استعمال
کی جاتی ہے، وہ بہت
خوشگاہ ہے۔ ہوتی یہ

سیس می سٹریٹ کانینا
سم سم ہمارا

۱۵ سال سے روزانہ صبح ۶ سے ۷ بجے تک بی بی وی سے تلاوت قرآن اور ترجمہ سننا ہوں، اس سے روزانہ کوئی نئی بات ملتی ہے

”میری زندگی میں آرام اور ریٹائرمنٹ کا تصور نہیں“

اخت عباس:

شریک حیات:
طیب اعجاز، عیسیٰ، عاطف مرزا
تعداد:
عرشیان

انٹرویو
کے سربراہ
فنا روق ملک
کے ملاقات



ہے کہ ۴۳ سے ۹ سال کی عمر میں بچے کا ذہن کورے کاغذ کی مانند ہوتا ہے۔ اس پر جو کچھ پرکندہ کردی جاتی ہے وہ پھر باقی عمر مٹانے سے بھی نہیں مٹتی۔ اس میں بچے کو ان کرداروں سے مانوس کر دیا جاتا ہے۔ شروع میں تعلیمی اور مفید باتیں بتائی جاتی ہیں، لیکن بچے جیسے ہی کردار سے مانوس ہوتا ہے، اس کو اپنی پٹری پر چڑھا لیا جاتا ہے۔ پھر اس میں بچے نہایت چھوٹی عمر میں ہی منہ سی مسائل (Gender Issues) پر گفتگو کرتے ہیں جس کے نقصانات کا اندازہ ممکن نہیں۔ اس طرز کی اور بہت ساری چیزیں ہیں جو بچے کے مستقبل پر بہت منفی اثرات ڈالتی ہیں۔

ماضی میں یہ دیگر ممالک کی طرح مصر میں بھی پیش

”شہینہ پیرزادہ اور عثمان پیرزادہ نے عزت، شہرت اور دولت اسی ملک سے پائی جواب میں وہ جو کچھ لوٹا رہے ہیں۔ کیا وہ واقعی اس سے آگاہ ہیں؟“

ہوا۔ وہاں کے بچوں پر تحقیق کرنے سے انکشاف ہوا کہ ان کا رہنما جنسی ہو گیا، نیز رویوں میں اینٹی سوشل اور خوف کا عنصر نمایاں ہوا۔

آپ حیران ہوں گے کہ دنیا کے فلم اور پروڈکشن میں سب سے زیادہ سرمایہ کاروں، اینٹی مشن اور پینٹ پروڈکشن پر کیوں صرف ہوتا ہے؟ اس پر انی سرمایہ کاری اسی لیے کی جاتی ہے کہ کسی بھی قوم کے ذہن بدلنے کے لیے سچے آسان ترین ہدف ہوتے ہیں۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جو بھی منظر عام پر آئی اور کبھی پس پردہ رہ جاتی ہیں۔ وہ ہمیں ہماری بنیادوں سے اکھاڑ رہی ہیں۔ ۶۳ سالہ درخت کی کوٹلیں تو کب سے بے جان ہو گئی ہیں اور اب تو پتے بھی زرد ہو رہے ہیں۔

حیرانی ہوتی ہے کہ رافع پیر تھیر کے مالک عثمان پیرزادہ اور شہینہ پیرزادہ کیا جانتے ہیں؟ سوال یہ تھا کہ ساری عزت، شہرت، دولت انہوں نے اسی ملک

فہر کنارے گاڑی تیزی سے رواں دواں ہوئی اور ہم
انٹرو موہل کے سربراہ فادوق اسے ملک کے حوالے سے
اپنے ٹولس ملا رہے تھے۔ عاقل نے بڑی محنت سے
فرچر کی دنیا میں جدت، خوبصورتی اور تحقیقی طور پر نت نئے
ڈیزائن اور خیالات متعارف کروانے میں انٹرو کے کام
اور کردار پر پوچش بنائے تھے۔ طیب صاحب اپنی ذاتی
ملاقاتوں اور ان کی شخصیت کے حوالے سے ذکر کر رہے
تھے۔ میرا حوالہ بالکل مختلف تھا۔ میں کینال سانچہ پر بننے
نے لگائے گئے خوب صورت جنگل (رینگ) پر کی گئی بلکہ
ببز (گراس، طوطیاں) اور آف وائنٹ کی پھوس سے چلتے
والی رینگ کی فہرست سے زیادہ اس کے ڈیزائن کی
خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ غیر سرکاری، غیر روایتی رنگ
اور ڈیزائن سنا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے استیبل کے ساحل پر لگی
سیکسٹی این پی پر دیکھا تھا۔ رینگ کے وجود میں موجود
تفاوت اور خوبصورتی ان کی آنکھوں کو بھائی کی جتنی
محنت کے اندر لاہو کے دل میں نرم ہوئی ہے۔ جتنی نہر
کے دونوں کناروں اور پیٹی سے یوں آراستہ کیا گیا کہ
انسانوں سے زیادہ شیڈوں سے کام لیا اور چند ہفتوں بعد
سرمک پہچانی جاتی تھی نہ نہر۔ کوئی کرنے پر آئے اور
کرنے کا خواب، خیال اور ماڈل بھی واضح ہوتا یاد رہنے
لے کام یوں ہی ہوجاتے ہیں۔

انسروڈ کو لوگ فرنیچر بنانے والے ادارے کے طور پر

صرف فرخچر تیار کرتے ہیں بلکہ سب سے بڑے مینوفیکچرر اور ریشم بھی ہیں۔

انٹرویو: چین سے، جدت سے، تخلیق سے، سہولت سے اور خوبصورتی ہے۔ خوبصورتی بھی ایسی کہ خیال کی ہو یا کسی پھرتی کی، دونوں ہی اچھی کہیں گیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بچہ کے لیے زندگی بس خوبصورتی کے لفظ سے شروع ہو کر چروں اور جسموں کو دیکھنے کے خم ہو جاتی ہے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ زندگی کو خوبصورت بنانے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

۳۶ سال پہلے انٹروڈ کے آغاز کے وقت فاروق ملک نے یہ سچ سوچا ہوگا کہ ایک ایسا وقت آگے گا کہ وہ ان کے دونوں بیٹے، اٹکونی بیٹی بھی پیارے پاکستان کے لوگوں کی Living کو خوبصورت بنائے، ان کی زندگیوں کو آسودہ کرنے میں شب و روز اس طرح مصروف ہوں گے کہ آئیوٹیک پلانٹ پر تیرہ چودہ لوگوں ان کے ساتھ کام کر رہے ہوں گے گھروں کے بچن، کھڑکیاں، دروازے، صوفے، الماریاں، آس کے کینٹ، چیئرز، میز، کانفرنس روم، روبرو، بناتے بناتے آئیوٹیک جرم مشینوں پر وہ گھر کے ہر کمرے کی ہر چیز بنائے پر قادر ہوں گے۔ دفاتر ان کے جدید اور تخلیقی فریج سے آراستہ ہوں گے۔ اچھے تعلیمی ادارے بھی انہی کے منت سے نکلے ڈیزائن اور والے فریج کو پسند کر رہے ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ لوگ، زمانہ، معیار، اشیاء، مصنوعات اور خواہشیں سب تبدیلی کی زد میں ہیں۔ یہی قانون قدرت ہے لوگ بہتر بننا چاہتے ہیں۔ بہتر کرنا اور بہتر بنی چیز استعمال کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ پہلے دن اور پھر محنت کر کے تھکتے، پھر اس محنت سے تھکا کر دور کرنے والی نوعیت خریدتے ہیں۔

فرنیچر ہر گھر اور ہر دفتر کی ضرورت ہے اور ضرورتیں پوری ہونے کا نظام اپنے آپ بن جاتا اور چل نکلتا ہے، مگر ضرورت کو کب کواٹنی عزیز ہو جاتی ہے۔ ایک خوبصورت اس کی ہوں ضرورت بن جاتی ہے کہ کواٹنی

خوبصورتی اور خوبصورتی کو اپنی بن کر پسند میں ڈھل جاتی ہے۔ ہم یہی جاننے کے لیے شایہار روڈ سے ہوتے ہوئے شایہار باغ کے چھوٹے سے اس سے متصل ایک سڑک پر مڑ رہے تھے۔ جس کے آخر میں شایہار گاؤں، غائبانہ روہیلہ انٹرنیڈ سبیل کے ۳۰ ایکڑ کا رخنے کو اپنی کام کر رہے ہیں۔ کو اپنی سوچ میں ہو، خیال میں یا پیداوار میں جب اس میں تحقیق Creativity اور Innovation شامل ہو جاتی ہے تو پسند اور پرہیز کا دائرہ ہمیشہ بڑے دائروں میں ڈھل جاتا ہے۔ انٹرنیڈ سے وابستہ لوگ برسوں سے اسی کیفیت میں جی رہے ہیں۔ انٹرنیڈ پاکستان ۱۰۰ میں شامل ہے۔

فرہنجیہ کہ انسانی ضرورت ہنا؟ کس نے لکری کو
کب کاٹا، سوزا، ڈھالا اور اپنی ضرورت کی چیزیں تیار
کیں، اس پر تحقیق ہوتی رہے گی مگر یہ بہت حال تحقیق
سے ثابت ہے کہ دنیا بھر میں سب سے خوبصورت فرہنجیہ
بنانے والے ملک اور لوگ اٹلی کے ہیں۔ اٹلی کو دنیا سے
فرہنجیہ ٹریڈ سیکر ہونا جاتا ہے۔ اسی طرح فرہنجیہ بنانے
والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ”آئی کیا“ ہے جسے
اسرائیل اور کمبوڈیا (Ingvar Kamprad) نے
سویڈن میں قائم کیا تھا۔ آئی کیا کی ویب سائٹ پر
تقریباً ۲۰۰۰۰ براؤزنگس پیش کی گئی۔

آئی کی دنیا میں لکڑی کا تیسرا ایذا خریدار ہے۔ اس کو بنانے والا انگوار ۵ سال کی چھٹی کی عمر میں اپنے گاؤں میں ماچس فروخت کرتے ہوئے اپنی زندگی کے سفر پر نکلا تھا۔ ۵ سال کی عمر میں وہ سائیکل کے ذریعے ماچس بیچنے لگا۔ ماچسوں کے بعد پودوں اور اُس کے بعد پھولیں بیچنے کی طرف آیا۔

یہی آئی کیا آج ۴۱۰۰ ہزار ملازمین کے ساتھ
۳۰ ممالک میں ۱۵۰ رستورنرز چلا رہی ہے۔ ہر سال
۱۰۰ بلین کینالگ تقسیم کرنے والی یہ کمپنی جو ۲۵،۶ بلین
ڈالر سالانہ مصنوعات فروخت کرتی ہے کو ”ورلڈ مدرز“

”
ٹی وی کھوکھو کے بنانے سے
جدید، منفرد اور دلکش فرنیچر
بنانے والی کمپنی تک
کاسفر آسان نہ تھا

س: انٹروڈکشن کا سفر کیسے شروع ہوا؟
ج: میں سرکاری ملازم تھا۔ ۷۴ء میں مجھے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ یہ بالکل ناجائز معاملہ تھا۔ روزی

(Working Mothers) کے لیے کام کرنے والی دنیا کی سب سے بہترین مکتبی قرار پائی ہے کہ وہ کام کرنے والی مائیں کی ضروریات کا دنیا بھر میں سب سے زیادہ خیال رکھتی ہے۔ ہم لوگ انٹرنیٹ کا گیٹ کھلنے کے انتظار میں تھے تو قیسم نے سوچا اور جیکل تصور، ڈیزائن، کوالٹی اور بہت کم قیمت پر سٹیفٹ "آئی کیا" کو بے ٹکے میں تقویٰ فیصلے سے چانتا ہوا اور لا کے اندر کام کرنے والی اپنی تیز پیڑ کا میاب مثال سے واقف ہونا سکھانے کی ضروری اہمیت دیکھتے ہیں آئی کیا اپنے ہر کام کرنے والے کا احترام کرتی اور کوشش کرتی ہے کہ کام کو لوگوں کے لیے پرکھتے بنائیں اور لوگوں کو کم سیکر میں آگے بڑھنے کا موقع دیں تو ہماری انٹرویو موٹل اور اس کے سربراہ اس حوالے سے کس سوچ کے حامل ہیں۔ شام آتے تو کبھی جب ملاقات شروع ہوئی۔ سادہ سے دفتر میں اپنے کمپوٹر کے ساتھ اکیلے بیٹھے فاروق ملک کی عمر غائبی کا انداز زندگی سے محبت اور توانائی کا عین کچھ اظہار کرتی تھی، سب سے پہلے ہم نے کبھی اپنا پہلا سوال کر لیا۔ یہ طے نہ کر سکی باقی تھا کہ انٹرویو سے رہنمائی کا تین تین کا جائے گا۔

کمانے کے لیے میں نے دوست کے ساتھ مل کر سونی ٹی وی کے کینٹ یعنی کھوکھے بنانے کا کام شروع کیا۔ خیال آیا کل یہ کینٹی بند ہوگئی یا کوئی اور صورت ہوئی تو یہ کام تو ختم ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر پھر دروازے بنانے شروع کر دیے۔ میرا یقین ہے کہ خدا کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ اگر میں غلط طور پر ملازمت سے نہ نکالا جاتا تو انٹرویو جیسا ادارہ وجود میں نہ آتا۔ مجھے نوکری کے معاملے میں خدا نے عزت دی، میں بحال ہوا اور پھر ۲۲ روپے گریڈ میں ریٹائر ہوا۔

مگر انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہیں۔ آپ کام شروع کریں، ہم مال ادھار پر دیں گے۔ اللہ کے کرم سے یہ ابھی ساکھ اور دیانتداری سے کام کرنے کا پھل تھا۔ سیلانز مجھے ادھار پر میٹر مل دیتے رہے یوں میرا کام دوبارہ چل ا اور میں نے تمام قرضے اتار دیے۔ میں نے کام کرنے والوں کی ہمیشہ بہت عزت کی، انہیں درجہ دیا۔ یہاں تک کہ میرا ایک کارمینٹر تھا جسے میں انگریز ٹیکوڈاز کیئر کے عہدے تک لے کر گیا لیکن اس نے مجھے نقصان پہنچایا۔ بد قسمتی ہے کہ لوگ چھوٹے سے



۸۸ میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو پتا چلا کہ گزشتہ شاہو لاہور میں واقع میرے کارخانے میں آگ لگ گئی اور ہر چیز تباہ ہوگئی تھی۔ اب میرے پاس کوئی Asset نہیں تھا اور Liability کی مسئلہ تھی۔ میرا پانڈی بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

میں نے واقعے پر افسوس کرنے کے بجائے محنت کر کے سب کچھ دوبارہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران ایک روز سارے اینڈرزل کر آگئے۔ میں سمجھا نقصان پر افسوس کا اظہار کرنے کے بعد اپنی قوم کا تقاضا کریں گے

۳۶ انڈیا ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

۹۹ کے تجربے پر غور کیا تو فیصلہ کرنے کی نئی قوت مل گئی۔ ”زمانے کی قسم، بے شک انسان سراسر نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور جنہوں نے آپس میں حق بات کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔“ میں نے اس سے سکھا کہ سچی بات کرو اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرو۔ امام راضی نے ۴۰ سال تک اسی سورہ پر غور و فکر کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کام صحیح کرنا اور پھر نتائج کے لیے بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ مومن کی تعریف بھی یہی ہے۔ مومن محض نمازوں سے نہیں عمل سے بنتا ہے۔ یہی زندگی کا اصول ہے کہ صحیح کام کرو اور پھر خدا پر توکل کرو۔

س: یہ یقین آسانی سے تو نہیں بنا ہوگا؟

ج: میں روزانہ صبح ایک گھنٹہ ۶ بجے سے ۷ بجے تک ٹی ٹی وی سے نشر ہونے والی تلاوت قرآن اور اس کا ترجمہ سنتا ہوں۔ میں نے ۱۵ سال میں شاید ہی کبھی کوئی دن اس معمول سے ناغہ کیا ہو۔ اس سے روزانہ کوئی نئی بات کوئی نئی چیز ملتی ہے۔

س: آپ کے کام اور سوچ کی سب سے نمایاں بات کیا ہے؟

ج: میرے پاس ۱۵۰۰ ارلوگ کام کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، خیرات دینا کا کوئی بڑا کام نہیں۔ کسی شخص کو عزت نفس کے ساتھ روزی کا ذکر بعد دینا دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ ورنہ آپ کے حصے کا کام کر رہا ہوتا ہے، اس کو خوش رکھنا ضروری ہے۔ اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ انٹرویو کے کام کا معیار ایسا ہے کہ آج تک اسے کوئی بڑا حریف (کمپی ٹیٹر) میسر نہیں آیا۔ اس کا فائدہ ہوا یا.....

ج: میرا اصول ہے کہ اسی اچھی چیز بناؤ کہ آپ کا دشمن بھی اسے خریدنے پر مجبور ہو جائے۔

کب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

۹۹ انٹرویو پچھلے ۳۶ سال سے جدید ترین آڈیو ٹیک پلانٹس پر دروازے، کچن، الماریاں، آفس، گھر، تعلیمی اداروں کا فرنیچر تیار کر رہی ہے

۶۶

تزی بھی اسی میں ہے کہ صحیح چیز بناؤ اور دھوکا نہ دو۔ ہمارا فرنیچر ۲۰ سال بعد بھی خراب نہیں ہوتا، یہاں یہ شخص ہوتا ہے۔ میں پراڈکٹ ہی نہیں کام کرنے والوں کی مہارت پر بھی نظر رکھتا ہوں۔ ان کی صلاحیتوں کے اضافے کا بھی سوچتا ہوں۔

س: یہ تو خالص آج کے HR کی سوچ (Mindset) ہے کہ لوگ ہی اداروں کی کامیابی کی اصل بنی ہیں۔ ان کی تربیت پر خرچ کرو۔

ج: ہیومن ریسورس کو Develop کرنا اصل کام ہے۔ اب ہم میٹرک سے کم تعلیم کا دور نہیں رکھتے۔ کوشش ہوتی ہے کہ ہر دور خود رکھوں۔ ہر بندے کے ۱۳ ماہ بعد Assessment ہوتی اور سپروائزر رپورٹ لکھتا ہے۔ ایک سینیئر اس کو کانٹریبٹ سائن کرتا ہے۔ میں ہر دور کی Performance Appraisal خود دیکھتا ہوں۔ ہمارے زیادہ تر دور مقامی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی عمریں ۲۰-۳۵ سال کے درمیان ہیں۔ HR کا سادہ سا اصول یہ ہے کہ انسانوں کو انسان سمجھو۔ ہمارے

انڈیا ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء ۳۷

جی صادق اور ایمان تھے۔ انہوں نے اپنے عمل سے مثالیں قائم کیں۔ ان کی زندگی میں عمل تھا۔ آپ نے جو کہا، اس پر عمل کر کے دکھایا۔

ہم ویلیفیر سٹیٹ کے تصور سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ مغرب والوں نے اسلام کے اصول اپنا لیے اور ترقی کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں لوگ اصولوں سے بھی گئے اور اسلام سے بھی، نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ بات کہنا بہت آسان ہے۔ اس میں خرچہ تو کوئی نہیں آتا۔

س: بیج کی مصروفیت کیا ہوتی ہے؟
ج: بیج ایک گھنٹے کے لیے جم جاتا ہوں۔ اس سے



سارا دن دماغ گھوڑے کی طرح کام کرتا ہے۔ گالف وغیرہ نہیں کھیلتا، یہ ماڈرن کھلی ڈنڈا ہے۔ ہٹ مارکر پیچھے پیچھے بھرتے رہو۔ صبح ۱۰ بجے شام ۷ بجے تک یہاں آکس میں ہوتا ہوں۔

س: ۲۰ بیٹے آپ کے نقش قدم پر چلے۔ بیٹی تو منی ایچ کی شو قین بھی، اُسے کیسے لائے؟
ج: میری بیٹی NCA سے فارغ التحصیل اور ڈیزائن کے شعبے کی ہیڈ ہے۔ بچوں کو پلاننگ سے اپنے بزنس میں لے کر آیا ہوں، اب وہ بڑی خوبی سے معاملات چلا رہے ہیں۔ ہمارا سسٹم بڑا جمہوری ہے۔ انہیں اپنے فیصلے کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔

میں نے ایم اے اکنامکس کیا تھا اور لکڑی کے کام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا لیکن سیکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب بھی فیلڈ میں خود کو طفل کتب سمجھتا ہوں۔

کسی منکر نے بیج کہا تھا کہ تجربہ ام چیز کا نام ہوتا ہے جو ہم اپنی ناکامیوں کو دیتے ہیں۔ ہم ایک دن میں عقل کل نہیں بن سکتے۔ عقل پر ہمارا اجارہ داری نہیں۔ خدا نے ہمارے ملازمین کو بھی عقل دی ہوتی ہے۔

مٹی سارا دن فرش پر بیٹھی مٹی انچر بناتی رہتی تھی۔ میں نے کہا بیٹا..... بیٹھے بیٹھے تمہاری کمر دہری ہو جائے گی۔ یہ چھوٹی چھوٹی اینٹوں پر تصویریں بنانا کون سا کام ہے۔ آؤ اصل بیج یہ ہے کہ تخلیقی ذہن یہاں استعمال کرو۔ اس نے بات مان لی۔

س: بیج قبول کرنے اور اچھا کام کرنے پر انعام کی کوئی پالیسی بھی ہے؟

ج: ہم نے ایک سسٹم آف ریوارڈ بھی شروع کیا ہے، جو کام کرنے والا اچھا آئیڈیا یا تجویز دے گا اسے ہم ۵۰ ہزار روپے دیں گے۔ ہمارے ایک ملازم نے ۵۰ لاکھ کا مشین بنادی ہے۔ وہ اتنی اچھی تو نہیں لیکن جو ہم باہر سے منگواتے ہیں اس سے سستی ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ بندوں کو مناسب Recognition ملنی چاہیے۔ وہ میرے حصے کا

کام کرتے ہیں، ان کو خوش ہونا چاہیے۔ ان کو انعام ملنا چاہیے۔ ایک باکس بھی لگا ہوا ہے، کوئی بھی مشورہ، تجویز، تنقید اس میں ڈالنا سکتی ہے تو وہ مجھے تک ہی پہنچتی ہے۔ ہمارے پاس سوئٹ کیلنڈر کا نظام بھی ہے۔ اپنے ملازمین کے لیے فیور پرائس شاپ بھی بنائی ہے جہاں ضرورت کی چیزیں سستے داموں مل جاتی ہیں۔

س: سنا ہے آپ ملک سے باہر خوب جاتے ہیں؟
ج: بیرون ملک ہونے والی Exhibitions میں ضرور جاتا ہوں۔ یہ ایک طرح کا ریفریشنگ کورس ہوتا ہے۔ ان سے بہت سیکھتا ہوں۔ میری زندگی میں آرام اور ریٹائرمنٹ کا تصور نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ بے کار چیز ہے۔ اسلام میں ریٹائرمنٹ ایسی کوئی چیز نہیں۔ س: دنیا کی فرنیچر کی سب سے بڑی کمپنی "آئی کیا" کے حوالے سے کچھ بتائیے، ان سے رابطہ کیا رہا؟

ج: یہ بہت کمال لوگ ہیں۔ ان کا ایڈو کاؤنٹی سے زیادہ پرائس ہے، افورڈ ایبل پرائس۔ دنیا میں سب سے بڑے سنورز انہوں نے بنائے ہیں۔ چھ چھ منزلہ تو ان کے سنورز ہیں، فرنیچر کی رینج آپ سوچ سکیں۔

Ikea (آئی کیا) کے مالک نے مجھ سے پوچھا ہے اپنا کام شروع کیا۔ اب وہ ایک ملین ڈالر روزانہ کما رہے ہیں۔ ۳۲ ملین ڈالر اس نے چیزیں بی بی دیے ہیں۔ وہ سادہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ ۵ سالہ برائی گاڑی میں سفر کرتا ہے۔ اپنے ایک ایم ڈی (MD) کو صرف اس وجہ سے برطرف کر دیا تھا کہ صفحے کے ددوں طرف نہیں لکھتا تھا۔

ہم ان کے لیے ایک پراڈکٹ بنا رہے ہیں۔ بہت اچھا تجربہ ہے ان کے ساتھ کام کرنا۔ مینجمنٹ کے بے گنہم ان سے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔ دینے تو ہمیشہ قوم ہم محنت نہیں کرتے، صرف تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ کام کرتے ہوئے بھی کام چوری کا سوچتے رہتے ہیں۔ چین ہم سے ۲۰ سال بعد آزاد ہوا آج وہ اپنی محنت سے ترقی کر رہے ہیں۔ میں اپنے لوگوں سے بورڈ پر لکھ کر چیزوں کو شیئر

”میرے پاس ۱۵۰۰ لوگ کام کرتے ہیں۔ عزت نفس کے ساتھ روزگار فراہم کرنے کو دنیا کی سب سے بڑی نیکی مانتا ہوں“

کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔ لکھتے ہوئے ہمیں زیادہ متفق ہونا پڑتا ہے۔ لکھنے سے اپنی سوچ کے تضادات واضح نظر آتے لگتے ہیں۔ رلا بور، کراچی اور اسلام آباد میں ہمارے ۶ مشورہ ہیں۔ گوجرانوالہ اور جہلم میں ڈیٹر ہیں۔ ہمارا ٹرن اور ڈیڑھ ملین روپے ہے۔ ہمارے زیادہ تر ملازم مقامی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی عمریں ۲۰-۲۵ سال کے درمیان ہیں۔ ہم IKEA کو بھی سلائی دیتے ہیں۔ ان جیسی کمپنیوں کے ساتھ ڈیل کرنے سے ہمیں اصل نفع علم کی صورت میں ملتا ہے اور سیکھنے کے لیے بے شمار چیزیں ملتی ہیں۔

س: فرنیچر کی دنیا میں کون سا ملک آپ کو زیادہ اپنا بزرگ کرتا ہے؟

ج: اٹلی، فرنیچر میں یہ لوگ بہت آگے ہیں۔ ڈیزائن اور تحقیق ان لوگوں کے خون میں شامل ہے۔ یہ God Gifted ہے۔ ان کے ہاں سرک پر کوئی نہیں جیسی کوئی ناپاں ہوگا۔



ماضی سے حال تک
شہریوں کی مشال و
بیسود کے کلف نام کا
حسام تذکرہ

کیا پاکستانی قوم ابھی تیار نہیں؟

ذکیہ احمد

کوئی متبادل تلاش کر لیں
گے۔ کبھی بھی نااہلیت بھی
خوش قسمتی بن جایا کرتی ہے
اور ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی
ہوا اور ہم اس عالمی بحران
سے بچ گئے کیونکہ ہم کبھی مکمل
طور پر کسی بھی نظام کو نہیں اپنا
سکے چاہے وہ اسلامی نظام ہی
کیوں نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ
ہے کہ ہم دیوالیہ ہونے کے
قریب ہو چکے ہیں۔ اسی
سال کے شمارے میں میرا



آج کل پوری دنیا
مالیاتی بحران کا شکار ہے۔
مغربی ممالک میں یہ بحث
ذرائع ابلاغ سے نقل کر
اٹھی تعلیمی اداروں تک جا
پہنچی ہے کہ کیا سرمایہ داری
نظام ناکام ہو چکا اور اگر
ایسا ہے تو اس کی جگہ کون سا
نظام لے گا۔ مغرب کے
پاس فی الحال اس کا متبادل
وجود نہیں۔ قوی امکان
ہے کہ مغربی ماہرین مل کر

روپے کرایہ ہے۔ میں کیوں پانچ سات کروڑ گھر بنانے پر
لگا کر پھر سال کا کروڑ بھر بینک کو مارک اپ دوں۔ وہی
پیسہ میرے برٹس میں ہے، جو میرے اور میرے ملازم
کے لیے مزید کماتا ہے۔“
اللہ کی اتنی بڑی کائنات میں جیسے رنگ، ذائقے اور
خوبیاں خوبصورتیاں مختلف ہیں ایسے ہی انسانوں کا معاملہ
ہے۔ ملک صاحب سے ملے تو ان کی کیا باتوں نے حیران
کیا۔ جس قدر وہ محل کر بولتے اور سوچتے ہیں، بہت کم
لوگوں کو زندگی میں اتنی آسانی اور وضاحت (Clarity)
کے ساتھ سوچنے اور بولنے پایا۔ مختلف باتوں سے مختلف
نتیجہ نکالنے پر قادر ہیں۔
”God Father“، اٹلی کے مافیاز پر لکھی کتاب
ہے، وہ اس میں سے کتنی ہی مفید باتیں اپنے برٹس کے
حوالے سے نکال لیتے ہیں۔ دم رخصت ان کا جملہ بہت
لطف دے گیا۔
قویں اور ادارے علم اور عقل سے اوپر آتے ہیں۔ جو
ان دونوں کے ڈٹیں ہوں، سوچنے پر ہی آمادہ نہ ہوں، ان
کو بڑی مشکل پڑتی ہے۔

س: بھارت کے ساتھ ٹریڈ شروع ہو رہی ہے۔
فرنیچر کے حوالے سے کیا فائدہ نقصان دیکھتے ہیں؟
ج: کوئی سیرا رزق کم نہیں کر سکتا۔ یہ تو میرے ایمان
کا حصہ ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان ٹریڈ سے
دونوں کو فائدہ ہوگا۔ ہمارے پاس بھارت سے مکینک
آتے رہتے اور ہمیں بتاتے ہیں کہ آپ کی کوالٹی کا مقابلہ
بھارت والے نہیں کر سکتے۔
کھلے میدان میں مقابلے پر یقین رکھنے والے لوگ
بہت مختلف ہوتے ہیں۔ وہ رعایتوں، آسانیوں سے زیادہ
خلق، کوالٹی، جدت اور خوبصورتی پر یقین رکھتے ہیں۔ دنیا
میں ان کی نہ قدر کم ہوتی ہے نہ قیمت۔
فاروق اسے ملک صاحب سے ملاقات ختم ہوئی۔ وہ
ہمیں رخصت کرنے آئے تو ایک چھوٹی سی کار Witz کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ”یہ میری گاڑی ہے۔
مجھے نہ کبھی سپائیکس ہوا نہ کوئی مسئلہ ہوا گاڑی کے سائز
سے۔ ساری دنیا اپنا گھر بنانے کے چکر میں دیوانی ہوئی
ہے۔ میں نے اس حوالے سے بھی اپنے آپ کو کبھی مجبور
نہیں پایا۔ کینٹ میں کرائے کا گھر ہے۔ ۲۱/۲ حسانی لا کھ



مضون شائع ہوا تھا جس میں، میں نے لکھا تھا کہ ہمارے پاس کھینے کے لیے مغرب کی مثال موجود ہے۔ وہ علی و ذہنی لحاظ سے ہم سے بہت آگے چاہیے ہیں لیکن انہوں نے اس عمل کے دوران غلطیاں بھی کی ہیں۔ ہمارے لیے یہی ہے کہ ہم ان غلطیوں کو دہرانے سے گریز کریں اور اپنے لیے بہترین راستہ بنیں۔ میرا تعلق چونکہ شعبہ عمرانیات سے ہے لہذا میری نظر

ماڈرن ازم پر عمل عقلیت کے مطابق کرنے پر زور دیتا ہے

ان وجوہ پر ہے جو معاشرے کو مجموعی اور فرد کو انفرادی طور پر متاثر کرتی ہے۔ چونکہ میں انگلستان کی معاشرے شائبہ ہوں لہذا میں ان کے نظام کا ہی براہ راست مطالعہ کر سکتی ہوں۔ لیکن آپ سوچیں گے کہ اگر وہ ڈائجسٹ کے قاری کو کیونکر اس تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے۔ دراصل میں ایک عام قاری کو مغربی فلاحی ریاست کے تصور سے روشناس کرانا چاہتی ہوں کیونکہ یہ وہ نظام ہے جس کا آغاز اسلامی دور میں ہوا لیکن اب یہ کسی بھی اسلامی ریاست میں رائج نہیں۔ اس کے علاوہ میں اس نظام کے سقم بھی لکھنا چاہتی ہوں کیونکہ ہمیں اس نظام کی اشد ضرورت ہے لیکن ساتھ ساتھ ہم شفاف طرز عمل اپنی اپنا سکتے ہیں اگر ہم مغرب کی غلطیاں نہ دہرائیں۔



ریاست سے مراد کیا ہے؟ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس تصور کا اجراء اسلامی طرز حکومت نے کیا۔ بے سہارا لوگوں، عورتوں، بچوں اور عمر رسیدہ افراد کے لیے حکومت بیت المال سے خرچہ فراہم کرتی تھی۔ خلفائے راشدین کے دور تک اس پر برابر عمل ہوتا رہا، اس کے بعد بوی خلافت بادشاہت میں تبدیل ہوئی۔ سائنسی ترقی نے مغرب کو جہاں دولت سے نوازا

وہاں اسے ماڈرن ازم یا جدیدیت بھی تسمیہ دی جس کے مطابق ہر عمل عقلیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ مذہبیت بہت حد تک ذاتی معاملہ بن کر رہ گیا۔ اسی دور کے دوران مختلف ممالک میں سماجی تحفیں وجود میں آئیں جنہوں نے سچن غریبوں کی مدد کا بیڑا اٹھایا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے تحریک کی شکل اختیار کر لی اور فلاحی ریاست کے تصور کو فروغ دیا جس کے مطابق جزیہ (ٹیکس) جمع کر کے حکومت عوام پر خرچ کرتی ہے۔ اس نظام کے اندر بے شمار خوبیاں ہیں لیکن ساتھ ساتھ اس میں خامیاں بھی موجود ہیں۔ آئیے نظر ڈالیں کہ پاکستانی معاشرہ میں اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے

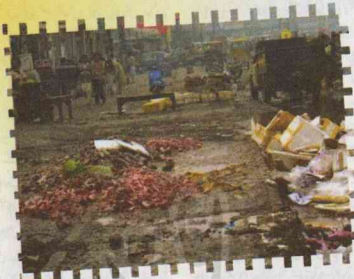
ہیں۔ پاکستانی ہمارے ارد گرد کوئی بھی ملک فلاحی معاشرے سے بہرہ مند نہیں ہو سکا۔ ایران کی تیل کی دولت سے مالا مال ہے لیکن وہاں

انتہاپسندی نے عوام کو اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا۔ چین البتہ اپنی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتا ہے لیکن بے تحاشا آبادی اور محدود ذرائع اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ چینی طلبہ حکومتی خرچے پر اس نظام کو سمجھنے کے لیے مغربی

تعلیمی اداروں کا رخ کر رہے ہیں۔ پاکستان کی حکومت، ماہرین عمرانیات اور اقتصادی حالات چاہے مجراتی طور پر فلاحی ریاست بننے کے لیے فوری طور پر تیار بھی ہو جائیں تو یہ طرز ریاست پاکستان میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ ہے کہ عوام اس کے لیے ایسی ذہنی طور پر باغ نہیں ہوتے۔ ایک قاری یہاں سوال کر سکتا ہے کہ مغربی معاشرے میں رہنے والی رافن کن ولاں پر اس کی دیکھو یا ہے؟ میرا شعبہ عمرانیات ہے اور تحقیق کا موشن ورک سے شائبہ

ہے۔ میں نے پاکستان میں کافی عرصہ فلاحی تنظیموں کے لیے کام کیا ہے۔ میں اپنے علم و تجربے کو اپنے ملک کے لیے استعمال کرنے کی خواہش مند ہوں اور اس بات پر مستحکم یقین رکھتی ہوں کہ ہاشیور عوام ہی ہاشیور معاشرہ بناتے ہیں اور جیسے کہ میں نے اوپر لکھا کہ جدید عمرانیات کے مطابق معاشرہ اور حکومت جدا نہیں ہو سکتے۔ مجھے حیرت ہے کہ ماہرین کو اس واضح حقیقت تک پہنچنے میں بہت وقت لگا جبکہ اسلامی طرز ریاست کے مطابق فرد ہی

معاشرے اور حکومت کی اکائی ہے۔



میں چند ماہرین کا کہنا ہے کہ فوج ہماری بقا کے لیے ضروری ہے، اسی لیے ہم دفاع کا پیٹ بھرنے کے لیے عوام کا پیٹ خالی رکھتے ہیں۔ مضبوط معاشرے کے لیے بھاری بھر کم فوج کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال جرمنی اور جاپان ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد ان فوج رکھنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اپنی ساری قوت ٹیکنالوجی حاصل کرنے پر لگا دی اور اب ان کے سامنے امریکا بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔

پسماندہ تعلیمی نظام کے باعث پاکستان میں فلاحی معاشرہ قائم نہیں ہو سکا

میں یہ نہیں کہہ رہی کہ ہمیں اپنے دفاع کی طرف سے غافل ہو جانا چاہیے لیکن میانہ روی ضروری ہے۔ عالمی تجزیہ یہ ہے کہ ہماری فوج بھی ہندوستان کی افرادی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر مقابلہ ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ پاکستانی فوج جدید ترین ہتھیار کی بنیاد پر برتری رکھتی ہو۔ موجود حالات میں یہ ٹیکر مشکل ہے کیونکہ مغرب کسی بھی صورت ٹیکنالوجی مسلمانوں کو نہیں دے گا۔ دوسری طرف ہندوستان کے بارے میں عالمی سطح پر

اب واپس آتے ہیں کہ میری رائے کے مطابق پاکستانی عوام ابھی فلاحی معاشرے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ اس کی وجہ ہمارے تعلیمی نظام کی پسماندگی ہے۔ تعلیم ہماری بھی سچی ترجیح نہیں رہی۔ اس کے دفاع

میں چند ماہرین کا کہنا ہے کہ فوج ہماری بقا کے لیے ضروری ہے، اسی لیے ہم دفاع کا پیٹ بھرنے کے لیے عوام کا پیٹ خالی رکھتے ہیں۔ مضبوط معاشرے کے لیے بھاری بھر کم فوج کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال جرمنی اور جاپان ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد ان فوج رکھنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اپنی ساری قوت ٹیکنالوجی حاصل کرنے پر لگا دی اور اب ان کے سامنے امریکا بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔

دانش کی کمی

یہاں مغل، جالیوں سے ایک احمق کو دیکھا کہ ایک دانش مند آدمی کے گریبان میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا اور اس کی سے عزتی کر رہا تھا۔ یہ ناخوشگوار منظر دیکر جالیوں نے کہا کہ اگر یہ شخص دانش مند ہوتا تو ہاں تک نوبت نہ پہنچتا کہ کیا احمق اس کو پہننے لگے۔

(شیراز ذوق انوار لاہور)

ہے۔ وہ ایک مخصوص طبقہ کو ان پر حاوی دیکھتے چلے آئے ہیں۔ میں ہمراہی نقطہ پر واپس آنا چاہوں گی کہ غلامانہ دور کے نظام تعلیم نے انہیں اتنا شعور نہیں دیا کہ وہ اپنے حق کے لیے کھڑے ہونے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ اگر وہ غم و غصہ کا شکار ہیں تو ان کا غصہ تو چوڑی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر غلامی ریاست کا تجربہ کیا بھی جائے تو عوام کو بھٹنا مشکل ہوجائے گا کہ اس کا اصلی حقدار کون ہے۔ یہ مسئلہ مغرب میں بھی موجود ہے جہاں ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو پلٹا ہی سرکاری امداد پر ہے۔

چارلس مورے (ممبر عیارات) کی تحقیق کے مطابق جو کہ انہوں نے ۸۰ء کی دہائی میں کی تھی، حکومتی اقدامات ایک ایسے طبقہ کو ہنر دے رہے ہیں جو زیر طبقاتی ہے۔ اس طبقے میں کام کرنے کا رواج نہیں کیونکہ یہ حکومتی امداد پر انحصار کرنے کا عادی ہے۔ ۶۰ء کی دہائی میں اس طبقہ نے ایسے سیاہ فام نسل والدین کی سرپرستی کی جو غیر شاہی شدہ تھے۔ اسی طرح چارلس مورے کی تحقیق کے مطابق برطانیہ میں بھی Under Class یعنی زیر طبقہ انحرار رہا ہے۔ ان کا کلچر بے روزگاری ہے۔ ان کے ہاں بچوں کو باقاعدگی سے سکول نہیں بھیجا جاتا (یاد رہے کہ برطانیہ کے قوانین سکول جانے کے حوالے سے بہت سخت ہیں۔ اگر کسی طالب علم اسے زیادہ غیر حاضر ہوں تو والدین کو کوٹاہہ دینا کی بنا پر جیل میں جانا ہوتا ہے۔ بچوں کی پرورش نامناسب ماحول میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان

لوگوں کو امتحان کا ہوں کے باوجود ہوتے دیکھا ہے کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ اس کی تیاری کیسے کی جانی ہے۔ کتب میں جو تصاویر دی گئی اور سوالات دیکھتے گئے ہیں وہ پاکستان کی ٹریفک پر لاگو نہیں ہوتے کیونکہ ابھی وہ نظام پاکستان پہنچا ہی نہیں۔ برطانیہ کی ہائی وے کوڈز وین پاکستان میں لاگو کیا جا رہا ہے جو عام لوگوں میں اشتعال کا سبب بن رہا ہے۔

اسی طرح عوام کو اس بات کا یقین دلانا کہ ٹیکس دینے میں ہمارا ہی فائدہ ہے جیسے کہ زکوٰۃ دینے میں۔ بیشتر لوگ باقاعدگی سے نکالتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ خدا کو خوش کرنے کے علاوہ کسی غریب کی مدد کے ذمے سکون بھی حاصل کرتے ہیں۔ ٹیکس دینے کی وجہ سے حکومت انتہا جمع کر پاتی ہے کہ جو لوگ اپنی دیکھ بھال کرنے کے مجبور ہیں، ان کی مدد و طویل بنیادوں پر کی جا سکے۔ لیکن ہمارے عوام نے اپنے تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ ان کے پیسے کو ملک کی فلاح پر خرچ نہیں کیا جاتا بلکہ حکمران طبقہ اپنے شاہی اخراجات پر پہلے دردی سے خرچ کر دیتا ہے۔ اس صورتحال میں، میں بھی ٹیکس دینا پسند نہیں کروں گی کیونکہ میری محنت کی کمائی کسی کی عیاشی کی منتقل نہیں ہوتی۔ اس صورتحال میں صرف حکمران طبقہ کا نہیں کیونکہ یہ بین الاقوامی فطرت کے مطابق ہے جس جب بھی جس انسان کو موقع ملے گا، وہ فروغ کا رپہ دھالے گا۔

قرآن میں واضح الفاظ ہیں آتا ہے کہ اس قوم کو خدا بھی نہیں سناوتا جو اپنی حالت خود نہیں سناوتا۔ جب تک عوام اپنے حق کے لیے خود نہیں کھڑے ہوں گے، ان کی مدد کے لیے کوئی بھی آگے نہیں بڑھے گا۔ اپنے حق کے لیے کھڑے ہونے سے مراد یہ شعور! ہمارے عوام اپنے حق کے لیے لڑنے کو لڑائی کے معنی میں لیتے ہیں اور اپنا غصہ نکالتے ہیں۔ لڑنے کو املاک کو آگ لگا دیتے ہیں۔ دراصل وہ احساس ملکیت سے نا آشنا ہیں جو انہیں قومی املاک سے ہونا چاہیے کیونکہ انہیں بھی اس بات کا قومی ہونے ہی نہیں دیا گیا کہ ان سب چیزوں پر پہلا حق ان کا

انسان کی تخلیق کے معافی ہے۔ انسان کو سجدہ ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ علم رکھتا تھا۔ یہ وہ علم نہیں جو کہ کتابی ہوتا ہے بلکہ تجربہ اور تحقیق سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے کے باقاعدہ طریقے ہیں مثلاً تجرباتی علم

(Evidence-based Study) (جس کو جدید طب اور سوشل ورک میں سے انہما قبولیت حاصل ہو رہی ہے) اس کے علاوہ اور بھی بہت سے طریقے ہیں جن کی بدولت طلبہ کو ابتدا میں ہی سکھایا جاتا ہے کہ انہوں نے سروسے اور باقی ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو کیسے جانچنا ہے؟ اس شخص کا فائدہ یہ ہے کہ مغربی طلبہ علم اس بات سے واقف ہوجاتا ہے کہ بات کی تہہ میں کیسے پہنچا جاتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی مثال امریکا اور برطانیہ میں ہونے والے انتخابات ہیں۔ ہر صدارتی امیدوار اور سیاسی پارٹیاں اپنے منشور ایسے ترتیب دیتی ہیں جو کہ ان کے نظریات سے میل کھاتے ہیں۔ عوام برابر ان کو پرکھتے رہتے اور سوال کرتے ہیں۔ ان کی ریلی پر عوام حقائق پر مبنی سوالات کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اگر عوام جان پہچان کی بنیاد پر ووٹ دیتے ہیں یا اپنا حق خود ادا دیتے استعمال ہی نہیں کرتے کیونکہ وہ قائل ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی حکمران ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ مغربی عوام کی اکثریت جانتی ہے کہ کون سی پارٹی آکر ملک کو کس طرح چلائے گی۔

ہمارے ملک میں کوئی بھی ناطریقہ متعارف کروائے جانے سے پہلے اس کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کی جاتی نہ عوام کو کسی قسم کی تعلیم دی جاتی ہے کہ اس نئے نظام کو کس طرح استعمال کیا جائے بلکہ ان کو اعتماد میں ہی نہیں لیا جاتا کہ کب اور کیوں ناطریقہ متعارف کروایا جا رہا ہے اور ان کو اس کا فائدہ پہنچنے والا ہے۔ میں مثال دے کر اپنی بات واضح کرتی ہوں۔ پاکستان میں ڈرائیونگ پاس کے لیے تصوری ٹیسٹ شروع کیا گیا ہے لیکن میں نے

قیاس آرائی ہے کہ وہ جلد ہی چین کے بعد دوسرا ہم ملک بن جائے گا۔ سماجی کی صورتحال اور ہماری عالمی غیر موجودگی (جس کی وجہ سے چین بھی ہم سے گر کر برابرا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ جنگیں جذبے سے لڑی جاتی ہیں۔ جدید دور کی جنگیں حکمت عملی سے لڑی جاتی ہیں ورنہ ہم مشرقی پاکستان کی جنگ نہ ہارتے یا مہمرا اسرائیل سے نہ ہارتے۔ میری زیادہ تعلیم پاکستان میں مکمل ہوئی ہے۔ میں وقوف سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارا تعلیمی نظام دروغ لگای کی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو آپ سے سوچنے کی صلاحیت دیتا ہے اور اس کا مقصد صرف اور صرف کلرک پیدا کرنا ہے۔ یہی طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ انہما یادداشت کے حامل ہوں۔ یہ نظام انہما کی طرح نہیں کھا رہا ہے۔ جگہ جگہ ایسے ٹیوشن سنٹر کھل گئے ہیں جو صرف امتحان پاس کرتے ہیں۔ یہ نظام ذہرے معیار کا حامل ہے۔ ایک طرف کلرک پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف ایسا حکمران طبقہ جو تو اپنے عوام کی زبان بولتا ہے نہ ہی ان کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نظام انگریزوں کی دین ہے۔ اس کے اپنے ملک میں ان کا نظام امتحانات کو دوسری سطح پر رکھتا ہے۔ وہ ایسے طلبہ پیدا کرتے ہیں جو تحقیق ذہن یعنی Critical Thinking رکھتے ہوں تاکہ عملی زندگی میں وہ دیکر سے فقیر نہ بنیں بلکہ مسائل سے حل علم اور عقل کے احتجاج سے نکلیں۔ یہی معلومات کا ایک سیلاب ہے جو جسے جارہا ہے۔ اتنی عیڑی سے ترقی ہو رہی ہے کہ لگتا ہے کہ جیسے علم کی پاتال میں جانے کی خواہش کی جارہی ہے۔

ذرا دیکے اور غور کیجیے! کیا قرآن ہمیں بار بار غور کرنے کے لیے نہیں کہتا؟ کیا قرآن عقلیت و دلیل کی ترسیل نہیں کرتا؟ کیا خدا خود تحقیق کرنے کی دعوت نہیں دیتا؟ وہ اندھا یقین کرنے کے لیے نہیں کہتا کیونکہ یہ

سیونگی فیس

کا اصل ہیرو کون؟

شک و شبہات
میں چھپی اصل کہانی

بین رحمان



ہیں۔ مغربی ہاں لوگ جس نے میکسیکو کے غریب خاندانوں پر تحقیق کی تھی، بے مشابہہ کیا کہ اکثر خاندان ایسی روایات اپنا لیتے ہیں جو غربت کو نسل در نسل منتقل کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں بچوں میں بھی آرام طلبی پیدا ہو جاتی ہے۔ ماہر عمرانیات اکثر (Moral Judgement) یعنی اخلاقی فیصلہ کی بات کرتے ہیں جس کے مطابق غربت کو آسانی سے جرائم کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے۔ غریب میں جرائم کی شرح زیادہ ہوتی ہے اور اس کی بے شمار وجوہ ہو سکتی ہیں۔ (یاد رکھئے کہ بات یہ ہے کہ غربت پر زیادہ تحقیق مغرب میں ہوئی ہے اور ان کا معیار غربت ہم سے بہت مختلف ہے اور ضروری نہیں ہے کہ جو ان کے ہاں درست ہو، وہی حقائق ہمارے لیے بھی درست ہوں۔)

شاید اسی لیے علامہ اقبال نے جاہد نامہ میں کہا ہے:

عقل و دین دانش و ناموس و تنگ
بست فتر ایک لردان فرنگ

یعنی اس کی عقل اور دین و دانش اور ناموس، فرنگیوں کے شکاری بننے میں بندھے ہیں۔ گویا فرنگ کی اندھی تقلید ہو رہی ہے۔ میں بھی اس کی قائل نہیں۔ ہمارے مسائل مختلف نوعیت کے ہیں اور ہمارے اداروں کا فرض بنتا ہے کہ مکمل تحقیق کے بعد ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو ساری عوام کی حمایت حاصل کرے۔

ہمارے ہاں گھروں میں جڑوقی ملا زمین رکھنے کا عام رواج ہے اور ان کی اکثریت خواتین پر مشتمل ہے۔ اکثر خواتین گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کے مردان کی کمائی پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کے کام کے اوقات بھی طویل ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ایک عام رواج ہے لیکن اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کو مالی امداد بھی ملنی چاہیے اور مفت طبی سہولیات بھی۔ لیکن اتنی بڑی تعداد کو تو امیر ممالک بھی نہیں سنبھال سکتے تو پھر کیسا بندوبست ہونا چاہیے؟ اس کا جواب وہ ہیں سے آتا ہے جہاں سے یہ مومن شروع ہوا تھا، پاکستانی عوام ابھی فلاحی ریاست کے لیے تیار نہیں۔

میں آگے بڑھنے کا جذبہ نہیں رہتا اور وہ چوری چکاری جیسے پیشہ اپنا لیتے ہیں۔

اب واپس آتے ہیں پاکستان کی طرف! پاکستان میں بے روزگاری عام ہے اور اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ حکومتی یا نجی سطح پر مدد نہ ہونے کے برابر ہے۔ پاکستان میں ایک ایسا طبقہ کافی بڑی تعداد میں موجود ہے جو یا تو بیک یا تنگ کرگزار آ رہا ہے یا کام ہی نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں دراصل زیر طبقہ ماحول بہت منظم ہے بلکہ ان کی اپنی ثقافت بھی قائم ہو چکی ہے۔ مثلاً ۱۹۹۰ء میں میں نے بنگلیوں میں رہنے والے ایک ایسے کردہ کے ساتھ کام کیا تھا جن کا چھتر بن چکا تھا کروہ یا تو غیر ملکی انجینئروں کی امداد پر گزارا کرتے تھے یا چوری کر کے۔ ان کے آدمی مکمل طور پر ان بڑھ اور نکلے تھے۔ غور نہیں کمانے تو نہیں جاتی تھیں البتہ گھر کے کام کا چ ضرور کرتی تھیں لہذا مردوں کی نسبت زیادہ محنت تھیں۔ ان کے بچوں کے ہاں سکول جانے کا کوئی رواج نہیں تھا نہ ان کے والدین اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ایسے بچوں کا کیا مستقبل ہوگا وہ بھی اس ملک میں جس کے وسائل کم اور نوجوانوں کی شرح زیادہ ہے۔ یہ بہت تنبیہ سوال ہے۔ یہ ہمارے ملک و نسل کی بقا کا سوال ہے جس کی طرف ہماری توجہ بہت کم ہے۔

علامہ اقبال نے غربت کو بھی مومن کی شان کے خلاف کہا ہے۔ جاہد نامہ میں فرماتے ہیں

مومن و پیش کساں بستن نطق
مومن و غداری و فقر و نفاق

(ترجمہ: مومن ہوتے ہوئے غلامی کا پکڑا کر پر بانہذا، مومن ہوتے ہوئے غداری اور غربت و نفاق کی زندگی بسر کرنا مومن کی شان نہیں۔)

تحقیق ثابت کرتی ہے کہ غریب نوجوان بہت آسانی سے مختلف تنظیموں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو ان سے اپنی مرضی کے کام کرواتی ہیں۔ یہ مسئلہ اب ملکی سطح سے نکل کر عالمی سطح پر جا چکا ہے کیونکہ اب پوری دنیا کو خطرے میں گھرا پانی ہے اور تمام اشارے پاکستان کی طرف جاتے



۲۰۱۲ء کے اواخر میں
دستاویزی فلم ”سیونگ فیس“
کے ذریعے جب پاکستان
کوعالمی دنیا نے فلم کا

سب سے بڑا پہلا آسکر ایوارڈ ملا، تو ذرائع ابلاغ میں یہ خبر
نمایاں طور پر شائع ہوئی اور اظہارِ فخر بھی کیا گیا۔ حالانکہ یہ
فلم ایک خوفناک معاشرتی مسئلے کو اجاگر کرتی ہے۔ اس
لیے بعض حلقوں کی طرف سے فلم اور شہین مہید پر خاصی
تہدید ہوئی اور انہیں بیرون ممالک کی ایجنٹ کہا گیا۔
اسلامی وقوفی اقدار کے منافی لباس زیب تن کرنے پر ان
پر ملامت بھی ہوئی۔

اس تنقید سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ سیونگ فیس
کچھ خوبیاں بھی رکھتی ہے۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک
پاکستانی ڈاکٹر، محمد بنواد کے عزم، مصمم، جذبہ حب الوطنی اور
ہمدردی کی لازوال داستان ہے۔ دوسرے اس نے ان
گمنام پاکستانیوں اور اداروں کو نمایاں کیا جو ایک معاشرتی
مسئلے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ تیسرے اسی فلم کی
بدولت ارکان اسٹیج ویمنز تہزاب چھینکنے کے اذیت ناک
عمل کی عین سیے سے واقف ہوئے۔ انہیں پھر تحریک ملی کہ وہ
تہزاب چھینکنے والوں کو سزا دینے کے لیے باقاعدہ ایک
قانون منظور کر دیں۔ اس نئے قانون کے تحت اب
تہزاب چھینکنے والے مجرم کو ۱۳ برس قید اور لاکھوں روپے



سیونگ فیس کی ایک ”ہیروئن“ کا علاج کرتے ہوئے

جرمانہ بنوگا۔ سیزب سے بڑھ کر اس نے عمالِ دوا کو
پاکستانی قوم اب باشعور، بیدار اور اپنے حقوق سے آشنا
ہو چکی۔ اب پاکستانی سول سوسائٹی چاہتی ہے کہ قانون کی
حکمرانی وطن عزیز میں رائج ہو اور اسی امر میں پاکستان کی
ترقی کا راز مضمر ہے۔

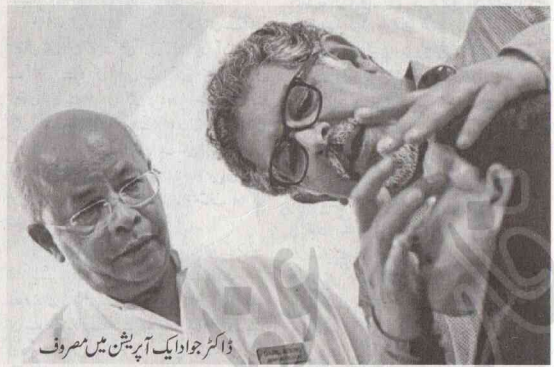
شہین عیدی کی عمدہ ہدایت کاری اپنی جگہ، لیکن سچ یہ
ہے کہ آسکر ایوارڈ دراصل ڈاکٹر بنواد اور شہین جانے والی
بہادر خواتین کو ملا۔ ڈاکٹر بنواد کو برطانیہ میں تمام آسٹریٹیشن
میسرخص لیکن وہ اپنا آرام تنج کر پاکستان آئے اور غریب
اور دھمی خواتین کا مفت علاج کیا۔ جبکہ شہین جانے والی
خواتین..... سیونگ فیس کی ہیروئنوں نے خود پر قیامت
ٹوٹنے کے بعد مایوسی یا خودکشی میں پناہ نہیں لی بلکہ علاج
کر دیا اور دوبارہ معاشرے کی مفید رکن بن گئیں۔
ڈاکٹر محمد بنواد کی داستان جدوجہد خصوصاً پاکستانیوں
کے لیے کئی سبق رکھتی ہے۔ آپ وطن عزیز کے وہ
جوہر قابل ہیں جنہوں نے بین الاقوامی سطح پر نہ صرف
پیشہ ڈاکٹری کو وقار بخشا بلکہ وطن کا بھی نام بلند کیا۔
دنپس بات یہ کہ ان کا ماضی اور حال خاصا متضاد ہے۔
آئیے پڑھتے ہیں کہ یہ کیا پلٹ کیونکر ہوئی۔

نٹ کھٹ پیچہ

ڈاکٹر علی محمد بنواد نے ۱۹۵۹ء میں شہر قائد، کراچی میں
جنم لیا۔ بچپن میں کھیل کود کے شائق تھے۔ اپنی شارٹروں
سے خاندان بھر کا ناک میں دم کیے
رکھتے۔ حقیقتاً والدین نے انہیں
زبردستی تعلیم دلائی ورنہ انہیں تعلیم
سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ ان
کے والد اس بات کے قائل تھے کہ
بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو
شیر کی لٹکا سے! لہذا اسی کڑی
نگاہ نے آہستہ آہستہ ۱۹۸۱ء میں
انہیں کراچی کی مشہور طبی درسگاہ،

ڈاکٹر میڈیکل کالج پٹنچاؤپا۔

اس زمانے میں کالج بھانت بھانت کی سیاسی تحفظیوں
سے بھرا ہوا تھا۔ محمد بنواد بتاتے ہیں کہ بعض طلبہ آئین چڑھا
کر سیاسی، علمی و ادبی بحثوں میں خوب حصہ لیتے، لیکن کبھی
جھگڑے کی نوبت نہیں آئی۔ اس وقت پاکستانیوں میں صبر
کا مادہ زیادہ تھا اور تنقید و اختلاف خندہ پیشانی سے
برداشت کیا جاتا۔
محمد بنواد پراپرٹش ٹوجوان تھے، لہذا انہوں نے کئی
دوست بنالیے۔ لیکن دوستوں کے چکر میں پڑھائی کا ہرج
ہوا اور وہ دو امتحانات میں فیل ہو گئے۔ ناکامی کا سامنا
کرنے پر والد نے انہیں سخت سزا دیا کہ وہ اپنا کمال
اپنی زندگی بھر ادا کرے۔ اب ٹوجوان بنواد کی عقل
ٹھکانے آئی اور انہوں نے سوچا کہ کچھ بننے کے لیے تعلیم
حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ پھر انہوں نے دل لگا کر
امتحان دیے اور ۱۹۸۲ء میں گرجویٹیشن کر لی۔
وہ جب تک پلاسٹک سرجن بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔



ڈاکٹر بنواد ایک آپریشن میں مصروف

اس وقت پاکستان اس شعبہ طب میں بہت پیچھے تھا لہذا
محمد بنواد اعلیٰ تعلیمی پانے برطانیہ چلے گئے۔ وہاں انہوں
نے ایف آری ایس (FRCS) کا پہلا حصہ (پارٹ)
پاس کرنا تھا۔
اب انہیں ایک عجیب مصیبت سے پالا پڑا۔ برطانوی
نصاب پاکستان سے مختلف تھا۔ شروع میں تو ان کے پلے
کچھ نہ پڑا۔ چنانچہ محمد بنواد دوبار امتحان میں ناکام رہے۔
پھر انہوں نے دن رات پڑھا اور تیری کوشش میں
کامیاب ٹھہرے۔
پاکستان واپسی پر وہ جناح ہسپتال، کراچی میں
تریتیت کے مرٹے سے گزرے۔ ۱۹۸۶ء میں کراچی ہی
نہیں پورے پاکستان میں گئے جتنے پلاسٹک سرجن تھے۔
پانچونچہ ہسپتال کے سرجن اتنے مصروف رہتے کہ انہیں سر
کھانے کی فرصت نہ ملتی۔ اس عالم میں محمد بنواد کو تریتیت
پانے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حالت یہ تھی کہ
جن مردوزن کے صرف ۲۰ فیصد بدن آگے سے چلے
لڑوڈاکٹسٹ اپریل ۲۰۱۲ء ۲۹

ہوتے وہ بوقت علاج نہ ہونے پر چل رہے تھے۔

۱۹۹۰ء میں محمد جواد آفرینڈ گئے تاکہ وہاں کے ایک ہسپتال میں اپنی تربیت مکمل کریں۔ نیز ایف آر سی ایس کے آخری حصے کا بھی انہوں نے امتحان دیا تھا۔ آفری ہسپتال میں پہلے ہی دن انہیں پیشہ ورانہ صدمہ پہنچا جب انہیں ایک مریض کی جلد رگڑنے (Scrub) کا طریقہ ہی نہیں آیا۔ دراصل پلاسٹک سرجن ایک معین طریقے سے یہ انعام دیتے ہیں۔ آخر ایک نرس نے براہ مہربانی انہیں طریق سکھا دیا۔ یوں ڈاکٹر جواد پر انکشاف ہوا کہ شعبہ طب میں نرسیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر جواد نے آئرش ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھا۔ ایک دن ایک بوڑھے ڈاکٹر نے نوجوان پاکستانی کو شعبہ طب کا عمدہ اصول بھی سکھایا۔ اس نے ڈاکٹر جواد کے ذمے لگایا کہ وہ ایک ۱۰ سالہ بچے کی دلچہ بھال کریں۔ ڈاکٹر جواد خود کو پلاسٹک سرجن سمجھتے تھے، انہیں یہ ذمہ داری پسند نہ آئی اور وہ بچے سے بے پروائی برت گئے۔

نرسوں کے ذریعے یہ معاملہ آئرش ڈاکٹر تک پہنچا۔ انہوں نے ڈاکٹر جواد کو بلایا اور کہا ”اگر یہ بچہ آپ کا بیٹا ہوتا، تو کیا تب بھی آپ اس سے ایسا ہی نامناسب سلوک کرتے؟“

یہ سن کر پاکستانی ڈاکٹر سنانے میں آگئے۔ انہوں نے پھر تہہ کر لیا کہ وہ رنگ، نسل، مذہب اور طبقاتی تقسیم سے بے نیاز ہو کر ہر مریض پر یکساں توجہ دیں گے۔ یہ ماضی کے عظیم مسلم اطباء کی اصول ہے جو مغربی معالج اپنا چکے۔

برطانیہ سے پاکستان تک

۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر جواد نے ایف آر سی ایس پاس کر لیا۔ یوں وہ مستند ڈاکٹر بن گئے۔ وہ پھر برطانیہ میں مقیم ہو گئے۔ انہوں نے لندن میں کئی نامور پلاسٹک سرجنوں کے ساتھ کام کیا اور پلاسٹک سرجری کے ایک شعبہ، مرمت نو (Reconstructive) سرجری میں مہارت

حاصل کر لی۔ اس شعبہ سرجری میں آگ یا جلے مریضوں کی متاثرہ جلد مختلف طریقوں سے درست کی جاتی ہے۔ دراصل ڈاکٹر جواد جانتے تھے کہ پاکستان میں آگ میں جلنے کے واقعات معمول ہیں، لہذا وہ اپنے ہنر کو وہاں کام میں لانا چاہتے تھے۔

برطانیہ میں ڈاکٹر جواد کو ہر آسائش زندگی..... شاندار گھر، گاڑی اور دیگر سہولیات مل گئیں، لیکن جین کے عالم میں وہ اپنے وطن اور ہم وطنوں کو نہیں بھولے۔ چنانچہ ۱۹۹۸ء میں پہلی بار پاکستانی ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ وہ پاکستان گئے۔ وہاں انہوں نے آگ میں جلے غریب و مصیبت زدہ پاکستانیوں کا مفت یا ارزاں علاج کیا۔ ۲۰۰۵ء میں غیر پیشہ ورانہ آگیا، تو ڈاکٹر صاحب اپنی ٹیم کے آئے اور زلزلہ زدگان کے لیے براہی بچ لگایا۔

کینیڈا پیر سے مگر آؤ

۲۰۰۸ء میں لندن کی ایک انجمنی ماڈل، ۲۰ سالہ کینیڈا پیر پر اس کے ایک عاشق ناچنار نے تیزاب گرا دیا۔ اس کا حسین و جمیل چہرہ دیکھتے ہی دیکھتے خ



کینیڈا پیر

بیت اختیار کر گیا۔ کینیڈا کی دنیا اندھیر ہو گئی حتیٰ کہ وہ خود کشی کرنے کا سوچنے لگی۔

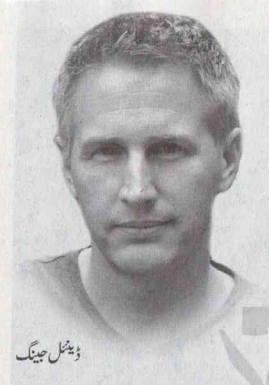
ایسے نازک موڑ پر کینیڈا کی ملاقات ڈاکٹر جواد سے ہوئی۔ انہوں نے لڑکی کو دلاسا دیا اور بتایا کہ وہ اس کا چہرہ فطری حالت میں لانے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ یوں کینیڈا کی ڈاکٹر صاحب کچھ پریشان تھے۔ دراصل انہوں نے بھی تیزاب سے جلے مریض کا علاج نہیں کیا تھا۔ مگر انہوں نے حوصلہ بلند رکھا اور ایک نئے طریق علاج سے بچاری لڑکی کا علاج کیا۔ اس طریق میں قدرتی اور مصنوعی جلد کے آمیزے سے نئی جلد نسج پر منمنجی جاتی ہے۔

یہ طریق علاج کامیاب رہا۔ اس پر پھر ایک برطانوی ڈی وی چینل، چینل فور نے دستاویزی فلم بنائی جو دنیا بھر میں دکھائی سے دکھائی گئی۔ اس فلم میں کینیڈا نے ڈاکٹر جواد کو ”ہیرا ہیرو“ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا۔ کینیڈا کے چہرے کو فطری حسن تو نہیں مل سکا، لیکن اب اسے دیکھتے ہوئے کراہت محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر جواد کی خدمات مدنظر رکھ کر انہیں پھر پنجم تہیل اور وزیر اعظم باؤس (۱۰، ڈاؤننگ اسٹریٹ) بھی مدعو کیا گیا۔ یوں ڈاکٹر جواد یورپ کی جانی بچاؤ شخصیت بن گئے۔

سیوگ فیس کا جنم

۲۰۰۸ء کے اواخر میں بعض غیر سرکاری پاکستانی تنظیموں نے ڈاکٹر جواد سے رابطہ کیا۔ وہ جانتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب پاکستان آ کر تیزاب سے جلے خواتین کا علاج کریں۔ جب انہوں نے غریب پاکستانی خواتین کی الم ناک داستانیں سنی، تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے جھجک گئیں۔ انہیں احساس ہوا کہ ظالم مرد اس لیے خواتین کے چہروں پر تیزاب پھینکتے ہیں کہ چہرہ ہی ایک عورت کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اُسے نقصان پہنچ جائے تو ان کی زندگی تاریک ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر جواد نے پھر نہ صرف پاکستانی تنظیموں کی آواز



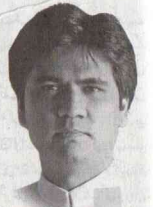
ڈیوینل جینک

پر لبیک کہا بلکہ انہیں مطلع کیا کہ وہ غریب اور ضرورت مند خواتین کا علاج مفت کریں گے۔ یوں ڈاکٹر جواد ہر تیسرے جو تھے مہینے پاکستان آ کر ہندہ ہیں دگی روحوں کی زندگیوں میں ازسرنو ہار لانے لگے۔

۲۰۰۹ء کے اواخر میں بی بی سی ریڈیو نے ڈاکٹر جواد پر ایک پروگرام کیا۔ اس میں انہوں نے اپنے تجربات بیان کیے۔ یہ پروگرام کینیڈا کے ایک نوجوان ہدایتکار، ڈیوینل جینک نے بھی سنا۔ وہ جنوبی ایشیا میں تیزاب سے جلے خواتین پر ایک دستاویزی فلم بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کام کا آغاز کیسے کرے۔ اُسے مشاورت کے لیے ڈاکٹر جواد موزوں شخصیت نظر آئی۔ ڈاکٹر جواد سے ملاقات کے بعد پھر یہ آئیڈیا یا سامنے آیا کہ وہ پاکستان جا کر متاثرہ خواتین کا علاج کریں اور اس سارے عمل کو فلما یا جائے۔ یوں سیوگ فیس کا جنم ہوا۔ متاثرہ پاکستانی خواتین کے خاندان راضی نہیں تھے، ڈاکٹر جواد نے انہیں یقین دلایا کہ اس کا ڈش سے ایک اہم معاشرتی مسئلے کی تصحیح کرنے میں مدد ملے گی۔ تب ہی

کیا اصل ہسیر کسی ایوارڈ کے مستحق نہیں

وسی شاہ



پہلے مجھے کچھ اور کہنا ہے۔

چونکہ خطوط کا زمانہ اسی میل اور سکا پپ سے بدل چکا ہے۔ بعض اقدار اور روایات میں بھی 180 ڈگری کی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں، اس لیے غالب کے مندرجہ بالا درج کیے گئے شعری وضاحت میں خصوصاً ان جوانوں اور طلبہ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر زمانے میں جب کوئی بڑی خبر یا موت کی خبر آیا کرتی تھی تو خط کے لفافے کو بند نہیں کیا کرتے تھے، کھلے لفافے کا مطلب یہ ہے ہوا کرتا تھا کہ اس میں سے کوئی بڑی خبر برآمد ہونے والی ہے، سو سبھی حال برسوں سے پاکستانیوں کا بھی ہے کہ نامہ بر جوتائے لاتے ہیں، وہ اکثر و بیشتر کھلے جوتے ہیں۔

شرین عید چٹائے علامت ہیں ہڑے کھٹے، معتدل اور لبرل پاکستانیوں کی جو پاکستان کا کوئی آئینہ بالوچ کے مطابق خرقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں، جو دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتے ہیں، جو پاکستان میں عورت کے کردار کو بھربورا اور توانا دیکھنا چاہتے ہیں۔

میں وجہ ہے کہ شرین کی اب تک بنائی 13 فلموں

مادر وطن میں برسہا برس کوئی اچھی خبر نہ آئی ہو، خوشی اور مسکراہٹ گویا 19 کروڑ پاکستانیوں کی زندگیوں، چہروں اور ہونٹوں سے روکھی گئی ہو، وطن میں بھی انسان خود کو عالم غربت یعنی بے وطنی کی کیفیت میں محسوس کرتا ہو اور بقول غالب۔

کیا رہوں غربت میں خوش
جب ہو حوادث کا یہ حال!
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

جہاں

والی حالت ہو وہاں پچھلے دنوں آرٹ کے میدان سے پاکستان کے لیے ایک بڑی خبر آئی اور وہ خبر تھی شرین عید چٹائے کے اسکرین کی یہ الگ بات کہ پاکستان میں شرین عید چٹائے کے اسکرین کے حوالے سے باقاعدہ ایک بحث شروع ہو گئی۔ کچھ لوگ اس اسکرین کو پاکستان کا فخر اور کچھ اسے بدنامی کا داغ کہتے رہے۔ کیوں؟؟؟ اس کی وضاحت مضمون میں آگے چل کر ہو گی مگر اس سے



سابق برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن ڈاکٹر جواد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

سرجن کی حیثیت نہیں ملی، بلکہ ایک ہیرو کی طرح ان کا استقبال ہوا۔

ڈاکٹر جواد کوئی فرشتہ نہیں، ان میں خامیاں بھی موجود ہوں گی۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بچے نمازی نہیں، لیکن نماز خیر ضرور ادا کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ”نماز خیر کے بعد میں خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ، مجھے معاشرے کی بھلائی کرنے کی توفیق عطا فرما۔“

پاکستان کے حالات دیکھ کر ان کا دل کڑھتا ہے۔ چاہتے ہیں کہ ہیرو ملک مقیم پاکستانی انجینئر اور دیگر ہنرمند وطن واپس جا کر پاکستانیوں میں اپنا تجربہ تقسیم کریں اور انہیں ہنر سکھائیں، صرف رقم بھجوانا کافی نہیں۔ پاکستان سے جو ہر کانٹل کے اخلا (Brain Drain) پر مبنی نہیں سخت تشویش ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو ڈائجسٹ پڑھتے ہم جوان ہوئے۔ اس نے ہماری ذہن سازی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

وہ آمادہ ہوئے۔ اگلے مرحلے میں پھر شرین عید منصوبے میں شامل ہوئیں۔ چونکہ وہ خاتون تھیں لہذا متاثرہ خواتین سے تال میل کرنے میں آسانی ہو گئی۔

چونکہ سیوگ فیس دلی جذبہ ہمدردی کے تحت قلمبانی گئی، لہذا اس میں سیکڑوں جذباتی مناظر ہیں۔ ان مناظر نے اپنے پرانے، بھی کو متاثر کیا اور وہ آسکر ایوارڈ بھی جیتنے میں کامیاب رہی۔

قدرت خدا کی!

نوجوانی میں جواد صاحب نے اس لیے پلاسٹک سرجن بننے کا فیصلہ کیا تھا کہ یوں انہیں ہالی وڈ جانے کا موقع ملے گا، وہاں وہ حسین و جمیل اداکاراؤں کے چہروں کی پلاسٹک سرجری کرتا چاہتے تھے۔ قدرت خداوندی دیکھئے کہ وہ ہالی وڈ ضرور پہنچے اور اداکاراؤں سے ملے، لیکن سب یہ تھا کہ انہوں نے منہ چروں کو خوبصورتی عطا کر ڈالی۔ پھر انہیں ہالی وڈ میں عام

پاکستان کا ایک چہرہ اگر تیزاب سے جلے عورتوں کا ہے تو دوسرا چہرہ دنیا کی سب سے بڑی ایمبولینس سروس چلانے والے ایدھی کا بھی تو ہے۔ اسے کوئی نمایاں کیوں نہیں کرتا

باتوں سے اتفاق نہیں کرتا کیونکہ معاملات اور ایجنڈوں کو اس خوف سے منظر عام پر نہ لایا جائے کہ اس سے ملک کی بدنامی ہوگی، انتہائی احتیاط اور جاہلانہ موقف ہے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ ”سب سے بڑی عادت وہ ہے جس کا انسان کو ادارک نہ ہو“ اور کسی بڑی عادت کے ادارک کیلئے اس عادت، اس مسئلے پر روشنی ڈالنا، اسے سامنے لانا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ پس چاہے اس کے پیچھے ملک کو بدنام کرنے کی کوئی سازش ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کو ”بھئی“ کے نیچے چھپانا نہیں چاہیے بلکہ اپنی ”بھئی“ کے نیچے ڈانگ پھیرتے رہنا چاہیے۔ مسئلے کو سامنے لانا اگر سازش بھی ہو تو بھی یہ اس ”لائت“ کی طرح ہوتا ہے جس کے پڑنے پر چٹائی بھارے کے مطابق کپڑے کا سب نکل جایا کرتا ہے۔ اسی طرح لباس کا معاملہ ہماری کوکوں کی ذاتی زندگیوں میں مداخلت کی عادت کو ظاہر کرتا ہے۔ بحیثیت قوم اب ہمیں لوگوں کو ان کے لباس سے جج کرنے کی عادت

پر بند کرانی کی وجہ بھی یہی ہے کہ دنیا پاکستان کو بدنام کر کے خوش ہونا چاہتی ہے اور اسی وجہ سے اس طرح کی فلموں کے لیے مختلف این جی او اور بیرونی طاقتیں فنڈز فراہم کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ”سیونگ میس“ کو بھی ”بول“ کی طرح بیرونی فنڈز سے بنائی گئی فلم کہا جا رہا ہے۔ ایک عام تاشیہ ہے کہ ”بول“ میں جس NGO نے فنڈز کی کئی، اس کے مطالعے پر ڈائریکٹر نے مذہبی عقائد اور مذہبی طبقے کو تضحیک کا نشانہ بنایا تھا۔ اسی طرح شرمین کی فلم کی فنگڈ بھی بیرونی فنڈز ہے اور آسکر ملنے کی وجہ کے پیچھے بھی پاکستان کی نیکامی نہیں بلکہ بدنامی میں اضافے کی خواہش ہے کیونکہ سیونگ میس پاکستان کی جہالت، جنونی رویوں اور خشنہ چہرے کو سامنے لاتی ہے۔ یہ طبقہ سوال اٹھاتا ہے کہ کوئی پاکستانی فلم میک یا ڈاکومنٹری بنانے والا عایدہ صدیقی پر فلم یا ڈاکومنٹری بنا کر آسکر حاصل کر سکتا ہے؟؟؟ یا کوئی این جی او عبدالرحیم ایڈمی کی زندگی پر فلم یا ڈاکومنٹری بنانے کے لیے فنگڈ کیوں نہیں کرتی؟؟؟ پاکستان کا ایک چہرہ اگر تیزاب سے جلے ہوئی عورتوں کا چہرہ ہے تو دوسرا چہرہ دنیا کی سب سے بڑی انفرادی اور فری ایڈیوٹیکس سروس چلانے والے ایدھی کا چہرہ بھی تو ہے، اسے کوئی نمایاں کیوں نہیں کرتا؟؟؟

یہی وجہ ہے کہ کچھ طبقے شرمین کی اس فلم اور شرمین کی کامیابی سے نالاں بھی ہیں اور اس طرح کی فلموں کو پاکستان کی بدنامی کا باعث سمجھتے ہیں اور بیرونی فنڈز سے بننے والی اس طرح کی فلموں کو چاہے وہ ”بول“ ہو یا ”سیونگ میس“، پاکستان کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں..... اس طبقے کا یہ بھی موقف ہے اور انہوں نے یہاں تک ٹوک کیا کہ اگر شرمین کو ایک بین الاقوامی پلیٹ فارم پر پاکستان کی نمائندگی کا موقع ملا ہی تھا تو بہتر ہوتا کہ وہ پاکستانی روایات اور ثقافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصل پاکستانی عورت اور ثقافت کا آئینہ دار لباس زیب تن کرتیں جیسے ڈاکٹر عبدالسلام نے خلافت پاکستانی علاقائی لباس چین کر توبل انعام وصول کیا تھا، اسی طرح کی اور بھی کچھ باتیں ہیں۔

پچ پوچھیں تو میں دوسرے موقف والے لوگوں کی زیادہ

میں سے ہر پاکستانیوں اور پاکستان کے بارے میں ہیں اور زیادہ تر فلموں کا موضوع عورت اور اس کے مسائل ہیں۔ شرمین اس سلسلے کی اپنی فلموں کیلئے کی ایوارڈ جیت چکی ہیں جن میں آسکر کے بعد مختصر سمجھا بننے والا ای ایم ایوارڈ بھی شامل ہے جو انہوں نے اپنی فلم ”چلڈرن آف طالبان“ کیلئے جیتا تھا۔

ان کی موجودہ فلم ”سیونگ میس“ پاکستان میں تیزاب سے جلادی جانے والی عورتوں پر مبنی ہے۔ غیر جانبدار تحقیق کے مطابق پاکستان میں ہر ماہ تقریباً ۸۰/۸۰ خواتین کے چہرے پر تیزاب پھینک کر انہیں جلادیا جاتا ہے یعنی سالانہ تقریباً ۱۰۰۰۰ عورتوں پر تیزاب پھینکا جاتا ہے۔ یہ تعداد یقینی تکلیف دہ بھی ہے، اذیت ناک بھی اور شرمناک بھی۔ شرمین کی اس کوشش سے یقیناً اس مسئلے کے بارے میں پاکستان اور پاکستان سے باہر آئی اور شہور بڑھے گا۔ آسکر جیتنے کے بعد فلم اور موضوع کو حاصل ہونے والی غیر معمولی شہرت سے پاکستان میں اس مسئلے کو ختم کرنے کے سلسلے میں قانون سازی اور قانون پر سختی سے عملدرآمد میں بھی مدد ملے گی۔ بیشتر پاکستانیوں کے لیے شرمین اور ان کا آسکر فخر اور خوشی کا باعث ہے لیکن شرمین کی اس جہت کا دوسرا پہلو بھی ہے اور ایک غیر جانبدار لکھنے والے کی حیثیت سے اسے سامنے لانا بھی یہ افسوس ہے، چاہے کچھ لوگ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں مگر یہ دوسرا پہلو بھی چونکہ عوام اور لوگوں کا ہی موقف ہے لہذا ہمیں اسے کسی حوصلے سے سنا اور پر دشت کرنا چاہیے اور پیش کی گئیں دلیلیں اور مضبوط اور روزنی ہوں تو انہیں تسلیم بھی کرنا چاہیے۔

جو لوگ شرمین کی ڈاکومنٹری فلم سے خوش نہیں ہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ شرمین کی جتنی بھی فلمیں پاکستان پر بنی ہیں، چاہے وہ ”چلڈرن آف طالبان“ ہو، ”پاکستانز اوپن سیکرٹ ہو“، ”بی ان وہیٹنگ طالبان ہو“، ”پاکستانز ڈیل گیم“ ہو یا پھر موجودہ ”سیونگ میس“، سب کی سب پاکستانی ریاست، معاشرے اور پاکستان کی بدنامی میں اضافہ کرتی نظر آتی ہیں اور ان کی بین الاقوامی سطح



شرمین چٹائے ”ای ایم ایوارڈ“ کے ساتھ جو انہیں فلم ”چلڈرن آف طالبان“ بنانے پر ۲۰۰۷ء میں ملا

AVATAR
 BECOMING A NA'VI

جب کہ ”ایوانا“ کو تمام تر بائیسٹی مقبولیت کے باوجود لے لے آسکر ایوارڈ نہیں دیا گیا کیونکہ ”ایوانا“ جنگ کی نفرت کرتی ہے، نو آبادیاتی نظام (colonialism) کی نفرت کرتی ہے، استحصال کی مخالفت کرتی ہے اور یہ واضح رہا بیسٹی امریکن فلم ہے اور اس کا پیغام تھا کہ بچھو امریکا نے لوگوں کے ساتھ کیا کرتا ہے، دیکھو مثنوی بددیانتی اور رسی سے انہیں ٹریٹ کرتا ہے۔ میل نے کہا ”ایوانا“ ان فنیڈ اصل اور حقیقی تصویر پیش کرتی ہے کہ کس طرح ایک اور امریکن لے کر مڈل ایسٹ، عراق اور فلسطین میں انوں کی نسل کشی کر رہے ہیں۔

ریکارڈ کی درق کے لیے یہاں اپنے فائین کوبہ بتانا
 کی ضروری ہے کہ شرین عید چٹائے آسکر حاصل کرنے
 والی پہلی نہیں بلکہ دوسری پاکستانی ہیں۔ حیرت انگیز طور
 پر مارمیڈ آئیں پہلی پاکستانی قرار دیا تھا۔ وہ دو خاتون میں
 سے سکر حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی ضرور ہیں مگر مردوں
 کی تفریق سے بہت کراہتی تھی طور پر آسکر حاصل کرنے والی
 دوسری پاکستانی ہیں۔ آسکر حاصل کرنے والے پہلے
 پاکستانی یہ فٹبلی کراچی کے ایک نوجوان ہیں جنھوں نے
 ۲۰۰۰ء میں فلم ”گولڈن مین“ کے ”Visual effects
 specialists“ کے طور پر یہ ایوارڈ اپنے خیمہ کے برادر حاصل
 کیا۔ گولڈن کمپس ہالی ووڈ کی فلموں میں سے ایک فلم تھی

کیا میرے فلسفی جو میڈیا کی زیادہ وقیع نہ حاصل کر کے
 لیکن درحقیقت وہی آسکر جیتنے والے پہلے پاکستانی ہیں،
 کیا وہ بھی کی اپوار کے مستحق نہیں.....؟؟؟ وہ چلتے چلتے
 ان تمام اصلاحات لوگوں سے جو شرمین عید چنائے ہوں یا
 شیب منصور کو برائی اور بد صورتی کی نشاندہی یقیناً بہت اہم ہوا
 کرتی ہے مگر کیا یہی پاکستان یا پاکستانیوں کے بہت روپوں پر بھی
 فلم بنائیں؟؟؟ یہ وہی خند گدے لے لے لے..... آسکر
 لے لے لے مگر پاکستان کے بہت چہرے پر فلم بن کر اسے بھی تو
 دیا کے سامنے لانا چاہیے..... وہ آخروں کو لگے.....؟؟؟

مسلسل تیز رفت اور شفاف ترقی کرنے والی ۱۰۰ پاکستانی کمپنیاں

پاکستان 100

ان کمپنیوں نے ۲۱ ہزار سے زائد ملازمین پیدا کیں
یہ کمپنیاں ۵۵ فیصد سالانہ کے حساب سے ترقی کر رہی ہیں

۷۰ پاکستانی کمپنیوں نے عریب ۵۰۰ میں جگہ بنالی ہے

۸۲ فیصد اگلے دس سالوں میں نئی کمپنیاں بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں

پہلے نمبر پر آنے والی کمپنی E2E کی دس سالوں میں شرح ترقی ۱۹۱۸ فیصد رہی

کم عمر بچوں کے لیے دنیا کا سب سے خطرناک ملک بھارت

ڈیٹان بیک

حوالے سے دیکھا جائے تو ابتدائی بچپن میں ایک لڑکی زیادہ مضبوط ہوتی اور اس کے مرنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ وہ موت سے لڑنے میں زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ سماجی ماہرین کے مطابق بھارت میں بچوں کے لیے امتیازی رویے ۳۰ سالوں میں بڑے واضح ہیں۔ خوراک اور غذائیت، علاج معالجے کی سہولتیں، جذباتی تعلق اور رشتہ۔ امتیازی رویوں میں علاج معالجے کا معاملہ سرفہرست ہے۔ بیمار بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانے میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کو دئی جانے والی ویکسین کی شرح بھی کم ہے۔ لڑکیوں کی خوراک پر توجہ بھی کم دی جاتی اور ان کے ساتھ جذباتی تعلق بھی کمزور ہوتا ہے۔

بھارت کے زیادہ پڑھے لکھے اور بہتر آمدنی والے طبقوں میں لڑکی کی آمد کی خبر سننے پر حمل ضائع کرنے کا رجحان ہے تو دوسری طرف غریب اور کم پڑھے لکھے دیہی گھرانوں میں پیدا ہونے کے ابتدائی دنوں میں لڑکیوں کو کم توجہ ملتی ہے۔ مرد و شادی کے مطابق لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کے مقابلے میں کم ہے۔ اس حوالے سے پنجاب اور ہریانہ کی ریاستوں میں صورت حال زیادہ تشویش ناک ہے۔

بچوں کے لیے دنیا کا سب سے خطرناک ملک بھارت ہے۔ بھارت میں ایک سے ۵ سال کی درمیانی عمر والی لڑکی کے مرنے کا امکان ایک لڑکے کی نسبت ۵۰ فیصد زیادہ ہوتا ہے۔ بچوں کی شرح اموات میں دنیا بھر میں کمی پوری ہے خصوصاً بچپن کی شرح اموات میں کمی زیادہ نمایاں ہے لیکن دنیا کے ۱۲ بڑے ممالک چین اور بھارت میں اس کے برعکس رجحان دیکھا جا رہا ہے۔

اقوام متحدہ کی ایک حالیہ رپورٹ میں ۱۵۰ ممالک کے لیے ۲۰ سال سے زائد عمر سے پر محیط اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے۔ اس کے مطابق ۲۸ ہزار کے عشرے میں بھارت اور چین میں ایک سال تک کی عمر کی بچپن کی شرح اموات لڑکوں سے زیادہ رہی ہے۔ ۲۸ ہزار کے عشرے میں بھارت میں ایک سے ۵ سال کے لڑکوں کی شرح اموات کے مقابلے میں لڑکیوں کی ۱۱۰۰ اموات ہوئیں۔ یہ صورت حال عالمی رجحان سے مطابقت نہیں رکھتی۔ رپورٹ کے مطابق لڑکیوں کی اموات کی بلند شرح کی وجہ سماجی و ثقافتی اقدار ہیں۔ حیاتیاتی اسباب کے

مراجہ پاکستان کی تیزی سے ترقی کرنے والی نجی کمپنیوں کی نئی فہرست "پاکستان ۱۰۰" کے نام سے سامنے آئی ہے۔ یہ فہرست آل ورلڈ نیٹ ورک کی طرف سے جاری کی گئی۔ یہ ادارہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں انٹرپرائزیز کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔ اس ادارے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ تیزی سے ترقی کرنے والی نجی کمپنیوں کی درجہ بندی کے ذریعے ان علاقوں میں معاشی ترقی کا عمل تیز کیا جائے۔

جب ان کمپنیوں کی درجہ بندی اور ان کے نام سامنے آتے ہیں ان کے لیے ترقی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سرمایہ کار ان پر توجہ دینے لگتے ہیں۔ قابل لوگ ملازمتوں کے لیے ان کمپنیوں کا رخ کرنے لگتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ بھی ان کے نام اور کام کو نمایاں انداز میں پیش کرتے ہیں

"پاکستان ۱۰۰" میں شامل کمپنیوں کا تعلق آبی ٹی، ٹیکسٹائل، زراعت اور دیگر شعبوں سے ہے۔ آل ورلڈ نیٹ ورک نے ۱۰۰ کمپنیوں کی کارکردگی کو سراہا۔ "پاکستان ۱۰۰" میں ۸۰ کمپنیاں شامل ہوئیں۔ ان کے علاوہ ۱۲ کمپنیاں شارٹ اپ اور ۸ کمپنیاں زیرِ غور کی کیلیگری میں رہی تھیں۔

آل ورلڈ نیٹ ورک کی درجہ بندی میں شامل ہونے کا عمل بڑا شفاف تھا۔ اس میں کمپنی کی کارکردگی کو معیار بنایا گیا۔ ہر پہلی جو تین سال سے ۴۰ فیصد یا اس سے زیادہ ریویجو گروتھ کے ساتھ ترقی کر رہی تھی، درجہ بندی

۲۰ اردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

کے لیے درخواست دے سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کمپنی اپنے آڈٹ حسابات (Audited Accounts) بھی مہیا کرنے ہوتے ہیں۔

پچھلے سال اس ادارے نے پاکستان کی ۲۵۱۲ رتقار کمپنیوں کی فہرست جاری کی تھی۔ "پاکستان ۲۵" میں شامل ہونے والی کمپنیوں کی ۲۰۰۰ سے ۲۰۰۹ تک کے عرصے کے درمیان سالانہ ترقی کی شرح ۳۰۰ ملازمین کی اوسط کے ساتھ ۸۱ فیصد رہی تھی۔

اس ادارے کی طرف سے سامنے آنے والی ایک درجہ بندی عربیہ ۵۰۰ ہے۔ اسی طرح کی دیگر فہرستوں میں افریقا ۵۰۰، لاطینی امریکا ۵۰۰ اور یوریشیا ۵۰۰ شامل ہیں۔

۲۰۱۱ء میں ہی پاکستان کو عالمی سطح پر اپ اس وقت نئی پہچان ملی جب عربیہ ۵۰۰ میں پاکستان دوسرے نمبر پر آیا۔ عربیہ ۵۰۰ میں تیزی سے ترقی کرنے والی ۵۰۰ انٹرپرائزیز شامل تھیں۔

کمپنیاں مشرق وسطیٰ، شمالی افریقا، ترکی اور پاکستان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پاکستان کی ۱۰۰ کمپنیوں نے اس فہرست میں جگہ بنائی۔ ترکی ۱۱۰ کمپنیوں کے ساتھ نمبر پر آیا جبکہ پاکستان نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔

آل ورلڈ نیٹ ورک کی بنیاد ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل پورڈ نے اپنے ساتھیوں سے مل کر رکھی۔ مائیکل پورڈ برنسی دنیا کے اہم مفکرین میں شامل ہیں۔ ٹائمز آف لندن نے انہیں دنیا کا سب سے با اثر شخصیت کا ماہر قرار دیا۔

مائیکل پورڈ نے انٹرپرائزیز کے حوالے سے اپنے کام کا آغاز امریکا کے غریب شہری علاقوں سے کیا۔ اپنے کام کے ذریعے انہوں نے تیزی سے ترقی کرنے والی نجی کمپنیوں کی نشاندہی کی اور ان علاقوں کی معاشی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔



مشرق وسطیٰ، شمالی افریقا، جنوبی ایشیا اور جنوبی افریقا سے ۱۵۰۰ سے زائد کمپنیاں آل ورلڈ نیٹ ورک کی درجہ بندی کے لیے درخواست دے چکی ہیں۔ یہ ادارہ انٹرپرائزیز کے درمیان تعاون کے مواقع پیدا کرنے کے لیے انٹرنیشنل تیزی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔

پاکستان کی تیزی سے ترقی کرنے والی کمپنیوں کی درجہ بندی میں کراچی میں قائم ای ٹو ای (E2E) کمپنی پہلے نمبر پر آئی۔ یہ کمپنی ہوائی، سمندری اور زمینی راستے کی سامان کی ترسیل کی خدمات کے حوالے سے نمایاں نام رکھتی ہے۔ اس کمپنی نے ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۰ء کے درمیان ۱۹۱۸ فیصد کے حساب سے ترقی کی۔ ۲۰۱۱ء میں اس کے ریویجو ۶۰ ملین امریکی ڈالر اور ملازمین کی تعداد تقریباً ۴۰۰ تھی۔

عابد بٹ کراچی میں پیدا ہوئے اور سیٹیل براؤن پائی۔ ۱۹۹۹ء میں لمبو یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم ایس کی آنرز کی تعلیم حاصل کی۔ وہ سیلڈن سے سی اپنی عملی شروع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ کچھ نیا کرنا

چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے لاجسٹکس میدان پسند کیا۔ عابد بٹ کے خیال میں پاکستان میں کرپشن، سکوری کے الٹو، غیر شفاف اور غیر موثر حکومتی پالیسیاں انٹرپرائزیز کے راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

شہر	کمپنیوں کی تعداد
لاہور	۴۲
کراچی	۳۳
اسلام آباد	۱۲
راولپنڈی	۸
پشاور	۷
سیالکوٹ	۲
سرگودھا	۱
کاسوکی	۱
ملتان	۱
کل	۱۰۷

کمپنیوں کی تعداد

ریٹک	۸۷
شارٹ اپ	۱۲
زیر غور کمپنیاں	۸
کل	۱۰۷
کمپنیوں کی اوسط عمر	۱۱ سال
ملازمین کی تعداد، ۲۰۱۰	۴۱,۰۹۲

سربراہان

اوسط عمر	۴۳ سال
----------	--------

جنس

مرد	۹۲ فیصد
عورت	۸ فیصد

شہریت

پاکستانی	۹۳ فیصد
پاکستانی اور بریتانیہ	۱ فیصد
امریکی	۲ فیصد
دیگر	۳ فیصد

وہ اپنے کام کو اس علاقے میں پہلی ایشیا اور متحدہ عرب امارات، بنگلہ دیش، سری لنکا میں پھیلاتے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ وہ لاکھوں میں زرعی شعبے میں بھی کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نیاز بس شروع کرنے، ہوں گے لیے ان کا مشورہ یہ ہے کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کے ارادہ آپ کے خیر خواہ موجود ہوں۔ اس سے آپ کو ترقی کرنے میں مدد ملے گی۔

بینی جینی اور Deirdre Coyle
(آئل ورلڈ نیٹ ورک)

مزید ترقی پانچوں کی بنیاد رکھی	۲۶۴
تلقی ابھی موجود ہیں	۱۷۲

کتنے نئے برنس شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں	۸۲ فیصد
تلقی کی پانچوں شروع ہوں گی	۱۴۰

ان کمپنیوں کا تعلق کن صنعتوں سے ہے۔

سافٹ ویئر سروسز اینڈ پرائیوٹس	۱۰ فیصد
کنسٹرکشن اینڈ انجینئرنگ	۹ فیصد
پرائیوٹ اینڈ کنسلٹنگ	۹ فیصد
میڈیکل اینڈ ہسپتال	۸ فیصد
ٹیکسٹائل اینڈ فیشن	۸ فیصد
تعلیم	۶ فیصد



بینی جینی اور Deirdre Coyle

ایپورٹ ایکسپورٹ ٹریڈ	۶ فیصد
ہسٹلٹیز اینڈ ہیلتھ کیئر	۶ فیصد
دیگر	۳۸ فیصد

اپنے ملازمین کی نیا بنزس شروع کرنے میں مدد کی

ہاں	۵۰
نہیں	۵۰

کل وقتی ملازمین کو کیا فوائد دے رہی ہیں

کل وقتی کورسز اور پروگرامز کے مواقع	۸۸ فیصد
کارکردگی پر منحصر فنانس بونس	۸۲ فیصد
تنخواہ کے علاوہ ہیلتھ کیئر کے فوائد	۷۸ فیصد

مینٹل یا الیکٹرونک پلیٹ فارم جہاں ملازمین اپنی کو مضبوط کرنے کے لیے اپنے خیالات ایک دوسرے سے تبادلہ کر سکیں

کارکردگی کی جانچ (سماں)	۵۴ فیصد
انفرادی کی پروموشن پلان	۵۱ فیصد
کام کا Flexible شیڈول	۳۸ فیصد

تنخواہ کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع کمپنی میں معذور افراد کے لیے مواقع

تفریح و تفریح کرنے کا منصوبہ	۳۱ فیصد
ملازمین کے لیے رہائشی کارپورٹ	۲۶ فیصد
دیگر	۲۰ فیصد

تنخواہ کے علاوہ گھر کی ملکیت کے فوائد	۱۴ فیصد
Equity (کمپنی میں)	۱۴ فیصد

کمپنیاں کس چیز کو ترقی میں رکاوٹ قرار دیتی ہیں

حکومتی ریکولیشن/سرخ فیتہ	۳۸ فیصد
قابل پیروی نئی تلاش	۳۱ فیصد
قلت یا لاگت نرم فٹس کی کاسٹ	۲۱ فیصد
کنسٹرکشن کی طرف سے ادائیگی میں تاخیر	۲۰ فیصد
دیگر	۱۹ فیصد
ورکنگ کپٹیل کی قلت یا کاسٹ	۱۸ فیصد
Expansion کے لیے غیر ملکی	۱۰ فیصد
منڈیوں سے مقابلہ	۱۰ فیصد
آرڈر کی کمی یا ڈیمانڈ میں کمی	۸ فیصد

موجودہ نفع کا ۱۲ ماہ قبل کی صورت حال سے کیسے موازنہ کرتی ہیں

بہت اچھا	۴۰ فیصد
اچھا سطح پر	۱۹ فیصد
بلند	۳۶ فیصد
کم	۴ فیصد
بہت کم	۰ فیصد
کل	۱۰۰ فیصد

عمرزا

شاہراہ زندگی پر کامیابی کا سفر

راشد حسین (اسٹنٹ ڈسٹرکٹ انارنی)

یہ

آج سے دس گیارہ سال پرانی بات ہے۔ اب یاد نہیں کس ذریعے سے اس کتاب کا علم ہوا۔ کراچی سے بذریعہ ڈاک منگوائی جانے والی اس کتاب کا نام ”شاہراہ زندگی پر کامیابی کا سفر“ ہے۔ مصنف ”محمد بشیر جمعہ“ تھے۔ میں ایک وکیل صاحب کا انٹر پاس کلرک یا منشی تھا۔ کتاب کیا پڑھی، میرے لیے تو زمین آسمان ہی الٹ پلٹ گئے۔ انہوں نے لکھا: ”انسان کی زندگی میں یہ لمحات کم ہی آتے ہیں کہ انسان خود اپنی عدالت قائم کرے۔ خود ہی ملزم ہو، اپنے ہی خلاف مقدمہ دائر کرے، خود ہی اس کے مختلف پہلوؤں پر صفائی پیش کرے، خود ہی جج ہو اور خود ہی کو مجرم بھی ثابت کرے اور بعض اوقات خود کو بُری بھی کر دے۔ یہ عدالت احساس کی عدالت ہے۔“

ایک عام اور اوسط درجے کا آدمی ہوتے ہوئے بھی میرے شب و روز میں تحریک کا پارہ دوڑا دینے والی اس کتاب نے مجھے بہت کچھ دیا۔ وقت کے زیاں کے احساس کی دولت جسے مل جائے اُسے زندگی میں سکوت و سکون محال ہو جاتا ہے، یہی میرے ساتھ ہوا۔ کچھری میں مزدوری کرتے ہوئے پہلے بی اے، پھر لاء، پھر پریکٹس اور آج مقابلے کے امتحان کے بعد اسٹنٹ ڈسٹرکٹ انارنی ہوں۔ اللہ کی عطا، والدین، دوستوں کی دعائیں اور اس کتاب کا احسان۔ شاید کتاب نہ پڑھتا تو اس مقام پر نہ پہنچ سکتا۔ تحریک اور احساس

کی وجہ سے بہت کچھ ملا۔ یہ تو وہ ہے جو نظر آرہا ہے۔ وقت کی قدر، زندگی پتانے کی پلاننگ، جاگتے ہوئے فرد کو جھنجھوڑنے والی کتاب ہے۔ کہتے ہیں کہ ”انسان بہت کم اس احساس کی عدالت میں آتا ہے کیونکہ اس کے لیے عزم و ہمت اور تنہائی کے لمحات چاہئیں۔ یہ وہ عدالت ہے جہاں انسان اپنے ارادوں کا جائزہ لیتا، حقائق کو سمجھتا، ماضی کا احتساب کرتا، حال پر توجہ دیتا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ یہ عدالت بعض واقعات کے رد عمل کے طور پر اور بعض اوقات اچانک جذباتی کیفیت میں قائم ہو جاتی ہے اور اس کے لیے کسی کورٹ کی عمارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس عدالت کے ذریعے انسان کو سزا یا جزا کے طور پر جو چیز ملتی ہے اسی کا نام کامیابی ہے۔ یعنی احتساب ایک ایسا عمل ہے جس کے بعد ہر صورت میں انسان کو کامیابی ملتی ہے۔“

میں بھی تقریباً ہر شب عدالت قائم کر کے خود کو پیش کرتا ہوں۔ اپنی غلطیوں، کوتاہیوں، خطاؤں اور سستیوں پر شرمسار ہو کر اللہ اور اپنے احساس (ضمیر) سے معافی مانگتا، توبہ کرتا اور اگلے دن ایک نئے جذبے سے زندگی کو جینے کی کوشش کرتا ہوں۔

”اگر انسان اپنی زندگی کے ہر دن کو آخری دن سمجھے اور ہر لمحہ جواب دہی کے احساس کے ساتھ گزارے تو بہت سارے کام اس احساس کے باعث قوت عمل پیدا ہونے کی وجہ سے پورے ہو جائیں گے۔“

پہلارنگ منگولیا تاریخ ساز سرزمین

منگولیا

”منگولیا داخلی“ کہتے ہیں۔ دوسرا آزاد ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے میں موجود ہے، جسے ”منگولیا خارجی“ یا صرف ”منگولیا“ کہا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ علاقہ منچوریا اور ہنگری کے درمیان انسانی ہجرت کی بہت بڑی گزرگاہ رہا تھا۔

تاریخ دان حضرات ”منگول“ کو ایک نسل کے نام سے جانتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ بہت سی نسلوں کی سرزمین ہے۔ تاہم زبان ایک ایسا جوڑ ہے جس نے ان سب کو ایک ہی تہذیبی پیوند میں پرو رکھا ہے، جبکہ تاریخی اور تہذیبی روایات کا مجموعہ بھی اس زبان اور علاقے کے لوگوں کے درمیان دوسری اہم قدر مشترک ہے، جس کے باعث بظاہر دیکھنے سے یہ لوگ ایک ہی قوم محسوس ہوتے ہیں۔ مغربی تہذیبی یلغار ان لوگوں سے ان کے لباس، قیام و طعام، طور و اطوار اور تمدن و معاشرت میں ان کی پہچان نہیں چھین سکی۔ حقیقت یہی ہے کہ جو اقوام تاریخ کے اندھیروں میں بھی اپنی شناخت کو جڑوں سے پکڑے رکھتی ہیں، ان پر تانناک مستقبل کا سورج ایک بار پھر مہربان ہو جاتا ہے اور جو قومیں روشن ایام میں اپنے ماضی کو فراموش کر دیں، وہ تہذیب و ثقافت میں دوسروں کی مقروض ہو جاتی ہیں اور انہیں تاریخ کے دھارے ہمیشہ کے لیے کتابوں میں دفن کر دیتے ہیں۔

منگول اقوام ”بان“ نسل کے قبائل سے ہیں، جن کے ڈانڈے چینی سرزمین سے ملتے ہیں۔ ”بان“ نسل کے قبائل کا سراغ وسطی ایشیا کے علاقے میں پہلی صدی قبل مسیح کے دوران ملتا ہے، جب انہوں نے یہاں ایک طاقتور ریاست کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں یہاں ایک بار پھر منگول اقوام کی واحد ریاست وجود میں آئی، جس کی بنیاد قبائلی روایات پر مبنی تھی۔ بہت جلد اس

شمال وسطی ایشیا کی قدیم ترین ریاست ہے جس کے شمال میں روس اور جنوب میں

چین واقع ہے۔ منگولیا کا تیسرا کوئی پڑوسی نہیں، حتیٰ کہ یہ مملکت سمندر کے جوار سے بھی محروم ہے۔ اس ریاست کا کل رقبہ ۱۶ لاکھ مربع میل سے کچھ زائد ہے۔ وسیع و عریض صحراء، اونچے اونچے پہاڑ، سطح مرتفعی سرزمین اور جنگلات سے بھرا یہ ملک نسبتاً سرد آب و ہوا سے معمور ہے۔ صحرائے گوبی یہاں کا مشہور ویرانہ ہے، جہاں سے اٹھنے والے طوفان نے قرون اولیٰ کے بغداد میں تباہیوں کی ناقابل بیان تاریخ رقم کی۔ ”الان بیٹار“ یہاں کا دارالحکومت ہے، جو مرکزی انتظامی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی سب سے زیادہ صنعتی اور کاروباری سرگرمیوں کا مرکز بھی ہے۔

مملکت کی ایک چوتھائی آبادی صرف اسی شہر میں قیام پذیر جبکہ ماضی قریب کی مردم شماری کے مطابق منگولیا کی کل آبادی ۲۰ لاکھ سے کچھ زائد ہے۔ اس لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے سب سے کم آبادی والے ممالک میں ہوتا ہے۔ تاہم ۲۰ ویں صدی کے وسط کے بعد سے یہاں کی آبادی میں بڑھوتری دیکھنے کو ملی ہے۔ یہاں کا اکثریتی مذہب بدھ مت ہے۔

منگولیا نے وسطی اور جنوبی ایشیا کو بہت سے حکمران خاندان دیے۔ گویا یہ ایک تاریخ ساز سرزمین ہے، جہاں کے سپہ سالاروں نے صفحہ ارضی پر اپنی مادر وطن کے نام کو خدا داد صلاحیتوں کے قلم سے سنہرے حروف میں رقم کیا۔ تاریخی منگولیا کا علاقہ اب سیاسی طور پر ۲۲ حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک حصہ چین کے زیر انتظام ہے، جسے



لاکھڑا کیا ہو کہ کوئی ملک دوسرے کا خیر خواہ نہ ہو، سوائے مفادات کے۔ روس کے ساتھ منگولیا کے ان مضبوط تعلقات نے روس کے زوال کا گہرا مشاہدہ کیا، لیکن چونکہ یہ مفادات ہی کا تعلق تھا، اس لیے منگولیا سمیت روس کے سب دوستوں نے، جو عروج کے زمانے میں لینن گراڈ کا طواف کرتے رہے، زوال ماسکو کے بعد اپنا قبلہ تبدیل کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔

منگولیا نے سیاسی نظام، معاشی تنظیم سازی اور تیکنیکی راہنمائی سمیت ہر میدان میں روسی نواز اشتراکی نظام کو اپنایا، حتیٰ کہ اپنی زبان کے حروف چینی بھی روسی زبان سے مستعار لیے۔ خارجہ پالیسی جہاں روس کے پاس گروی رکھ

ریاست کے حکمرانوں نے وسطی ایشیا کے ساتھ ساتھ چین اور روس کے بھی وسیع و عریض علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تاریخ میں اس ریاست کے حکمرانوں نے اچھی اور بری شہرت میں بہت نام کمایا۔ بہر حال، عروج کے بعد امتداد زمانہ غالب آیا اور یہاں زوال کے اندھیرے چھانے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بہت جلد پڑوسی ممالک کے بادشاہ یہاں قابض ہو گئے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۲۱ء کو منگولیا کے ایک حصے کو آزادی مل گئی۔

آزادی کے فوراً بعد منگولیا نے اپنی راہ و رسم روس سے بڑھائی۔ ظاہر ہے، ایسے میں تنہا پرواز تو ممکن ہو نہیں سکتی، جبکہ دنیا کو مغربی تہذیب نے تباہی کے اس دہانے پر



حالات پر قابو پایا اور تب سے اب تک منگولیا کی ترقی کا گراف بہت تیزی سے نہ سہی پھر بھی ایک مخصوص رفتار سے بلندی کی طرف گامزن ہے۔

منگولیا کے ”قازک“ اور ”خود“ قبائل مکمل طور پر اسلام سے متعارف ہیں۔ دارالحکومت سمیت ملک کے تمام شہروں میں مسلمان موجود ہیں۔ ۱۲۲۲ء اور ۱۲۵۳ء کے دوران یہاں ۲ مساجد تعمیر کی گئیں، شاید منگولیا میں یہ اسلام کا آغاز تھا۔ ۱۳۳۰ء کے بعد یہاں تین یا چار مسلمان خاندانوں نے بھی حکومت کی۔ مسلمانوں کی شرح پیدائش میں بڑھوتری کے باعث یہاں مسلمانوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا، لیکن روس کی شکست کے بعد بہت سے قازک جب اپنے وطن لوٹ گئے تو مسلمانوں کی تعداد میں ایک دم کمی واقع ہو گئی۔ یہ گزشتہ صدی کے آخر کی بات ہے، لیکن اس کے بعد جب سے آئین میں آزادی رائے اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، تب سے مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور مسلمانوں سمیت سب افراد کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی مکمل آزادی ہے۔ (مہاراجن)

انڈوڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء ۷

دی گئی، وہاں روسی افواج بھی منگولیا کی سرزمین پر اپنے اڈے بنانے لگیں۔ عام طور سے پہاڑی لوگ کسی کی غلامی قبول نہیں کرتے، اس لیے افغان مجاہدین کی مساعی جلیلہ کے باعث جب لینن کے بلند و بالا بت کو ماسکو کے سب سے بڑے چوراہے پر کرین سے اٹھا زمین پر پٹخ کر چور چور کر دیا گیا تو منگولیا کے عوام نے بھی غلامی کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا اور ایک بار پھر منگولیا کے تعلیمی اداروں میں اپنے روایتی حروف تہجی میں تعلیم دی جانے لگی، مذہبی، سیاسی آزادی اور آزادی رائے نے ایک بار پھر اس سرزمین کے آئین و دستور میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اب منگولوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی غیر ملک کی فوج کو اپنے ہاں جگہ نہیں دیں گے اور اس فیصلے کو آئینی تحفظ بھی دے دیا گیا ہے۔ روس کے زوال کے بعد منگولیا کی معیشت نے بہت بڑے دن دیکھے، ان کی داخلی اور بین الاقوامی معیشت کے پیانے بڑی طرح متاثر ہوئے، لیکن اس قوم کے پاس مخلص قیادت موجودگی، ایک ایسی قیادت جس کی اولاد، زر و مال اور جائیداد سب کچھ اپنے مادر وطن ہی میں تھا، لہذا قوم نے بہت جلد ان سخت

سعودی عرب دومۃ الجندل کے تاریخی مقام کا یادگار سفر

اللہ کے رسول ﷺ کو اطلاعات ملیں کہ شام کے قریب دومۃ الجندل کے گرد آباد قبائل آنے جانے والے قافلوں پر ڈاکے ڈال رہے ہیں اور وہاں سے گزرنے والی اشیاء لوٹ لیتے ہیں۔ ان اطلاعات کے بعد آپ ۲۵ ربیع الاول ۵ ہجری کو دومۃ الجندل کا رخ فرماتے ہیں۔ مسلمان دومۃ الجندل کے میدان میں اترے تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ آپ نے چند دن قیام فرما کر ادھر ادھر متعدد دستے روانہ فرمائے مگر کوئی ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ آپ مدینہ پلٹ گئے۔

سعودی عرب کے شمال میں واقع الجوف، ریاض سے کم و بیش ۱۲۰۰ کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ یہ اردن کی سرحد سے تقریباً ۲۵۰ کلومیٹر دور ہے۔ ۱۹ اپریل ۲۰۱۱ء کو صبح پونے چھ بجے ہماری فلائٹ ریاض سے الجوف کے لیے روانہ ہوئی۔ ایک گھنٹہ بیس منٹ میں ہم الجوف کے ہوائی اڈے پر اترے۔ سورج اپنی روشنیاں بکھیر رہا تھا۔ خوبصورت موسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اپریل

میں نے اپنی کتاب ”روشنی کے مینار“ میں جب ہمارا عبدالرحمن بن عوفؓ پر مضمون لکھا تو دوران مطالعہ دومۃ الجندل کا بھی ذکر آیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس علاقے کو فتح کرنے کے لیے متعدد فوجی مشن ارسال کیے جن میں خالد بن ولیدؓ اور سیدنا عبدالرحمن بن عوفؓ شامل تھے۔ یہ علاقہ سعودی عرب کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ تبوک مدینہ سے شمال کی جانب واقع ہے۔ اس سے اوپر اردن اور شام کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ارض مبارکہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ ہمارے شام، اور ہمارے یمن میں برکت عطا فرما۔ غزوہ تبوک میں اللہ کے رسول ﷺ کا بنفس نفیس وہاں تشریف لے جانا اور وہاں کم و بیش پندرہ دن قیام کر کے فاتحانہ انداز میں واپس آنا ہماری اسلامی تاریخ کا لہایت تابناک واقعہ ہے۔ رومن ایمپائر (سلطنت روم) کو اس کے علاقے میں جا کر چیلنج کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ غزوہ تبوک میں لڑائی نہیں ہوئی مگر دشمن پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

دومۃ الجندل کا علاقہ صحرائے نفود الکبیر میں واقع ایک شہر ہے۔ یہاں سے اس زمانے کے وسائل سفر کے اعتبار سے دمشق کا فاصلہ ۵ رات اور مدینہ کا ۱۵ رات بنتا ہے۔ یہ علاقہ رومی سلطنت کا حصہ تھا۔ قیصر کا باجگزار اس علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جن پر مختلف حکمران حکومت کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرتے جانیے اور نبی رحمتؐ کی سیاست، سیادت اور انداز حکمرانی کو بار بار خراج عقیدت پیش کیجیے کہ مدینہ طیبہ کی بیدار مغز قیادت نے ہمیشہ دور اندیشی اور حکمت پر مبنی فیصلے کیے۔



آخری ہفتے میں درجہ حرارت ۱۹ درجہ تھا۔ ہوائی اڈے
سکا کا ۲۰ کلومیٹر دور ہوگا۔

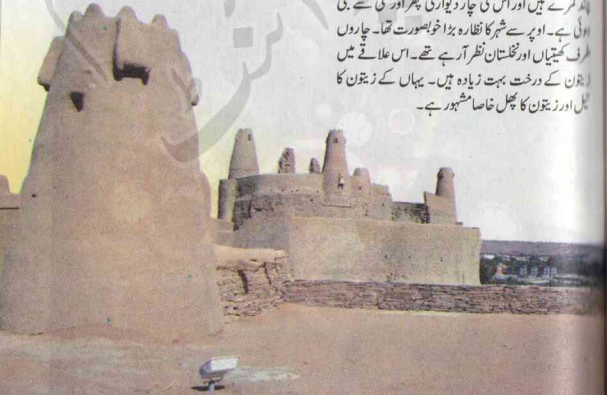
ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا اور ۱۱ بجے کے قریب اپنی
کا آغاز کیا۔ اس علاقے میں بہت ساری بستیاں ہیں۔
اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ سکا کا سے
۱۹ کلومیٹر دور دومتہ الجندل ہے جس کے بارے میں
تاریخین نے لکھا ہے کہ اس شہر کا نام سیدنا اسماعیل
علیہ السلام کے ایک بیٹے ”دوما“ کے نام پر رکھا گیا
ہے۔ لفظ جندل (پتھر) اس علاقے کے مضبوط قلعہ ”مارڈ“
سے لیا گیا ہے جس کی تعمیر پتھروں سے ہوئی ہے۔ الجوف
علاقہ اس شاہراہ پر واقع ہے جو عہد نبوی میں عراق سے
ہمارت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

سکا کا میں ہماری پہلی منزل قلعہ زعبل تھی۔ پہاڑ کی
پہاڑی پر چار برجوں کے ساتھ چھوٹا سا قلعہ تھا۔ قلعہ کے اندر
باندھ کرے ہیں اور اس کی چار دیواری پتھر اور مٹی سے بنی
ہوئی ہے۔ اوپر سے شہر کا نظارہ بڑا خوبصورت تھا۔ چاروں
طرف کھیتیاں اور نخلستان نظر آرہے تھے۔ اس علاقے میں
زیتون کے درخت بہت زیادہ ہیں۔ یہاں کے زیتون کا
یل اور زیتون کا پھل خاصا مشہور ہے۔

قلعہ زعبل کے دامن میں ہی کم و بیش ۲۰۰ میٹر کے
فاصلے پر سیسر نامی کنواں ہے۔ پتھروں سے بنے ہوئے اس
کنوئیں کا گھیر ۹۸ میٹر اور گہرائی ۱۵ میٹر ہے۔ کنوئیں کی
ایک طرف سے راستہ سبنا ہوا نظر آیا۔ صاف نظر آرہا تھا
کہ یہ راستہ پانی لینے اور آنے جانے کے مقاصد کے لیے
استعمال ہوتا تھا۔ وہاں ایک سرنگ ۳ کلومیٹر لمبی تھی جو
کھیتوں کو سیراب کرتی تھی۔

ظہر کی اذان ہو چکی تھی اور ہمارا رخ شہر کی سب سے
بڑی مسجد رحمانیہ کی طرف تھا۔ بڑی خوبصورت مسجد،
چاروں طرف وسیع پارکنگ، کھجور کے درخت اور
خوبصورت باغچے بنے ہوئے تھے۔

ہمارا سفر دومتہ الجندل کی طرف شروع ہوا۔ سکا کا
سے دومتہ الجندل ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ کوئی بڑا



سے مشہور راوی حدیث ابوسلمہ پیدا ہوئے۔

ہم اس وقت سیدنا عبدالرحمن بن عوفؓ کے سرال میں کھڑے تھے۔ ہمارے سامنے خوبصورت قلعہ اور سیدنا عمر بن خطابؓ کی مسجد کا منار اسلام کی عظمت اور سچائی کی گواہی دے رہا تھا۔ یہ مسجد جو کم و بیش ۱۵ میٹر لمبی اور ۸ میٹر چوڑی ہوئی مکمل طور پر پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ سیرت نگاروں کے مطابق یہ مسجد سیدنا عمر فاروقؓ کے حکم سے اس وقت بنائی گئی جب وہ بیت المقدس جا رہے تھے۔

آسمان سے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی۔ مسجد کا اکلوتا منار جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ آج بھی اسی طرح کھڑا ہے جس طرح اسے بنایا گیا تھا۔ مسجد سے ملحقہ محلات کے کھنڈروں کے پیچھے دور دور تک گھجوروں کے درخت اور کھیتیاں نظر آئیں جس سے منظر اور زیادہ خوبصورت بن گیا تھا۔

قلعہ مارو مسجد کے دائیں طرف خاصی بلندی پر واقع ہے۔ ہم قلعہ مارو میں داخل ہوئے تو یہ ہماری توقع سے بڑا تھا، سطح زمین سے تو خاصا اونچا تھا ہی، اب غور کیا تو پہلے عوام کے لیے ایک منزل تھی، پھر خواص کے لیے قدرے چھوٹی اور پھر خاص الخاص لوگوں کے لیے خاصی بلندی پر عمارت نظر آئی۔ بائیں جانب گہرا کنواں تھا۔ قلعہ کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ حکمران اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے کیا کچھ کرتے تھے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے دور میں دومتہ الجندل مسلمانوں کی اہم فوجی چھاونی تھی اور اس علاقے سے بڑی تعداد میں مجاہدین جنگوں میں شریک ہوتے تھے۔

منطقہ الجوف کا دودن کا یہ سفر بڑا یادگار رہا۔ اس علاقے کی تاریخ سے واقفیت کے ساتھ ہی یہ بات مزید ثابت ہو گئی کہ رہے ”نام اللہ کا“ یا باقی ہر چیز کے لیے فنا ہے۔ نجانے اس علاقے میں کتنے حکمران آئے جن کے نام و نشان مٹ گئے۔ البتہ ان کے آثار اور بنائے ہوئے قلعے ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔

(مہماندگ چید)

انڈوڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۳ء ۷

نہیں مگر اس کی تاریخی اہمیت ہی مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔ خوبصورت پانی دے پر سفر کرتے ہوئے بڑا مزا آیا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل جمع ہو رہے تھے۔ دھوپ تو صبح سے نہیں تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے ہم نے کاری کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ راستے کا نظارہ کرتے ہوئے ہم دھیرے دھیرے دومتہ الجندل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے گھاس اور چھوٹے چھوٹے درخت وطن عزیز پاکستان کے مناظر کی یاد دلا رہے تھے۔ دومتہ الجندل کا ایک ہی بڑا بازار ہے۔ باقی چھوٹے چھوٹے ایللی بازار ہیں۔ ایک طرف ”بجیرہ“ کا بورڈ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں پانی کی بڑی خوبصورت جمیل ہے۔ شہر کے ایک کنارے پر قلعہ مارو اور اس کے ساتھ مسجد عمر بن الخطابؓ ہے۔ سعودی حکومت نے یہ علاقہ بہت خوبصورت اور صاف ستھرا بنا رکھا ہے۔

دومتہ الجندل کی تاریخ اسلام میں ایک خاص شہرت رہی ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اللہ کے رسول ﷺ ایک بار اسے فتح کرنے کے لیے خود بھی تشریف لے گئے تھے۔ اس لشکر کے وہ خود قائد انکیش تھے مگر اس موقع پر لڑائی نہ ہو سکی کہ دشمن کا لشکر پیچنے سے پہلے تتر بتر ہو چکا تھا۔ ہجرت کے چھ سال شعبان کے مہینے میں اللہ کے رسول ﷺ نے عبدالرحمن بن عوفؓ کی دستار بندی فرما کر ارشاد فرمایا اگر تم دشمن پر فتح حاصل کر لو تو سردار قبیلہ کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لیتا۔

آپؐ ۷۰ سالہ سو مجاہدین کے ساتھ دومتہ الجندل کے علاقے میں پہنچے تو ۳۰ دن تک آپ دشمن کو دعوت اسلام دیتے رہے۔ اس علاقے کے سردار اصبح بن عمرو نے اسلام قبول کر لیا۔

عبدالرحمن بن عوفؓ نے آپ ﷺ کے فرمان کی روشنی میں اصبح کو اس کی بیٹی تمارض کے لیے پیغام نکاح بھیجا جو قبول کر لیا گیا اور دومتہ الجندل کی سرزمین پر یہ شادی انجام پائی۔ سیدنا عبدالرحمن بن عوفؓ واپسی پر اپنی دلہن کو ہمراہ لے کر مدینہ طیبہ واپس آئے۔ انھی کے بطن

تیسرا رنگ

امریکا ایک طلسماتی دنیا

پروٹسٹنٹ ہے، کوئی کیتھولک،
تو کوئی ہیٹھ، کوئی ایک خدا
کو مانتا ہے، کوئی تھلیٹ کا
قائل ہے تو کوئی نیچر کا، لیکن
چرچ کا اعتبار و احترام پوری
طرح موجود ہے۔ ہر اتوار
چرچ کی سروس میں متعدد
افراد شریک ہوتے ہیں۔
مذہب کی بنیاد پر کوئی تعصب

۱۶ جولائی ۲۰۰۸ء انٹرکینڈا کی پرواز سے میں امریکا
کے شہر ڈیٹریس پہنچا۔ امیگریشن سے جلد فارغ ہو گیا اور اپنا
ٹکٹ بیک لے کر ہوائی اڈے سے باہر آیا تو عزیز استقبال
کے لیے موجود تھے۔

آبادی کے لحاظ سے امریکا دنیا میں تیسرے نمبر پر
ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۳۰ کروڑ ہے۔ مقامی افراد کے
علاوہ آبادی کا ۱۰ فیصد باہر سے ہجرت زدہ افراد پر مشتمل
ہے۔ امریکا کا رقبہ بہت وسیع ہے اور اب بھی بہت سی
زمین ایسی ہے، جہاں کوئی آبادی نہیں۔

یہاں ہر مذہب کے لوگ آباد ہیں، لیکن دوسری بڑی
آبادی یہودیوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کا صحیح

تخمینہ موجود نہیں۔ ایک

مقامی اندازے کے مطابق

مسلمانوں کی آبادی چالیس

پینتالیس لاکھ سے کم نہیں۔

ہندوؤں کی تعداد ۱۰ لاکھ

کے قریب ہے۔ یہاں

اکثریت عیسائیوں کی

ہے، جو کئی فرقوں میں

بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی

ہیں اور نہ ہی آپس میں عقائد کے نام پر کوئی اختلاف ہے۔ لوگ دوسرے مذاہب کے افراد سے بھی رواداری اور خلوص کا برتاؤ رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جن میں پاکستانی اور بھارتیوں کی کثرت ہے، یہاں آباد ہے، خاص طور پر واشنگٹن، نیویارک، ہوسٹن، نیو جرسی، شکاگو، ڈیٹروئٹ میں خاصی ایشیائی آبادی ہے، جو ٹیکنیٹرنگ، طب اور کمپیوٹر کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔ جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں خاصی تعداد میں مسجدیں اور مدرسے قائم ہیں۔ دینی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن ان کا دائرہ اثر محدود ہے، یہاں آباد مسلمانوں کی نئی نسل فرنگی تہذیب سے متاثر اور خود مختاری کی طرف مائل ہے۔ اگر گھر کی تربیت کمزور ہے، تو معاشرے کے اثرات قبول کرنے کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔

امریکا کو اللہ نے قدرتی وسائل سے خوب نوازا ہے۔ ان وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے سخت محنت اور ایمان داری سے کام کیا ہے اور آج اسی وجہ سے ہر قسم کی ٹیکنالوجی ان کے پاس ہے۔

ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ یہ لوگ منصوبہ بندی، پلاننگ اور مینجمنٹ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کم خرچ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ٹیکساس سے ٹیلی فورنیا سفر کریں تو سڑک کے دونوں جانب لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ہزاروں چھوٹے چھوٹے خود کار پمپ چلتے نظر آئیں گے، جو زمین سے تیل نکال کر پائپ کے ذریعے ٹینکوں میں جمع کرتے ہیں، جہاں سے بڑے ٹینکر اسے ریفرنری لے جاتے ہیں۔ اسی طرح اسی علاقے میں تقریباً ۵۰ میل کا خطہ ہے، جہاں ہر وقت سخت تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اس جگہ ہزاروں کی تعداد میں خود کار ونڈلز نصب کر دی ہیں، جو ایندھن کے بجائے ہوا سے چلتی ہیں، جس کے نتیجے میں ونڈلز کے زیریں حصے میں نصب ٹربائن

چلتے اور بجلی پیدا کرتے ہیں، اس طرح بغیر کسی خرچ کے یہ مفت بجلی پیدا کر رہے ہیں۔

امریکی بہت سختی ہیں اور اسی محنت و جذبے نے ان کے ملک کو سپر پاور بنا دیا ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتے۔ ہر شخص کو پڑھنے کا شوق ہے، جہاں بھی موقع ملے، کتاب نکال لیتے ہیں اور پڑھتے رہتے ہیں۔ ٹیکنالوجی میں یہ دنیا بھر میں سب سے آگے ہیں۔ محنت، وقت کی پابندی اور صفائی ان کا ایمان ہے۔ ان کے شہر، ان کے گھر، ان کی سڑکیں، ان کی کلیاں نہایت صاف ستھری ہیں۔ کچرا سڑک پر پھینکنے پر ایک ہزار ڈالر جرمانہ ہے۔ عام طور سے کبھی، کچھ نہیں ہیں، کوئے، چیلیں بھی نظر نہیں آتیں، البتہ دیسی چڑیاں، فاختاں، کبوتر، گلہریاں کثرت سے نظر آتی ہیں۔

سڑکیں کشادہ، پختہ اور ہموار ہیں۔ حد رفتار ۱۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ کار اگر ۱۲۰ کلومیٹر کی رفتار سے جاری ہے تو ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے گلاس کے پانی میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں کے لوگ ٹریفک کے قوانین پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ سڑکوں پر ہزاروں لاکھوں گاڑیاں رواں دواں ہیں، لیکن سب اپنی قطار میں چلتے ہیں، کوئی ہارن نہیں بجاتا، کوئی دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ کہیں کسی سڑک پر آپ کو ٹریفک کا کاشیمل نظر نہیں آئے گا۔

اگرچہ قانون کی پوری طرح عمل داری ہے، لیکن پھر بھی جرائم پیشہ افراد موجود ہیں اور معاشرہ جرائم سے خالی نہیں۔ گاڑیاں موبائل چوری نہیں ہوتے، لیکن بڑی ڈکیتیاں اور بریف کیس غائب ہونے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور مخصوص مقامات پر محتاط رہنے کا مشورہ بھی دیا جاتا ہے۔

یہ لوگ خلیق، ہنس مکھ اور نظم و ضبط کے پابند ہیں۔ ہفتے میں پانچ دن سخت محنت کرتے ہیں اور دو دن تفریح میں گزارتے ہیں۔ صبح سویرے بیدار ہو کر اپنے کام پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ جلد سونے کے عادی ہیں۔ بجلی کی بچت

چوتھا رنگ برف کے باسی

مردوں کی زبان سے تھوڑی بہت مختلف ہے۔ ۱۹۳۱ء تک چوک چئی لوگوں کے پاس کوئی تحریری زبان نہیں تھی۔ لک بھگ ۵۷ فیصد چوک چئی لوگوں کا بھوئی ہے کو انہیں اپنی زبان پر عبور حاصل ہے۔ بیسویں صدی میں داخل ہونے تک انٹر چوک چئی لوگوں کو ایک ہی نام دیا جاتا تھا۔ خاندانی لقب کے استعمال کا رواج اس وقت پڑا جب حکومت نے لوگوں پر دیاؤ والا کہ وہ خاندانی نام اختیار کریں جو ان کے باپ کے نام پر ہو، تاکہ اسکولوں میں داخلے اور دیگر کاندھی کارروائیوں میں ہولت پیدا ہو سکے۔ بعض چوک چئی ذاتی نام پیدائش کے وقت کی قدرتی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے Tynga-gyrgyn اس کا مطلب ہے: طلوع آفتاب (مرد کا نام) اور Gyrongav کا مطلب ہے: بہار (عورت کا نام)۔ بعض اوقات والدین اپنے بچوں کو وہ نام دیتے ہیں جو کوئی خصوصیت ظاہر کرتے ہیں اور والدین وہ خصوصیت اپنے بچوں میں دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں، جیسے Omryn (عاقور انسان)، Gitingev (حسین عورت)۔

قدیم روایات میں زمین، سورج، چاند اور ستاروں کی تحقیق کے بارے میں دیوالائی داستانیں، جانوروں کے بارے میں روایتی قصے کہانیوں کے علاوہ حکایات اور لطیفے بھی شامل ہیں۔ بدروحوں کی کہانیاں بھی مشہور ہیں، جو بدقسمتی یا پیادری کا پیغام لاتی ہیں۔ شانان (قبائلی مذہبی پیشوا) کی مافوق الفطرت کہانیاں بھی مشہور ہیں، جو غیر معمولی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ چوک چئی میں کی قدیم جنگوں کا احوال بھی ملتا ہے۔

چوک چئی لوگوں کے مذہبی عقائد اور رسوم و رواج کو شانان ازم کی ایک قسم کہا جاسکتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ

روس (سانیریا) کے انتہائی شمال مشرقی حصے میں متعدد سانیریاں ہیں اور قدیم گروپ آباد ہیں۔ ان میں چوک چئی یا قدیم قبیلے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کی زیادہ تر شمالی جزیرہ نما چوک چئی میں واقع ہیں۔ جزیرہ نما کے اندرونی حصے میں آباد روایتی طوگڈرے یا چرواہے ہیں یا پھر ان کا پیشہ ریڈیئر کا شکار کرنا ہے۔ قبیلے سمندر کے ساحلوں پر آباد سمندری ممالیوں، ڈیل، والرس اور سمندری شیر کا شکار کرتے ہیں۔

۱۷۶۹ء سے روس نے اس علاقے میں دخل اندازی شروع کی۔ مقامی لوگ ردیوین کے غلام بننے کے لیے تیار نہ تھے وہ برابر مقابلہ کرتے رہے۔ ۱۷۶۰ء میں روسی حکومت کو شہرت سے اس بات کا احساس ہوا کہ چوک چئی لوگوں کو دبانے پر بھاری اخراجات آرہے ہیں اور ساتھ ساتھ روسی فوج بھی مسلسل مارے جا رہے ہیں۔ ردیوین نے کچھ شرائط پر چوک چئی لوگوں کو مقامی طور پر آزادی دے دی۔ دوستی کے پرست یہ علاقہ روس کے زیر اثر آگیا۔

اس وقت چوک چئی لوگوں کی تعداد ۱۵ ہزار کے قریب ہے۔ یہ جس علاقے میں رہتے ہیں وہ درختوں اور ہرنے سے محروم ہے، کہیں کہیں اکا دکا درخت نظر آتے ہیں۔ اس خطے کی آب و ہوا سخت ہے، جہاں موسم سرما میں درجہ حرارت محض اوقات منفی ۵۳ درجے سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ موسم گرما میں یہاں کا اوسط درجہ حرارت ۱۰ درجے سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ ساحلی خطے بالخصوص قبیلے سمندر کے ساتھ والے علاقے مرطوب اور کھراؤد ہیں۔ جیسے جیسے اندرونی علاقے کی طرف چلتے جاتیں، آب و ہوا مزید خشک ہوتی چلی جاتی ہے۔

چوک چئی زبان کا تعلق قدیم ایشیائی زبانوں کے خاندان سے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خواتین کی زبان

تعلیمی اخراجات کے لیے بینک سے قرض لیتے ہیں، جو تعلیم مکمل ہونے پر روزگار کے حصول کے بعد واپس کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر طالب علم بائیں رہتے ہیں۔ تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ اچھی تعلیم کے بغیر روزگار کا حصول یہاں بھی آسان نہیں۔ اعلیٰ ملازمت صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ یا پیشہ ور حاصل کرتے ہیں، ورنہ دیگر افراد عام دفاتر، مختلف اسٹورز، ریسٹوران، گیس اسٹیشن اور دیگر جگہوں پر ملازمت کر کے اپنی روزی کما لیتے ہیں، جس سے اس قدر آمدنی ضرور ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے اپنا ماہانہ خرچ چلا سکیں۔

درخت بے شمار ہیں اور بڑے بڑے جنگل بھی۔ درخت کا ٹنا جرم ہے۔ موسم بہار میں ہر طرف ہرنے ہی ہرنے اور بے تحاشا پھول کھلتے ہیں۔ یہاں کے لوگ پھولوں کے شیدائی ہیں اور گھر کے باہر کباہیوں کو پھولوں سے بھر دیتے ہیں۔ گھر کے باہر کئی گھاس کو تراشنا ضروری ہے، ورنہ جرمانا ادا کرنا پڑتا ہے۔

سپر پاور، امریکا میں ہر طرح کی جدید ٹیکنالوجی اور تمام سہولتیں ہیں۔ ہر مکتروں کا تقدس نہیں۔ لوگ مینیوین کے عادی ہیں، انسانوں کے نہیں۔ غرض امریکا کی سیر میرے لیے عجیب طمسائی دنیا کی سی تھی، جہاں ایک طرف ترقی کا جو بن ہے لیکن اس نے اسے احساسات و جذبات سے بھی کسر عاری کر ڈالا ہے۔

(خالد مہدی)



میں نہایت ماہر ہیں۔ جہاں بیٹھے ہیں، صرف وہاں کی لائسنس جلاتے ہیں۔ امریکا کی زندگی بہت سخت ہے گھر اور باہر کا سارا کام خود کرنا ہوتا ہے۔ ملازموں، مایموں، ڈرائیوروں، خائسانوں کا کوئی تصور نہیں، ہر فرد کو ہر کام اپنے ہاتھ سے ہی کرنا ہوتا ہے۔ مرد و خواتین سب ہی بازاروں، سڑکیوں، پارکوں اور بسوں میں ایک ساتھ ہوتے ہیں، لیکن ہر شخص اپنے کام میں مگن رہتا ہے۔

یہاں عالمی زندگی سخت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور کئی نفسیاتی مسائل جنم لے رہے ہیں۔ یہاں خاندان کا کوئی تصور نہیں۔ ہر لڑکا لڑکی ۱۸ برس کے ہوتے ہی والدین کا گھر چھوڑ کر اپنی دنیا بنا لیتے ہیں۔ یہاں اوسط عمریں زیادہ ہوتی ہیں۔ ۹۰ برس کی عمر عام ہے، جبکہ خواتین ۱۰۰ برس سے بھی زیادہ جیتی ہیں۔ حکومت ضعیفوں کا خاص خیال کرتی ہے، جب وہ بالکل تنہا و زوار ہو جاتے ہیں، تو انہیں اولد ہاؤس منتقل کر دیا جاتا ہے، یہ اولد ہاؤس این جی او چلائی ہیں۔

امریکا میں خواندگی کی شرح ۱۰۰ فیصد ہے۔ ہائی سکول تک تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ ہائی سکول کے بعد کالج و یونیورسٹی کی تعلیم شروع ہوتی ہے، جو کم از کم ۴ سال کی ہوتی ہے اور میس دینا پڑتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے مواقع اور دنیا کی مشہور ترین درس گاہیں بھی یہیں ہیں، جہاں ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، لیکن ان میں داخلہ صرف استحقاق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کالج چھپتے تک لڑکے اور لڑکی کی عمر ۱۸ سال ہو چکی ہوتی ہے اور وہ والدین کی کفالت سے نکل جاتے ہیں۔ پڑھائی کے ساتھ انہیں ملازمت بھی کرنا پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کے وظیفے سے نہیں ادا کرتے ہیں۔

ہالینڈ کا ایک خاندان پاکستان میں

کامیابی سے افزائش نسل کی۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایوی کچر سوسائٹی آف پاکستان کے اجلاس میں شرکت سے خوش محسوس کی کہ پاکستان میں پرجوش طور پر پرنڈ سے پالنے والے موجود ہیں۔ میرا بیٹا پال رنجر برگ پاکستان کی ایوی کچر سوسائٹی کا اور پرنڈ رن ہے اور میں نے بھی رکنیت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

مزر رنجر برگ نے کہا کہ لاہور کے علاوہ پشاور کے اندرون شہر بازاروں کی سیر ان کے لیے بڑا مختلف تجربہ رہا۔ دو دیارے کاہل کے کنارے تقریبی پارک میں کچھ کھنڈے گزار کر انہیں بہت لطف آیا۔ وہاں کے لوگ بلکہ پاکستان کے سارے مہمان نواز مہمان ہیں اور محبت کرنے والے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جس طرح باا حجت میں لوگ اکٹھے رہتے ہیں یا اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں ہالینڈ میں ایسا کم ہوتا ہے۔ خاندان کے لوگ ایک دوسرے پر انحصار نہیں کرتے، یہاں تک کہ لڑکا اور لڑکی اپنی شادی کے لیے خود ہی معیت کرتے ہیں اور خود ہی اپنا چوں ساجھی منتخب کرتے ہیں۔ اپنی شادی اور گھر کے اخراجات مل کر پورے کرتے ہیں۔

مزر رنجر برگ نے بتایا کہ میری اور مزر رنجر برگ کی ملاقات ایک بھل میں ہوئی، ہم دونوں بخت میں گرفتار ہو گئے۔ اس وقت میں ۲۱ برس اور مزر رنجر برگ ۲۲ سال کے تھے، ہم نے ایک دوسرے کو پسند کر کے شادی کا فیصلہ کیا۔ بچوں کی پیدائش منصوبہ بندی کے تحت ہوتی ہے۔ عموماً ایک سے چار تک بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بچوں کی تعداد میاں بیوی کی آمدنی پر منحصر ہوتی ہے۔ آمدنی کے ساتھ اگر خواہش ہو تو بچوں کی تعداد بھی بڑھا لیتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم اور صحت کی دے دار ہالینڈ کی حکومت ہوتی ہے۔

مزر رنجر برگ ہالینڈ میں پچھوں کی جالیاتی آرائش کی کپنی شوکا ڈور ز برڈر (Stukadoors Bedr) کے سٹیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ ہالینڈ کی تقیمی و ترقیاتی ایکڑی میں بھی پڑھاتے ہیں۔ پاکستان میں ان کے آنے کا حوالہ ”پرنڈ بانی کا مشغلہ“ ہے۔ پاکستان کی سیر کے علاوہ وہ یہاں کے پرنڈ بانوں سے ملنا بھی چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بیٹی ایوان بھی گئیں۔

رنجر برگ صرف ڈچ زبان جانتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی انگریزی ترجمانی کے فرائض ان کی بیوی اور بیٹی نے ادا کیے۔ مزر رنجر برگ سے ان کے مشغلے کے علاوہ ہالینڈ کی معاشرتی صورت حال پر بھی بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ہالینڈ میں کام کرنے کا رویہ مختلف ہے، میں خود اپنے کارکنوں کے ساتھ سیزمی پر چڑھ کر اپنے ہاتھوں سے کام کرتا ہوں اس میں بطور سٹیجنگ ڈائریکٹر میرا مزہ حاصل نہیں ہوتا۔

انہوں نے بتایا کہ وہ کئی بار لاہور آچکے ہیں اور ایک پاکستانی دوست عمر سبھل کی میزبانی میں پاکستان کی حسین ترین شمالی سیر گاہوں اور پہاڑی مقامات کی سیر کا لطف اٹھا چکے ہیں۔ ان کا بیٹا پال جو خود پرنڈوں کا شوقین ہے، پچھلی بار میرے ساتھ پاکستان آیا تھا۔ اس بار میری بیوی اور بیٹی پاکستان آئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پرنڈوں میں ساتھ سے زیادہ نوع کے تقریباً سو تیر اور بیئریں ان کے پاس ہیں۔ ان کا تعلق دنیا کے مختلف ممالک سے ہے۔ وہ بڑے شوق سے ان کی ہالینڈ میں افزائش نسل کرتے ہیں۔

پاکستان کا کالائز انہیں بہت پسند ہے۔ یورپ میں اس کی افزائش نسل مشکل کام ہے مگر مغربی یورپ میں وہ پیلے گھس میں جس نے کبھی بار پاکستان کے کالے تیز کی

اسے کمال کا لباس اور سلائی کا سامان دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لاش کو سپرد خاک کرنے کے لیے کسی ویران جگہ لے جایا جاتا ہے، جہاں یا تو اسے جلا دیا جاتا ہے یا ویرانے میں اسے ہی رکھ دیا جاتا ہے، جہاں شدید موسم اسے خود ہی ختم کر دیتے ہیں۔

چوک چچی کے قدیم اور روایتی گھر Yaranga کہلاتے تھے۔ یہ نر وڈلی یا رینڈ میڑوں کو باندھنے کے گول گھر ہوتے تھے جن میں اندر کی طرف صندوق کی شکل کا ایک کس ہوتا تھا، جسے سونے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ کس فرسے تیار کیا جاتا تھا اور اتنا بڑا ہوتا تھا کہ اس میں کئی افراد آسانی سے سو سکتے تھے۔ بعض چوک چچی آج بھی yaranga میں رہتے ہیں، لیکن اب اس خطے میں لکڑی کے ایک منزلہ مکان بھی نظر آتے ہیں اور کنکریٹ سے بنائی کئی بڑی عمارتیں بھی۔

سلائی چوک چچی ایک جگہ سے دوسری جگہ آئے جانے کے لیے روایتی سلیخیں استعمال کرتے تھے یا کھالوں سے تیار کردہ کشتیاں، جبکہ کشتی پر رہنے والے چوک چچی وہ سلیخیں استعمال کرتے تھے جنہیں رینڈ میڑ کھینچتے ہیں۔ یہ قدیم اور روایتی طریقہ آج بھی مستعمل ہے، لیکن اب بذریعہ فضا بھی سفر ہو رہا ہے، موٹر بولس بھی استعمال ہو رہی ہیں اور سٹوموبائلز بھی۔ (مرزا ظفر بیگ)

تمام جانور، پیر پودے، فلکی اجسام، دریا، جنگل اور قدرت کی دیگر نشانیوں بھی روحوں کی مالک ہوتی ہیں۔ مذہبی رسومات کے دوران چوک چچی شانان جادو منتر بھی کرتے ہیں۔ یہ شانان جادو کے ذریعے روحوں سے بات کرنے کے دعویدار ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ روہیں ان کے ذریعے دوسرے لوگوں سے باتیں کرتی ہیں۔ شانان نہ صرف مستقبل کی پیش گوئیاں کرتے ہیں، بلکہ مختلف قسم کے جادو ٹونے بھی کرتے ہیں۔

چوک چچی میں اہم ترین تہوار وہ ہوتے ہیں جن میں روحوں کے حضور قربانیاں پیش کی جاتی ہیں، تاکہ قربانی پیش کرنے والے سلامت اور محفوظ رہ سکیں۔ یہ قربانیاں چوک چچی کو رینڈ میڑ کے ریڑوں میں اضافے کے لیے موسم خزاں میں دیتے ہیں اور سلائی علاقوں کے لوگ موسم گرما میں دیتے ہیں۔

ایک زمانے میں چوک چچی میں بچے کی پیدائش پر نہ جانے کئی رسومات ادا کی جاتی ہیں اور کتنے ساجی اصولوں پر عمل کیا جاتا تھا، لیکن دور جدید میں ان رسومات کی ادائیگی میں کافی کمی آگئی ہے۔ چوک چچی لوگوں میں موت کے موقع پر بھی متعدد باضابطہ رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ مرنے والے کی لاش کو اس کی خواب گاہ میں رکھ دیا جاتا ہے اور ایک یا دو دن تک اس کی نگہبانی کی جاتی ہے کہ وہ دوبارہ زندہ نہ ہو جائے۔

جب گمرانی مکمل ہو جاتی ہے تو لاش کو غسل دیا جاتا ہے، اسے تباکو اور تیر کمان یا بھالے (مردوں کے لیے) کے تحفے دیے جاتے ہیں۔ اگر مرنے والی عورت ہے تو



رینڈ میڑ

چھٹ رنگ یہودیوں کا اسرائیل

ڈیوڈ بن گوریان کے نام سے منسوب ہے۔ کشادہ ، بلند و بالا ، ندرت و رعنائی اور تعمیر حسن کی تصویر، بن گوریان ہوائی اڈے کے پر وقار اور عروج کن دروہام کے حجر میں مہیوت طویل راہ داریوں سے ہوتے ہوئے ، ہم اس ہال میں آن وارد ہوئے ، جہاں ہوائی اڈے کے سیکورٹی عملہ نے مسافروں کے پاسپورٹ ، ویزا چیک کر کے ، اسرائیل میں داخلے کی اجازت دیتا ہے۔ اس شاف کا فیصلہ جیسی آخری ہوتا ہے۔

ہم ایک سیکورٹی افسر صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ ہماری ٹیکہ صاحب نے پاسپورٹ آفیسر کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے بغیر کسی تاثرات کے ہمارے پاسپورٹوں کی ورق گردانی کی۔ پھر سر اٹھا کر پوچھا کہ آپ اسرائیل کیوں آئے ہیں؟ ہمارے چہرے چونکہ یورپی یا امریکی نہیں تھے ، لہذا ہمارے نادرین پاسپورٹ اس کی تسلی کے لیے کافی نہ تھے۔ میں نے بتایا، ہم لوگ اسرائیل سیاحت کے

جہاز کی لینڈنگ کا اعلان ہو رہا تھا۔ عجمانی اور پھر انگریزی میں پاکستان بتا رہا تھا کہ ہم اسرائیلی حدود میں داخل ہو گئے ہیں اور اگلے چند لمحات میں ڈیوڈ بن گوریان ہوائی اڈے پر اتر جائیں گے۔ اسرائیلی فضا، اسرائیلی سرزمین دونوں میں چند ساتوں میں ہمارے وجود اور پھر قدموں کو چھونے والی ہے۔ ہلکے سے ہچکولے سے جہاز نے رن وے کو چھوا اور پھر اس پر دوڑنے لگے۔ سرزمین ابراہیم ، بنیوں کی جنم بھومی ، یہودیت کی مولد جو بھی کنعان کہلاتی تھی ، ہمارے سامنے اپنے دامن کو وسیع کیے جارہی تھی۔ جہاز رن وے کے اینڈ پر جا کر بالکل پر سکون ہو گیا۔ ہم نازک اندام کی سبک قدمی سے ہوائی اڈے سے منسلک سربک سے ہیوٹ ہو گیا۔ انجن بند ہوئے۔ مسافروں نے بینڈ بیگ سنبھالے ، دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ حضرت علامہ اقبال نے میرے کان میں سرگوشی فرمائی:

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

(ہر ملک اللہ کی ملکیت ہے اس لحاظ سے وہ ہماری ملکیت ہے)

یہ الفاظ میرے پریشان اور متذبذب دل و دماغ سے ہوا کے جھونکے کے مانند گرائے اور میں ذہنی اور جسمانی طور پر ہر قسم کے خوف و ہراس ، ناامیدی اور غیر یقینی کی کیفیت سے یکبارگی آزاد ہو گیا۔ میں نے یقین و اعتماد سے پھر پولہا سانس لیا اور پورے ثبات دل کے ساتھ جہاز سے نکل کر ہوائی اڈے کی حدود میں داخل ہو گیا۔

صل ابیب کے مابہ ناز تعمیر فن کے شاہکار ہوائی اڈے کا نام ، اسرائیل کے بانی اور پہلے وزیر اعظم

لاؤڈ (Extee Lauder) میں کام کرتی ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں چائلڈ لیبر پر پابندی ہے۔ بچے جب تک ۱۶ سال کا نہیں ہو جاتا ، اس سے کام نہیں لیا جاسکتا اور اگر فرض کریں وہ کوئی کام کرتا بھی ہے تو اس کو کم از کم ۶۰۰ ڈالر تنخواہ ملتی ہے اور بچے زیادہ ہماری کام نہیں کر سکتا ، صرف اخبار وغیرہ بیچ سکتا ہے۔

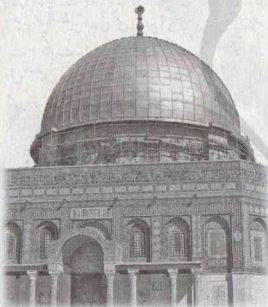
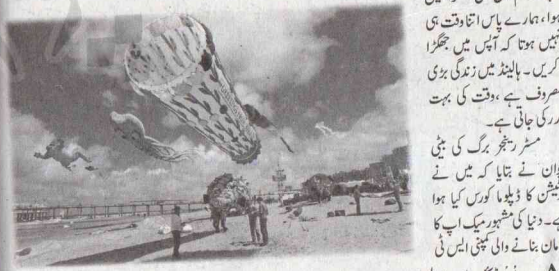
ایوان نے بتایا کہ وہ فارغ وقت میں یاغباتی کرتی ہیں ، سائیکل لے کر ساحل سمندر پر چلی جاتی اور خوب لطف اٹھاتی ہیں۔ ہم لاہور میں خوب ٹھوسے پھرے۔ مجھے رکشے کا ماڈل بہت پسند آیا ، جو میں نے ساڑھے سات سو روپے میں خریدا۔ اس کے علاوہ میں نے زیادہ تر بینڈی کرافٹس اور کلوئی پر کندہ کاری کی ہوئی اشیا خریدی ہیں۔ اسی طرح میرے والد چھپلے سال ٹرک کے ماڈلز بھی خرید کر لے گئے تھے۔ ایوان نے بتایا کہ ہمارے پاکستانی دوست عمر سبیل چھپلے سال میرے بھائی پال کے لیے یہاں سے ڈھونڈی اور دفلی لے کر ہالینڈ گئے تھے۔ میرے بھائی بہت خوش ہوئے اور وہ اکثر ڈھونڈی اور دفلی بجا کر اپنے دوستوں کو خوش کرتے ہیں۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں چنگ بازی چھوٹوں پر نہیں ہوتی اور نہ ہی بیچ لڑائے جاتے ہیں بلکہ ہم ساحل سمندر پر جا کر چنگ اڑاتے ہیں۔ (عطیہ اللہ)

مستر رنجر برگ نے بتایا کہ ضروری نہیں کہ ہر بیوی کام کرے۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ کام میں تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی ہوں لیکن بنیادی طور پر میں خاتون خانہ ہوں۔ کپڑے ، دھونا ، استری کرنا ، گھر کی صفائی اور کھانا پکانا سب خود کرتی ہوں۔ گھر کی آرائش اور کام میں مجھے سکون آمیز لطف محسوس ہوتا ہے۔ فارغ وقت میں سماجی خدمت کرتی ہوں۔ میں انیسٹروم کی فلاحی تنظیم ”سن فلاور“ کی رکن ہوں اور بنیادوں کی تعمیر داری اور تفریحوں کا انتظام کرتی ہوں۔ ایک اینڈ پر تہائی کے شکار بنار لوگوں کو بگڑی جہاز کی سیر کرانے لے جاتی ہوں۔ پچھلے دنوں تین سومر بیٹوں کو لے کر میں سمندری سیر کے لیے گئی ، جہاں بنیادوں نے ایک ہفتہ تفریح میں گزارا اس طرح وہ بنیادی کچھول گئے اور صحت کے قریب تر ہو گئے۔

مستر رنجر برگ نے بتایا کہ ان کے شوہر اپنے پیشہ وارانہ کاموں اور پر نہانی کے مشغلہ کی وجہ سے بہت مصروف رہتے ہیں لہذا ان کی ضروریات زندگی یہاں تک کم کپڑے وغیرہ کی خریداری بھی میں خود کرتی ہوں۔ اگر وہ فارغ ہوں تو میرے ساتھ وہ بھی جاتے ہیں مگر ایسا کم ہوتا ہے۔ میری پسندیدہ ڈش بند گوشتی کے ساتھ آلو گوشت ہے جو میں بہت جلد یاد بناتی ہوں۔

کہا کہ ہم بھی جھگڑا نہیں ہوا ، ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ آپس میں جھگڑا کریں۔ بالینڈ میں زندگی بڑی مصروف ہے ، وقت کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

مستر رنجر برگ کی بیٹی ایوان نے بتایا کہ میں نے بیٹیشن کا ڈیڈا کورس کیا ہوا ہے۔ دنیا کی مشہور میک اپ کا سامان بنانے والی مینی ایس ٹی



تیونس کا شہر قیروان

انگلیسوں کے دور حکومت میں قیروان اپنے سنہرے دور کی انتہائی بلندیوں تک جا پہنچا۔ دولت والا غالبہ کا بانی ابراہیم بن الاغلب تھا۔ یہ شمال مغرب مند کارٹرگ اور اسلامی فن اور تجارت کے ماہرین قیروان میں جمع ہو گئے اور پھر ان لوگوں نے بغداد کی سی مرکزی طاقت کا مقام حاصل کر لیا۔ قیروان میں ہر قسم کے ترقیاتی کام ہونے لگے اور دنیا کے چندہ پیسہ لوگ یہاں آ گئے۔ پھر کیا تھا، جلد ہی قیروان بحیرہ روم کے دوسرے ترقی یافتہ شہروں سے بھی آگے نکل گیا۔ انگلیسوں کے دور میں یہاں کی جامع مسجد میں کافی تہہ بیلیاں کی گئیں اور توسیع کا کام بھی ہر بادشاہ، شہزادے، وزیر اور اعلیٰ عہدیداروں نے مستحق اس جامع مسجد کی تزئین و آرائش میں دیجی لی۔ اس حسین جامع مسجد کے عہد خال بدلے رہے، اس کے حسن میں اضافہ نہ رہا اور اس کی حدود بھی بڑھتی رہیں۔ کہیں ۱۹۵۰ء میں جاگر اس کی تعمیر کے بڑے بڑے منصوبے مکمل ہوئے۔

قیروان کے قدیم شہر کا حسن، اس کی خوبصورتی، کشش اور جاذبیت اگر دیکھتی ہو تو پال کلی کی بنائی ہوئی تصویروں میں دیکھیے۔ ان تصاویر میں جامع مسجد مرکزی نقطہ ہے۔ یہ وسیع و عریض عبادت گاہ کسی قلعہ کی طرح مضبوط اور اپنے طرز تعمیر کی وجہ سے بے حد متاثر کن ہے۔



ہم جب دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اس کے محرابوں کی پرکشش قطاریں اور دور تک پھیلے ہوئے سنگ مرمر کے فرش نے آنکھوں کو فرحت بخشی۔ اس کے ستواں اور یکساں ستون اور ان کے اوپری حصوں کی ان کے ساتھ ہم آہنگی قابل دیدہ ہے۔ اس کا خوبصورت ڈیزائن، عبادت کرنے کا اندرونی کراہ، عربی طرز تعمیر کی چھتیں، ان پر عربی خطاطی، پھولوں اور تیل پلوں کے نقش اور مسجد کا منبر جس کی محراب پر سونے کی تخت کاری کی گئی ہے اور پھر مجسم مجسم کرتے پلورین جھلڑا فانوس گویا کھکشاں کی بجھتی ہوئی ہے۔ یہ سب چیزیں مسجد سیدی عقیبہ کو مسلم دنیا کی سب سے خوبصورت اور حسین عمارت بناتی ہیں۔

قیروان میں مذہبی تہوار اور تقریبات بہت ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں بے شمار زیارت گاہیں ہیں، یہاں پر بڑی خوبصورت اور عمدہ طرز تعمیر کی خانقاہیں ہیں۔ صوفیائے مقبرے ہیں، بزرگان دین کی درگاہیں ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی بہت سی مسجدیں ہیں، یہاں کی خوبصورت درگاہوں میں سیدی صاحبی کا روضہ بھی ہے۔ اس کے بلند بالا خوبصورت منار، کشادہ اور پرکشش صحن، اس کے قاتیل اور آرائش کی دوسری چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ان بزرگ کے پاس رسول اکرمؐ کی ریش مبارک کے ۳۳ بٹے تھے اور ایسی ہی بے نام بڑا۔ یہ نام ایک اور صوفی بزرگ حضرت غوثؒ کا بھی تھا کیونکہ ان کو کبھی یہ اعزاز حاصل تھا کہ ان کے پاس بھی رسول اللہ ﷺ کے مٹے مبارک تھے۔ سیدی عامر آبادہ کی درگاہ ایک لوہار نے تعمیر کی تھی جو دھاتی چیزیں بناتا تھا۔ اس نے وہ لنگر بنائے تھے جنھوں نے قیروان کو زمین کے ساتھ باندھ دیا، بڑی بڑی کھواریں اور دیوہیکل بندوبست

اس نے بنائی تھیں۔
”مسجد الملائحہ بیان“ یعنی تین دروازوں والی مسجد قیروان کی قدیم ترین عمارت ہے۔ اس مسجد کو ۸۶۶ء فرطیہ کے ایک نیک انسان نے بنوایا تھا۔ اس کا بننے کا حصہ بہت خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کے سامنے سلیقے اور قرینے سے خطاطی اور کندہ کاری کی گئی ہے۔ سیدی عبید الغریانی کی خانقاہ بھی بڑی زبردست جگہ ہے۔ یہ بزرگ تیرہویں صدی میں گز رہے ہیں، اس کی صورت منقش چھتیں، مٹے کا تاروں سے کیا گیا عربی ام اس کا صحن، محرابیں اور اس کے بازنطینی انداز کے ان سب بہت دلکش ہیں۔

قیروان اپنی زبردست ہنرمندی اور بے نظیر فنکاری کے لیے مشہور ہے۔ اس کے روایتی فن آئن بھی زندہ رہا۔ دھات پر کندہ کاری، کپڑے کی بنائی اور گھوڑوں کی کلاں کی تیاری، یہ وہ کام ہیں جن سے قیروان کے استغفا (پلچست دار بازاروں) کی رونق اور تازگی قائم رہا۔ مگر ان کے علاوہ قیروان جس دست کاری کے لیے نامور ہے اس کے ساتھ ہی بہت زیادہ مشہور ہے، وہ ہے ان کی بنائی کافن۔ قیروان کے ہر گھر کے صحن میں، اس کے بال میں، خواتین اور نوجوان لڑکیاں، چھوٹی بچیاں، اس کے چادریں فن کو دلچسپی نظر آتی ہیں۔ وہ قاتیل بنائی کلاں مہارت، دیکھی اور چابک دقت سے کرتی ہیں۔ ایک لاری ادارہ قاتیلوں کی کوئی کنٹرول کرنے کے لیے قائم



ہے۔ اس ادارے کے ماہرین قاتیل کا معیار دیتے ہیں۔ جب وہ مطمئن ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد سرکاری مہر لگا کر قاتیل کی درستی کا گواہ صداقت نامہ جاری کر دیتے ہیں۔ یہاں کی ایک اور قدیم دار چکر دار، جنگ اور چھوٹی بڑی گلیاں ہیں جہاں روایتی عربی مکان کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر آپ اندر ہونے والی بات چیت سن سکتے ہیں۔ الحلقا تین کے مقام پر آپ ترکی کافی پیئیں گے تو مزہ آجائے گا۔ اس کافی میں عربی گلاب اور انگترے کے پھولوں کا رس بھی ملایا جاتا ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھتے رہیں۔ بڑے بڑے مقام پر آپ کو بہت سے اونٹ نظر آئیں گے جن کی آنکھوں پر چھڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ یہ اونٹ نکولیں کے چاروں طرف اسی طرح پھر لگا رہے ہوتے ہیں اور حرکت پر نکولیں کا تازہ پانی پیا کرتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح ہمارے ملک میں رہت ہوا کرتے تھے۔ قیروان کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پانی کا یہ سوتا وہی ہے جو عرب کی مقدس سرزمین میں حضرت اسماعیلؑ کے بیروں تلے جاری ہوا تھا۔

برائے شہر چاروں طرف سے ایک فصیل سے گھرا ہوا ہے جو گھوڑوں اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ اس میں آنے جانے کے دروازے بھی ہیں۔ یہ فصیل ۱۰۵۲ء میں فاطمی خلیفہ المعز نے تعمیر کرائی تھی۔ بعد میں اٹھارہویں صدی میں سنیوں نے ان فصیلوں کی مرمت کرائی اور ان کو محکم بھی کیا۔ آج کے جدید عہد میں صدیوں کی تاریخ کا یہ ایک عکس ہے۔ اگر ہم پرانے شہر سے باپ تونس کا یہ ذریعہ سے باہر آئیں تو ہمیں اعلیٰ حوض نظر آئیں گے۔ ان میں سے ایک ۶۸۸ پھلو والا (کثیر الاضلاع) حوض ۱۲۸ میٹر کے قطر کا ہے۔ اسے نویں صدی میں امیر ابو ابراہیم نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے پاس ہی دوسرا حوض بھی ہے جو ۳۸ میٹر قطر کا ہے۔ فصیل کے باہر جدید شہر ہے جس سے قدیم شہر چپکا ہوا ہے۔ جدید شہر میں بھی قدیم طرز تعمیر کی عمارتیں ہیں۔ آج بھی یہاں کے ثقافتی اور تجارتی مراکز قدیم طرز تعمیر کے ہیں۔ (مکرم محمد)

گرد و پیش کے مسائل سے تعلق نہیں رہیں گے اور نہ ہی راہِ فرار اختیار کریں گے بلکہ ان کو حل کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کریں گے۔

بچے تحقیقی ذہن لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ لیکن جب ان ذہنوں کو وسعت دینے والی سرگرمیوں سے دور کر دیا جائے تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہوتے لگی ہیں۔ اسی طرح اگر انہیں بڑے مقاصد سے بھی محروم کر دیا جائے تو وہ صرف اپنی ذات کے فائدے کے بارے میں سوچنے تک محدود ہو جاتے ہیں۔

خلا میں انسانی ہستی کے ڈیزائن کے مقابلوں کی بنیاد انیٹا گیل (Anita Gale) نامی خاتون نے ۱۹۸۳ء میں رکھی۔ وہ ہوائی جہاز بنانے والی بڑی کمپنی بوئنگ سے سینئر پراجیکٹ انجینئر کی حیثیت سے وابستہ رہی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر رضا کارانہ طور پر ان مقابلوں کا آغاز کیا۔ ان مقابلوں کا مقصد سکولوں کے طالب علموں کو مستقبل کی خلائی ہستیتوں کے ڈیزائن کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کرنا تھا۔ ہر سال ۶۶ ہزار طلبوں سے ایک ہزار سے زائد بچے اس مقابلے میں حصہ لیتے ہیں۔ بوئنگ کمپنی اور ناسا ان مقابلوں کے انعقاد کے لیے

معاذت فرما کر رہے ہیں۔

بھارت میں متفرد اس مقابلے میں بچوں کو تحقیق کے بعد ایک پریزنٹیشن تیار کرنا تھی۔ اس میں خلائی ہستی کے لیے خوراک اور رہائش کی سہولتوں کی فراہم کرنے کے لیے کھش قفل، سورج کی روشنی اور ہوا کی رفتار کے حوالے سے معلومات فراہم کرنا تھیں۔ بچوں کو اس منصوبے لاگت کم رکھنے اور انسانی زندگی کے لیے آرام دہ بنانے کے لیے اقدامات تجویز کرنے تھے۔ بچوں کو خلا سائنسدانوں کے ساتھ تبادلہ خیال اور انٹرنیٹ سرچ سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۱ گھنٹوں میں اپنا کارآمد نکل کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

اس مقابلے سے طالب علموں کو ریاضی، طبیعیات، کیمیا، ماحولیاتی سائنس، حیاتیات، کمپیوٹر سائنس، آرٹ کے خوبصورت امتزاج پر مبنی منصوبے پر کاربند کرنے کا موقع میسر ہوا۔ انہوں نے اپنی تھینکی مہارت اور تحقیقات کی صلاحیتوں کو بھی ثابت کیا۔ اس نے انہوں نے یہ بھی سیکھا کہ مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ ٹیم ورک کے جذبے سے کیسے کیا جاتا ہے۔

اس طرح کے مقابلوں سے انہیں کائنات کی وسعت اور اس کے بے پناہ وسائل کے متعلق بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے امکانات کی ایک نئی دنیا ان کے کھش قفل، سورج کی روشنی اور ہوا کی رفتار کے حوالے سے معلومات فراہم کرنا تھیں۔ بچوں کو اس منصوبے لاگت کم رکھنے اور انسانی زندگی کے لیے آرام دہ بنانے کے لیے اقدامات تجویز کرنے تھے۔ بچوں کو خلا سائنسدانوں کے ساتھ تبادلہ خیال اور انٹرنیٹ سرچ سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۱ گھنٹوں میں اپنا کارآمد نکل کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

نامور سائنسدان آئن سٹائن کا کہنا تھا ”تخیل علم لاگت کم رکھنے اور انسانی زندگی کے لیے آرام دہ بنانے کے لیے اقدامات تجویز کرنے کے لیے ضروری ہے۔“ بچے اس طرح کے مقابلوں میں حصہ لے کر ایک خلا باز کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ بچے یہ بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ

ہاں تو انسانی ضروریات کیسے پوری کی جاسکیں گی۔ ہوا کیسے ری سائیکل کیا جائے گا کہ اس میں سانس لیا جائے، زمین کے ساتھ رابطے کے لیے اقل حمل کے کن ذرائع سے مدد لی جائے گی، وہاں پر دفاتر اور تفریح کی سہولیات کیسی ہوں گی، اسی طرح سانی نظاموں کی کن خوبصورتیوں سے مدد لی جائے گی تاکہ ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے۔ ان مقابلوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ذہین بچے زمین پر بہتر معیار زندگی اور ماحول کے بارے میں بھی سوچنے کی طرف راغب ہوں۔

سائنس فکشن میں عالمی شہرت رکھنے والے مصنف آرثر سی کلارک نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ زبردست تبدیلیاں پیدا کرنے والے بڑے تصور کو رد عمل کے ۳ مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا رد عمل یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام ناممکن ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ کام ممکن ہے لیکن اسے کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور تیسرا یہ کہ جاتا ہے کہ میں تو پہلے دن سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ شاندار تصور ہے۔ خلا میں انسانی رہائش بنانے کی بات ایک ایسا ہی انتہائی تصور ہے۔ اس وقت ایک خلا باز کو خلا میں بھیجے کے لیے کئی ملین ڈالر درکار ہوتے ہیں۔

ایک وقت تھا چپ انسان کے ہوا میں اڑنے کی بات دیا گیا بھی جانی تھی۔ اب ہوائی سفر ایک معمول کی بات بن چکا ہے۔ انسانی اڑان اور خلا کی تیسری تاریخ ۲۰ ہزار سال سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ یہ سفر ۲۰۰۰ قبل مسیح میں چین سے چنگ بازو کے سلسلے سے شروع ہوا۔

۱۵ویں صدی کے مشہور مصور لیونارڈو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ڈرائنگ میں انسانوں کے ہوا میں اڑنے کے خواب کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں رائیٹ نام رکھنے والے بھائیوں نے پہلا کامیاب ہوائی جہاز بنا دیا۔ آج ہزاروں لاکھوں افراد روزانہ ہوائی سفر کرتے ہیں۔

خلا کی تیسری تاریخ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کی حمایت کرنے والے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ۲۰۵۰ء تک انسانی آبادی ۹ بلین سے زائد ہو جائے گی۔ اگر ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا خیال نہ رکھا گیا تو اس سے

گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا رد عمل یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام ناممکن ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ کام ممکن ہے لیکن اسے کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور تیسرا یہ کہ جاتا ہے کہ میں تو پہلے دن سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ شاندار تصور ہے۔ خلا میں انسانی رہائش بنانے کی بات ایک ایسا ہی انتہائی تصور ہے۔ اس وقت ایک خلا باز کو خلا میں بھیجے کے لیے کئی ملین ڈالر درکار ہوتے ہیں۔

ایک وقت تھا چپ انسان کے ہوا میں اڑنے کی بات دیا گیا بھی جانی تھی۔ اب ہوائی سفر ایک معمول کی بات بن چکا ہے۔ انسانی اڑان اور خلا کی تیسری تاریخ ۲۰ ہزار سال سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ یہ سفر ۲۰۰۰ قبل مسیح میں چین سے چنگ بازو کے سلسلے سے شروع ہوا۔

۱۵ویں صدی کے مشہور مصور لیونارڈو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ڈرائنگ میں انسانوں کے ہوا میں اڑنے کے خواب کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں رائیٹ نام رکھنے والے بھائیوں نے پہلا کامیاب ہوائی جہاز بنا دیا۔ آج ہزاروں لاکھوں افراد روزانہ ہوائی سفر کرتے ہیں۔

خلا کی تیسری تاریخ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کی حمایت کرنے والے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ۲۰۵۰ء تک انسانی آبادی ۹ بلین سے زائد ہو جائے گی۔ اگر ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا خیال نہ رکھا گیا تو اس سے

۱۵ویں صدی کے مشہور مصور لیونارڈو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ڈرائنگ میں انسانوں کے ہوا میں اڑنے کے خواب کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں رائیٹ نام رکھنے والے بھائیوں نے پہلا کامیاب ہوائی جہاز بنا دیا۔ آج ہزاروں لاکھوں افراد روزانہ ہوائی سفر کرتے ہیں۔

۱۵ویں صدی کے مشہور مصور لیونارڈو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ڈرائنگ میں انسانوں کے ہوا میں اڑنے کے خواب کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں رائیٹ نام رکھنے والے بھائیوں نے پہلا کامیاب ہوائی جہاز بنا دیا۔ آج ہزاروں لاکھوں افراد روزانہ ہوائی سفر کرتے ہیں۔





زمین سے خلا میں بھیجے جا چکے ہیں، جن میں سے چند سو اسی وقت فعال ہیں۔ ان میں سے بعض سیٹلائٹس کے ذریعے خلا میں موجود سیاروں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے بارے میں علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعض سیٹلائٹس ٹیلی ویژن کی ضروریات پوری کرتے اور بعض موسم اور آب و ہوا پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ زلزلوں اور قدرتی آفات کی پیش گوئی اطلاع بھی دے سکتے ہیں اور کچھ دشمن کے سیٹلائٹس کو نقصان پہنچانے کی جیسے فوجی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔

انٹرنیشنل سٹیشن زمین کے گرد گھومتے والا مصنوعی سیٹلائٹ ہے جسے ۱۹۹۸ء میں خلا میں بھیجا گیا۔ اس سال سے مختلف ممالک کے تعلق رکھنے والے خلا دار اسے آباد رکھے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سٹیشن ایک لیبارٹری ہے اور اسے خلا میں قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو چاند یا مریخ تک بھیجنے کے لیے اسے سٹیشن (Base) کے طور پر استعمال کیا جائے اور نقل و حمل اور مشینوں کی دیکھ بھال میں معاونت فراہم کرے۔ مستقبل میں اسے کمرشل، سفارتی اور تعلیمی مقاصد کے لیے بھی استعمال کرنے پر غور کیا جا رہا ہے۔ یہ سٹیشن ۲۰۲۰ء تک قابل استعمال رہے گا۔ اس اسٹیشن کے بارے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے زمین سے انسانی آنکھ کے ذریعے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ناسا کا خیال ہے کہ انسان ۲۰۲۳ء تک چاند پر ایک مستقل ٹھکانہ (Base) بنا لے گا۔ خلا میں انسانی بستی بنانے کا خواب دیکھنے والا اپنا ہی ایک طالب علم بھارت کا رامیش ہے۔ رامیش کا تعلق غریب خاندان سے تھا اور اس کا باپ آٹو رکشا چلاتا تھا۔ لیکن رامیش کا کہنا تھا کہ وہ اپنے خواب صرف اس لیے ختم نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس دولت نہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ اگر وہ پہلا قدم اٹھالے گا تو تمام مشکل راستے خود بخود آسان ہو جائیں گے۔ انٹرمیڈیٹ کے اس طالب

انسانوں کے مسائل میں اضافہ ہو جائے گا۔ زمین میں تیل، گیس اور کوئلے کے ذخائر تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ ان ماہرین کے نزدیک پانی اور پانی کی بڑھتی ہوئی قلت اور ماحول کو بچھنے والے نقصان کے باعث خلا میں نئے وسائل اور آباد کاری جیسے امکانات پر تحقیق جاری رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

معروف سائنسدان سٹیفن ہاکنگ کے مطابق ایک ہزار سال کے بعد زمین پر انسانی وجود کا ہونا نامکن ہے لیکن وہ پُر امید ہیں کہ مستقبل میں انسان سیاروں پر اپنا ٹھکانہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

خلائی تعمیر کے دنوں پر تنقید بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ جیسا کہ نوبل انعام یافتہ سائنسدان رچرڈ فینمین (Feynman) کا کہنا ہے کہ انسانوں کو خلا میں بھیجنے میں ابھی تک کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں ملتی۔

۱۹۵۷ء میں سپونیک-1 کے نام سے زمین کے مدار میں پہلا مصنوعی سیٹلائٹ بھیجا گیا۔ زمین سے باہر خلا میں جانے والا پہلا انسان یوری گیگارین (Yuri Gagarin) تھا۔ یہ خلا باز ۱۹۶۱ء میں خلا میں گیا۔ ۱۹۶۹ء میں انسان چاند پر پہلا قدم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ ۲۰۰۳ء میں پہلا فنی جہاز انسان کو خلا میں لے گیا۔

اب تک ہزاروں مصنوعی سیارے (سیٹلائٹس)

گزار دیتا۔ کھیل کود اور دوستوں کو زیادہ وقت دینے کے بجائے اسے اپنے کام میں مگن رہنا زیادہ پسند تھا۔ اس کے مستقبل کے ارادے بھی بڑے واضح تھے۔ وہ پورکائن میں بی ٹیک کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد یونیورسٹی آف ایریزونا (Arizona) سے ایم ایس کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے ناسا میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اس نے پی ایچ ڈی کرنے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے نئی دنیا بسانے کا خواب دیکھیں اور آنے والے دنوں میں حقیقی خلائی بستی کی تعمیر کرنے والوں میں بھی شامل ہوں تو ہمیں ان میں بڑی سوچ پیدا کرنا ہوگی۔ انہیں یہ بھی سکھانا ہوگا کہ اگر ارادے مضبوط ہوں تو غربت یا دوسرے مسائل حوصلے پر ت نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے بچوں کو اعلیٰ مقاصد بھی دینے ہوں گے تاکہ وہ ذاتی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کو پُر امن اور خوشحال بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔

جب آپ کسی بڑے مقصد، کسی غیر معمولی منصوبے پر کام کے لیے تیار ہوتے ہیں تو آپ کا ذہن یا پاندیوں سے آزاد ہو جاتا اور نئے نئے خیالات پیدا کرنے لگتا ہے۔ آپ کی پوشیدہ صلاحیتیں ظاہر ہونے لگیں اور آپ خود کو



ایک بہتر شخص کے روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔
۲۰۱۰ء میں پاکستانی طالبات نے اس
مقابلے کا فائنل مرحلہ جیت لیا تھا۔ فائنل
امریکا میں ہوا۔ سمین بختاور جیتنے والی پاکستانی
ٹیم کا حصہ تھیں۔ سمین نے اس خلائی ہستی کے
منصوبے میں آرکی ٹیچر کے حوالے سے کام
کیا۔ اس مقابلے میں سمین کو امریکی آسٹریلوی
اور برطانوی طالب علموں کے ساتھ کام کرنے
کا موقع ملا۔

فائنل مرحلہ جیتنے سے پہلے پاکستانی
طالبات نے بھارتی طالب علموں کے ساتھ مل

سی فائنل مقابلہ بھارت میں جیتا تھا۔ فائنل میں کامیابی
کے حوالے سے سمین نے بتایا کہ ہم نے اپنے ڈیزائن میں
زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیا تھا اور پاکستان سے تعلق
ہونے کا ہمیں یہ فائدہ ملا کہ ہم خلائی ہستی کا ڈیزائن بناتے
وقت بالکل بنیادی ضروریات یعنی بجلی، پانی کی کمی پر بھی
نظر رکھتے تھے جبکہ خوشحال ملکوں کے لوگ اس زاویے سے
چیزوں کو نہیں دیکھ پاتے۔

سمین فائنل کے لیے اپنے بھارت میں قیام کے
حوالے سے سمین بتا رہی تھیں کہ ہمیں بھارت میں رہنے
کے لیے اچھا انتظام نہیں ملا۔ بھارت میں داخل ہوتے ہی
ہمیں غربت اور گندگی کے مناظر دیکھنے کو ملے لیکن
امریکی طالب علموں کی نسبت ہمیں بھارتی طالب علموں
کے ساتھ کام کرنے میں زیادہ لطف آیا۔ انہوں نے ہمارا
زیادہ خیال رکھا۔ ہمیں ایک آشرم میں ٹھہرایا گیا، جہاں
بعض بچے گھر سے کھانا لے آتے تھے۔

سمین نے کہا کہ فائنل مرحلہ جیتنے کی خوشی
ناقابل بیان تھی۔ جب جیت کا اعلان ہوا پاکستان میں
رات کے ۳ بجے تھے لیکن والدہ جاگ رہی تھیں۔ میں
نے اسی وقت فون پر انہیں اطلاع دی۔

سمین کے لیے یہ خوشگوار تجربہ تھا۔ اس کامیابی سے
انہیں پاکستان کا سافٹ ایچ دنیا کے سامنے لانے کا موقع

سمین بختاور

ملا۔ سمین نے بتایا کہ امریکی طالب علموں کو ہماری
کارکردگی پر حیرانی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ شاید ہمیں
کیلکولیڈ بھی چلانا نہیں آتا ہوگا لیکن لیپ ٹاپ پر کام
کرتے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ ہمیں تعصب کا بھی سامنا
کرنا پڑا۔ وہ پُر عزم ہیں کہ پاکستان بچوں میں پوینشل
موجود ہے اور وہ سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں نمایاں
کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اس سال سیسی فائنل جیتنے
والوں کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے ان
کا کہنا تھا کہ پاکستان کے یہ باصلاحیت بچے ہمارے لیے
نئے انیسسڈ رشتہ بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر والدین کی بیٹی سمین اب بی ڈی ایس میں
سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہیں۔ سمین کا کہنا تھا کہ حکومت کو اس
طرح کے مقابلوں میں شرکت کے لیے طالب علموں کی
مناسب حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کیونکہ اپنے ٹیلنٹ کو
سامنے لا کر ہی ہم ترقی کر سکتے ہیں۔

اس طرح کا ایونٹ طالب علموں کے لیے صرف
سائنسی مقابلہ نہیں ہوتا بلکہ مقابلے میں حصہ لے کر انہیں
سائنس کو انسانوں کے لیے خوشگوار بنانے اور دوسروں
کے ساتھ مل کر کام کرنے سمیت بہت سی دیگر باتیں
جاننے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔



یہ

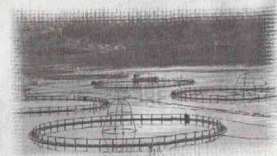
۱۹۰۰ء کی بات ہے، ایک امریکی سول انجینئر، جان الفریڈ وٹکلو نے ایسی ۱۰۰ بیٹھین گونیاں تیار کیں جو ۲۰۰۰۰ تک پوری ہو سکتی تھیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض ”عجیب و غریب“ اور ”تقریباً ناممکن“ پیشین گوئیوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ وٹکلو کی کامیابی سے متاثر ہو کر مشہور امریکی اخبار، نیو یارک ٹائمز نے اپنے قارئین کو دعوت دی کہ وہ بھی اگلے ۱۰۰ برس کی ایسی پیشین گوئیاں کریں، یعنی جو ۱۱۲ء تک پوری ہو جائیں۔

اس سکیم یا منصوبے میں قارئین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سینکڑوں پیشین گوئیاں کیں۔ بعد ازاں ماہرین نے ان میں سے ایسی ۱۰۰ بہترین پیشین گوئیوں کا انتخاب کیا جو اگلے برسوں میں واقعاً حقیقت کا روپ دھار سکتی تھیں۔ اب یہ نذر قارئین ہیں۔ یہ اس پراسرار مستقبل کی جانی انجانی جھلکیاں سامنے لاتی ہیں جو ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے پوشیدہ ہے۔

سمندروں میں بنتے ف نارم

اگلے ۱۰۰ برس میں دنیا کی آبادی تقریباً ۱۰ ارب تک پہنچ جائے گی۔ ظاہر ہے، ان کو خوراک مہیا کرنا بڑا مسئلہ ہوگا۔ چنانچہ سمندروں میں جگہ جگہ چھپلیوں کے فارم بن جائیں گے۔ ان میں پھر کروڑوں چھپلیاں پیلیں گی تاکہ وہ دعوت طعمہ میں کام آسکیں۔ مزید برآں سمندروں ہی میں اگلی کے فارم بنانے کے منصوبے بھی زیرِ عمل ہیں۔



یہ لاکھوں تن اگلی نسل بنانے میں کام آئے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موشیوں کا چارا اگاتے کے لیے سمندری فارم بن جائیں۔

۱۰
۱۰

امکان

کمپیوٹر اور دماغ کا ملاپ

امریکا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں ایسے کمپیوٹر بنے لگے ہیں جو سر پر پہنے جاتے ہیں۔ ان کمپیوٹروں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ براہِ راست انسانی دماغ سے منسلک ہوتے ہیں۔ تو ابھی آغاز ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ ۲۰۵۰ء تک



ایسے کمپیوٹر ایجاد ہو جائیں گے جو ہمارے اذہان کی طاقت اور صلاحیت دہی بنتی بڑھادیں گے۔ ۲۰۵۰ء تک ترقی یافتہ ممالک میں تقریباً سبھی لوگ اپنی دماغی استعداد کا بڑھانے کی خاطر کوئی نہ کوئی شین استعمال کریں گے اور رواں صدی کے آخر تک پوری دنیا میں ایسی پیشیں متعل ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے، جب ایک انسان نے ایسی پیشیں سے استفادہ کیا، تو دوسروں کو بھی تقلید کرنی پڑے گی۔

۱۰
۱۰

امکان

سوچ کی لہروں

کے ذریعے رابطہ

ماہرین طبعیات کا کہنا ہے کہ مستقبل میں ایسی پیشیں ایجاد ہو جائیں گی جو ہمارے دماغ سے نکلنے والے خیالات جمع کر کے دوسروں تک پہنچا دیں گے۔ یہ ہوگی مستقبل کی خیالی نشریاتی (Transmission) مشین! ماہرین کہتے ہیں، ابھی ہم



اپنے خیالات و جذبات کو کمپیوٹر میں جمع کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب انہیں لہروں کے ذریعے ایک سے دوسرے دماغ تک پہنچانا ممکن ہوگا۔

۱۰
۱۰

امکان

امریکا کی ٹوٹ پھوٹ

امریکی ریاست کلی فورنیا میں ہزار ہا لوگ چاہتے ہیں کہ وہ وفاق امریکا سے الگ ہو جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ امریکا میں سب سے زیادہ امرا اسی ریاست میں بستے ہیں۔ چنانچہ وہی سب سے زیادہ ٹیکس دیتے ہیں۔ لہذا کلی فورنیا میں یہ احساس رفتہ رفتہ ابھر رہا ہے کہ وہاں ٹیکس دینے والے ہی امریکیوں کی اکثریت کو پال رہے ہیں۔ چنانچہ ماہرین کا کہنا ہے کہ مستقبل میں کلی فورنیا امریکا سے الگ ہونے کی تحریک چلا سکتے ہیں۔

۸
۱۰

امکان

انسٹارکٹکا (قطب جنوبی) میں کاروبار

عالمی گرماء (گلوبل وارمنگ) کے باعث انسٹارکٹکا میں صدیوں سے جمی برف پگھل رہی ہے۔ یوں نہ صرف دنیا کی چھت پر ایک نیا سمندری راستہ وجود میں آ رہا ہے، بلکہ انسٹارکٹکا میں تیل و گیس کے وسیع ذخائر بھی موجود ہیں۔ چنانچہ وہاں ”اپنی اپنی زمین“ حاصل کرنے کی خاطر عالمی قوتوں میں ہتھیچٹائی شروع ہو گئی ہے۔ لیکن ان قوتوں پر عالمی دباؤ بڑی ہے کہ تیل و گیس نکالنے کا عمل ایسی جدید ترین ٹیکنالوجی سے شروع کیا جائے جو انسٹارکٹکا کے قدرتی ماحول کو نقصان نہ پہنچائے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایسی ٹیکنالوجی اگلے ۵۰ سے ۱۰۰ برس میں منظرِ عام پر آجائے گی۔

۸
۱۰

امکان



در اصل ۲۰۱۳ء میں اسکاٹ لینڈ میں یہ جاننے کے لیے ریفرفرم ہوگا کہ علاقے میں پیٹیم ہاشندے خود بخبری و آزادی چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر اسکاٹشوں نے ملحدگی کا مطالبہ کیا، تو کبھی تاج برطانیہ کا ایک موقی الگ ہوا۔ یوں بہر حال برطانیہ کا رقبہ سکڑے گا اور آبادی بھی۔

$$\frac{8}{10}$$

امکان

دنیا بھر میں ایک کرنی

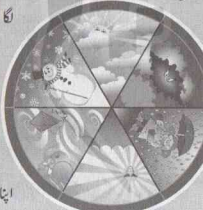
ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسے کرڈٹ کارڈ یا برقی کرنی وجود میں آچکی جو کئی ممالک میں چلتی اور قبول ہوتی ہے۔ یہ رجحان آنے والے برسوں میں مزید بڑھے گا۔ چنانچہ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے، وسط صدی تک صرف تین چار بڑی کرنسیاں رہ جائیں۔

$$\frac{8}{10}$$

امکان

موسم بھی متاثر ہوگا

دیکھنا لوجی کی ترقی کے باعث انسان لگا ہے۔ مثلاً وہ اس قابل ہو گیا اپنی مرضی سے بارش برسا دے گی کہ پتھیں گونی کر کا رخ کریں گے اور کتنی ہیں کہ اس کے ۱۰۰ برس میں کر لے گی کہ انسان سکے۔ گو یہ دیکھنا لوجی خاصی اپنایا جائے گا جب سخت



پچھلے پچیس تیس برس میں سائنس کی حد تک موسموں کو قابو کرنے کے مخصوص حالات میں سکے۔ سمندری طوفان کدھر شدت سے! ماہرین کہتے سائنس دیکھنا لوجی اتنی ترقی موسموں پر پوری طرح قابو پا چکی ہوئی اور اسے اسی وقت جانی و مالی نقصان کا خدشہ ہو۔

$$\frac{10}{10}$$

امکان

طویل عمر والے انسانوں کا جنم

سائنس دان یہ جان چکے کہ جب ہمارے بدن میں نئے خلیے بننا نہ ہو جائیں، تب بڑھاپا جنم لیتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسی دوا یا مکمل کی تلاش میں ہیں جو نئے خلیوں کو مکمل پیدا کرے تاکہ انسانی عمر میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگلے چالیس پچاس برس میں ایسے طبی عمل وجود میں آجائیں گے جن سے انسانی عمر ڈیڑھ دو برس تک بڑھانا ممکن ہوگا۔ ان حیرت انگیز اعمال کی خصوصیت یہ ہوگی کہ انسان یہ عرصہ بڑھاپا نہیں جوانی یا اوجیز عمر کی حالت میں گزارے گا۔ یہ ٹیکنالوجی شروع میں مہنگی ہوگی، لیکن رفتہ رفتہ اتنی سستی ہو جائے گی کہ عام لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

$$\frac{9}{10}$$

امکان

گداخت ری ایکٹر بن جائیں گے

خارج کرتے ہیں۔ یہ انتہائی درجہ حرارت ایٹم بم چھاڑنے ہی سے جنم لیتا ہے۔ مگر ماہرین اب تک ایسا ری ایکٹر نہیں بنا سکے جہاں قابو شدہ (کنٹرولڈ) حالت میں ایٹم بم چھاڑا جائے۔

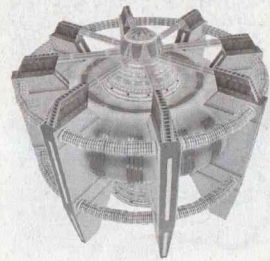
تاہم طبعیات دانوں کی پیش گوئی ہے کہ ۲۰۵۰ء تک درج بالا قسم کا گداخت (Fusion) ری ایکٹر بن جائے گا۔ شاید وہ تجرباتی نوعیت کا ہو، مگر ۲۱۰۰ء تک یہ دیکھنا لوجی نکھر جائے گی۔ چنانچہ تب ممکن ہوگا کہ صرف ایک گداخت ری ایکٹر سے پورے پاکستان کو بجلی مہیا کی جاسکے۔ یعنی ایک ایسا ری ایکٹر ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ میگا واٹ بجلی پیدا کرے گا۔

$$\frac{10}{10}$$

امکان

برطانیہ میں انقلاب

امریکا کی طرح انگریزوں کے دوسرے بڑے مرکز برطانیہ کو بھی ٹوٹ پھوٹ کے شدید خطرے کا سامنا ہے۔



یہ بیسویں صدی کا ایک عبرت آموز واقعہ ہے
ہماری سیاسی و بریادی کے تمام تر شاخسانے
ایسے ہی سانحہات سے ابھرتے ہیں
سانے آتے ہیں کاشی..... ان پر
غور و فکر اور تدبر ممکن ہوتا!

حِجَاز ریلوے لائن اور سلطنتِ عثمانیہ

تباہی کی وہ داستان جو عسریوں نے خود اپنے ہاتھوں انجمن مدی
اُس ریلوے لائن کا نوحہ جو حجاز کے عرب کے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ تھی

مسعود جمال



مزید قابل ذکر پیشین گوئیاں

”دنیا سے تمام
حکومتوں کا خاتمہ
ہو جائے گا اور
صرف ایک عالمی
حکومت کام کرے گی“

شادی
کی جگہ
سالانہ
معاہدہ
ہونے
لگے گا

”صحرا استوائی جنگل
بن جائیں گے“

”نینور و بوٹ ہمارے جسم میں داخل ہو کر
بیمار خلیوں کی مرمت کریں گے۔ ان کے لیے
ممکن ہوگا کہ ہماری یادداشتیں بھی ریکارڈ کر سکیں“

”ٹیلی ویژن یا اخبار سے
معلومات لینے کے بجائے
لوگ بذریعہ مشین اُسے
براہِ راست دماغ میں
ڈاؤن لوڈ کر لیں گے“

”اگلے ۱۰۰ برس
۲۰۰ برس میں صرف
سہزبانیں باقی رہیں گی:
انگریزی، ہسپانوی
اور چینی (مینڈرین)“

”سمندری پانی کے ذریعے ریت میں فصل اُگائی جائے گی“

”امریکا اور دیگر
یورپی ممالک
اپنی ساری جنگیں
ریموٹ کنٹرول
(روبوٹوں اور مشینوں)
کے ذریعے لڑیں گے“

”سزا صرف
اس لیے دی
جائے گی کہ انسان
خود کو بدل سکے“

دواں

دواں ریلوے لائن رک چکی تھی، جو جہاں تھا ظہر چھا تھا۔ اس کے مسافر، اس کا عملہ، اس کے گران جو سب محسوس یا وہ جو اپنی انتظامی ذمہ داریوں پر اپنے ایشیوں پر متعین تھے، سب کے سب جوں کے توں تباہ کر دیے گئے۔ جابجا بھری یہ تباہ شدہ باقیات اس غمگین حجاز ریلوے کی یاد لیے کھڑی ہیں جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۶ء تک دمشق سے مدینہ منورہ تک آتی تھی۔

سرزمین حرمین الشریفین حجاز ۱۵۱۸ء سے سلطنت عثمانیہ کے عمل داری میں شامل تھا۔ یہاں پر ان کا مقرر کردہ گورنر ”شریف مکہ“ کہلاتا تھا۔ آخری شریف مکہ حسین بن علی تھا جو عرب کے باغی خاندان سے تھا اور جسے ۱۹۰۹ء میں عثمانی سلطان عبدالحمید ثانی نے شریف مکہ نامزد کیا تھا۔

سلطان عبدالحمید ثانی کا بڑا کارنامہ دمشق سے مدینہ منورہ تک حجاز ریلوے کی تعمیر بھی جو شریف مکہ، بدو قیقل اور انصار کے کاروانی مالکوں کی عملی مخالفت اور طویل تر زمینی حدود خال اور موسمی مشکلات کے باوجود ۱۹۰۸ء میں مدینہ منورہ تک مکمل اور رواں دواں ہوئی۔ تاہم مکہ مکرمہ اور جدہ تک اس کی توسیع میں شریف مکہ اور اس کے حامی بدو قیقلوں کا ڈال رہے تھے تا آگے ۱۹۱۳ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور یہ منصوبہ موخر ہو گیا۔

۱۹۱۶ء میں شریف مکہ حسین بن علی نے برطانیہ کے ساتھ ٹھٹھہ جواز کر کے تحریک بیداری عرب کے نام پر عثمانی ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور انگریزوں کی عسکری اور مالی اعانت کے ساتھ لارنس آف عربیہ کی عملی سرکردگی میں بغاوت کو پروان چڑھا کر سلطنت عثمانیہ کے عمل داری کا خاتمہ کرتے ہوئے دمشق سے مدینہ منورہ تک ترکوں کی رواں دواں شہر تک حجاز ریلوے لائن کو تباہ و برباد کر دیا۔

حجاز ریلوے لائن کے ساتھ سفر

میں نے مدتوں مدینہ منورہ سے عمان (اردن) تک اردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

حجاز ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سفر کیا۔ صحرائی و مستوطن میں عربی کی مافوس آوازوں کو سنتے، جھجور کے درختوں، عربی طرز کے مکانات، کھیتے، صحرائی اڑتی ریت سے آئی ریلوے لائن اور سنگلاخ پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی پٹری کا مشاہدہ کرتے، ترکی طرز تعمیر میں تراشیدہ پتھروں سے بنے چھوٹے بڑے خوبصورت ایشیوں اور ان سے پرے پیچھے چلتے ہوئے ترک فوجی قلعے اور یہ کہیں، پٹری کے لیے کہیں کہیں بنے تراشیدہ پتھروں کے ترک طرز تعمیر کے بل، اس کے ساتھ ہی جابجا تباہ شدہ میل کی پٹریاں اور ان پر کھڑی چلی ہوئی زنگ آلود یوٹیاں، تباہ شدہ ریل گاڑی کا انجن اور دور جا کر گرسے ہوئے ریل گاڑی کے ڈبے، یہ سب عجیب دنیا کا منظر تھا۔

شہر مدینہ منورہ میں باب نبرہ کے ساتھ سیاہ گنبدوں والی خوبصورت مغربی مسجد سے ملحق سرکاری تراشیدہ پتھروں سے بنا مدینہ منورہ کا حجاز ریلوے اسٹیشن عربی اور ترکی فن تعمیر کا حسین امتزاج ہے اور عثمانی ترکوں کے آخری دم تک طویل دفاع مدینہ کی وجہ سے بھی اپنی اصلی ہیئت میں محفوظ ریل کی پٹری، ڈبے اور انجن سمیت عثمانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ حجاز ریلوے کی مدینہ منورہ سے دمشق تک جانی ریلوے لائن کہیں جتنی رشتی زمین پر پہنچی ہوئی اور کہیں پہاڑی آثار چڑھاؤ میں سے گزرتی ہے لیکن ریکستانی اور پہاڑی دونوں راستوں پر پہنچی یہ ریلوے لائن ہموار اور سستواں ہے۔ گرد و پیش پر طرف پہاڑی پٹریاں ہیں۔ کہیں کسی چھوٹی وادی سے گزرتی اور کہیں خوردہ درختوں سے گھر انخلتان بار کرتی تو کہیں کسی غیر آباد علاقے اور وسیع ویرانے کو عبور کرتی انعامات پہنچ جاتی ہے۔

جزیرہ نما سے عرب کا قدرتی دفاعی حصار شمال مغرب میں کوہ لبنان سے شروع ہونے والا وہ پہاڑی سلسلہ ہے جو جنوب میں باب المندب تک اور پھر اس سلسلہ کوہ پر یہ خط ایک عمود بناتا ہو ایک دوسرے پہاڑی سلسلے میں سارے جنوبی کنارے پر پھیلتا عمان تک پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ خشک اور بجز زمین تہام ہے جو بحیرہ قلم کے

ساتھ ساتھ چلتی ساحلی میدان کی ایک تنگ پٹی ہے جو آوازوں کے ساتھ ساتھ جن کی اونچائی ۳۰۰۰۰ فٹ تک بلند ہے اور سیدی و حلاوان سمندر کی طرف ہے۔ سطح عقبہ کہ مکہ مکرمہ کے درمیان ان پہاڑوں کی اونچائی ۴۰۰۰ فٹ تک بلند ہے۔ حجاز کے ان ساحلی پہاڑوں کا بدھا مغربی و حلاوان حدوں پہلے نمودار ہونے والے پر معمولی تعمیر و تبدل کے نتیجے میں ہوا جب زمین کی سطح سمندر کے ساتھ ساتھ بہت جلی گئی اور بلند و بالا پہاڑوں کی مغربی حصے بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت میں اس کی کھائی میں لڑختے، پھر بحیرہ قلمز کی موجوں نے اس کو لٹا کر کچھ کر برابر کر دیا۔

حجازی پہلی سڑک کوہستانی علاقہ ہے جو حرمین سے نام تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے میں سے آب و گیاہ پہاڑوں کا ایک لاتناہی سلسلہ ہے جس میں خشک اور قابل عبور دوروں کا ایک چال ہے۔ یہ تمام علاقہ غیر آباد ہے اور اس خاموش صحرا میں کچھی حجاز ریلوے لائن پر انہوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ایشیوں کا ایک ٹھہراؤ ہے۔ قدیم حجاز ریلوے کا خوبصورت، معجزانہ نظارہ، اس کا ساحلی پٹی حسن اور دیدہ زیب و جذاب نگاہ کہانی طرز تعمیر کے دلچسپ ریلوے ایشیوں کی ہر چیز ان کی بود بود میں ہے۔ بدوؤں نے نکال سیکھی اور اسے ان کی طبیعت سمجھتے ہوئے اپنے گھروں کے حفاظتی جنگلوں اور اگلے اٹھالے جاتے رہے۔

اگرچہ گزرتے وقت کی طویل مدت اور موسموں کے تغیر و تبدل نے ان کے حسن کو دھندلا دیا ہے مگر پھر بھی تراشیدہ پتھروں سے بنے جابجا نظر آنے والے یہ شاہکار ان بھی اپنے طرز تعمیر میں منفرد ہیں اور اس دور کا عکس مل کرتے ہیں جب حجاز ریلوے ان کے آگے رواں دواں تھی۔ جابجا ٹوٹی ہوئی ریلوے لائن بارودی مالکوں اور انسانی ہاتھوں کے ظلم کی تاریخی تائید ہے۔ تاہم بارودی پٹریاں اور سلیپر آج بھی اپنے اعلیٰ معیار کا پادینے ترکی طرز کے قوس در قوس بحرانی پل بنادوں سمیت

ٹوٹے پڑے ہیں اور ان کے اوپر لوہے کے سلیپر لٹکتی ہوئی ریلوے لائن کو سہارا دیے ہوئے آج اپنی تاریخی دفاعی جدوجہد کا منظر پیش کرتے ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ خورد و خور و جھاڑیوں کے علاوہ کچھی پڑی پڑی کے ساتھ سارا ماحول و فضا ہیں۔ کئی ایک تباہ شدہ حالت میں گزریاں پڑی پڑی ہیں۔ جبکہ جگہ جگہ انجن چار پانچ ڈیڑاں سمیت کھڑا ہے جس کے مسافر اور عملہ شاید اس کے ساتھ ہی برباد ہوئے اور وقت کی تدریس بدلتی ہوئی گنت اور اڑتی ہوئی ریت کی لہر دار تہوں نے انہیں زرخراب خالی ڈال دیے گواہ ہیں کہ ان کا مال و اسباب بدوؤں کے ہاتھوں لٹ گیا۔ حجاز ریلوے کا ایک انجن اپنے انجام پر نوحہ نکال مدینہ جاتے مسافروں کی بے نشان قبروں پر کونچ قبر بنا کھڑا ہے۔ پہاڑی راستے ویران ہیں۔ نہ عرب کا صحرائی نشان، نہ رواں دواں اونٹوں کا کاروان، نہ کوئی حدی خواں۔ آسمان کی فضا میں کوئی برندہ بھی نہیں اڑتا۔ صرف خورد و خور و جھاڑیاں اور سنگلاخ چٹانیں سر اٹھائے ایشیوں ہیں۔

مدینہ منورہ کے ریلوے اسٹیشن سے شمال کو نکلتی مدتوں سے ویران پڑی ریلوے لائن جوں جوں آگے بڑھتی ہے اس کی ویرانیاں اور تباہیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ تباہی و بربادی کا پہلا نشان ابوعامر ریلوے اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن پر ڈاکٹا مہمبت شدہ گاڑیوں کے آثار سے ملتا ہے جو بڑھتے قدموں کو روک لینے ہیں۔ اس سے آگے چلتے ہوئے مدینہ ریلوے اسٹیشن کے قریب کھلا ہکا بیکوں آسمان اور اس کے نیچے وادیں بائیں آگے پیچھے جھونکنا تک گنجا ہوا حدوں سے غیاہیں مٹی کی تہوں سے آراستہ میدان جہاں گہرے جھورے رنگ کی سیاہی مائل پہاڑیاں پھٹی پھٹی چھٹی ہوئی کھڑی ہیں۔ ایک قوی ہیکل فلوادی انجن اپنے بائیں پہلو پر الٹا بڑا ہے۔ اس کے پیچھے ریل کے بلے ہوئے ڈبے کھڑے ہیں۔

الطالع ۱۶ کومبیر پہلے حجاز ریلوے لائن ایک گھلی پڑھنا وادی میں سے گزرتی ہے۔ یہاں آج بھی ریلوے اردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء ۱۰۷

لائن کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلے پر چلی ہوئی زنگ آلود لائنوں کے ٹیز سے میڑ سے حصے اور ٹکڑے ٹھکڑے پڑے ہیں۔ جب کہ پاس ہی ایک تباہ حال ڈاکٹارناہٹ شدہ انجن ریت میں دبایا ہوا کھڑا ہے۔ اس کے آثار آج بھی انٹ ہیں۔ انجن کے پچھلے حصے کی فولادی زنگ آلود سطح کو طاقتور دھماکے نے ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور یہ آج بھی اپنے ساتھ چلی ہوئی زنگ آلود گاڑیوں کے ساتھ اڑتی ریت کے ٹھیکڑے کھا رہا ہے۔

یہاں سے ۳۳ کلومیٹر آگے غلطی وادی کی تنہائیاں میں کدش پیلے پتھروں سے بنا اسرا (Alsawah) کا خوبصورت آئین اپنی تین عمارتوں کا جھرمٹ بنائے حجاز ریلوے لائن کے متوازی ویران پڑا ہے۔ جوں جوں العلا کی طرف بڑھتے ہیں اونچے پہاڑ پیچھے ہٹتے اور وادیوں اور میدان پھیلتے جاتے ہیں۔ عذاب الہی کے آثار ایک ایک کر کے ماحول کو تاریکی تصورات میں گھیر لیتے ہیں۔ کھلی وسیع وادی میں ریلوے لائن سیدھی پیچی چلی جاتی ہے۔ لہرائی ہواؤں سے اس پر لہر لہر ریت کی نہیں بچھا دی

ہیں۔ کبھی یہ پہاڑ پھٹے تھے، زمین پھٹی تھی۔ العلا کے لوہے میں اونچے پہاڑ بے قطار پھیلتے چلے گئے۔ مدائن صالح سے ۲۵ کلومیٹر پہلے سراوت پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان تنگ ہوئی وادی آگے کی طرف پھیلتی اور کھلتی جاتی ہے۔ یہاں تیرھویں صدی عیسوی سے العلا اپنی نمایاں شناخت رکھتا ہے۔ یہاں مٹی کی اینٹوں سے بنے گھر اور قلعہ کے قدیم شہر کے آثار بیسیوں صدی کے آغاز سے ویران پڑے ہیں۔

العلا کا ٹھیکے پانی کا چشمہ آج بھی رواں دواں ہے، جہاں مقامی عرب بدو آج بھی قبوہ پیتے اور گائے دھنوں کی یاد دہراتے ہیں۔ یہاں کے ماضی کے بارے میں ان کی ہر بات حرف آخر ہے۔ العلا کے ارد گرد ماحول شاداب ہے۔ پھولوں کا ایک نخلستان اور وادی ام القریٰ اس کا ہے۔ العلا حجاز ریلوے اسٹیشن کا ایک اہم اسٹیشن تھا۔ یہاں ریلوے کے تباہ شدہ آثار آج بھی موجود ہیں۔ العلا کے اسٹیشن پر آج بھی ایک گاڑی کھڑی ہے۔

وادی ام القریٰ میں العلا (Alula) کا نخلستان

مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان صدیوں سے رواں دواں اردوانی راہ گزر پر واقع تھا۔ اگرچہ ۵۷۷ء میں رومنوں نے یہ قلعہ کے ساحلی راستے کو اپنایا اور اس طرح ۱۵۰ سال تک العلا کی کاروانی رقبوں ماند رہیں۔ تاہم ۱۲۰۱ء میں اسلام کی آمد کے اور احکام حج کی بجا آوری کے لیے اس نخلستان میں کاروانی حج کی آمدورفت سے پھر بہار آئی۔

حجاز ریلوے کے براہم اسٹیشن کی طرح العلا ریلوے اسٹیشن بھی گاڑی کے ٹھہرنے کے پلٹ فارم اور ۵۰ ہزارات پر مشتمل ٹکٹ انٹس، اسٹیشن ماسٹر کا گھر، ۱۵۰ فوجیوں پر مشتمل قلعہ مدافعی استحکام، پانی کا بلند ذخیرہ ٹینک اور ہوا چکی مدلوں سے ویران پڑے مدینہ منورہ کو ہانی حجاز ریلوے کی روانہ کر رہے ہیں۔ العلا دمشق سے ۹۸۰ کلومیٹر دور نزدیک فوج کا انجنری ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ مدائن صالح کی طرف بڑھتی ریلوے لائن آہستہ آہستہ ایسے پہاڑوں کے درمیان جا کھتی ہے جنہیں دیکھ کر گزرنے والے عذاب کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ یہ پہاڑ سیدھے اور بلند ہیں۔ العلا سے مدائن کا راستہ انسان کو حیران کر دیتا ہے۔ اونچے پہاڑ قطار در قطار کھڑے ہیں۔ بعض پہاڑوں کے پہاڑوں کے بجائے ان کی بلندی نظر کو متحیر کرتی ہے۔ لگتا ہے قوی جسامت کے ہماری بھر کم منار نصب ہیں یا قدرتی کاٹ تراش سے آراستہ دفاعی قلعے یا معبد ہیں۔

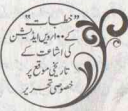
مناظر چٹانوں کے ایک ویران شہر کا تصور ابھرتا ہے۔ یہ مدائن صالح الجبر سے ہے۔ یہ قوم ثمود کا مسکن ہے جنہوں نے پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر کھربنائے۔ جنہیں اپنی طاقت اور پائیداری پر ناز تھا۔ الجبر کے نام سے مذکور پہاڑوں کو کاٹ تراش کر بنا ہوا قوم ثمود کا یہ شہر جس کی پائیداری پر اس قریہ کے لوگ نازاں تھے، شدید عذاب الہی سے نشان بھرت بن گیا۔ مدائن صالح الجبر بلند پہاڑی سرزمین پر پھیلا شہر مونی کھر در ریت اور تہ نہ بڑے اخرونی رنگ کے ریتیل پتھروں کے میدان میں قدیم عجمی تہذیب (Nabataeans) کا مسکن اور احوال و آثار کے حوالے



سے سرزمین انبیاء اپنی تمام تر تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ مدائن صالح میں کھڑے حجاز ریلوے کے پچھلے آثار محفوظ ہیں۔ شہید میں چھت سے محفوظ ایک طاقت ور انجن آج بھی اپنی شناخت لیے کھڑا ہے۔ مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے کا یہ سب سے بڑا پڑاؤ تھا۔ ریلوے اسٹیشن کی خوبصورت عمارت اس میں موجود ہے تاہم ریلوے ورکشاپ ویران ہے اور تباہ حال بوسیدہ گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے ساتھ پس منظر میں ایک برائے ترکی دفاعی قلعہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ یہ قلعہ اس مقدس کونین کے ارد گرد تعمیر کیا گیا تھا جس سے حضرت صالح کی اڈھنی پانی پیتی تھی۔

مدائن صالح سے آگے حجاز ریلوے لائن جبر پہاڑوں اور کھلی وادیوں میں سے ٹوڑتی الهرم اور ابوابق کے اسٹیشنوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ آگے پہلے کا اسٹیشن ایک ویران ریلوے لائن پر پہرہ دے رہا ہے۔ تبوک حجاز کی سرحد پر واقع ایک ایسی سرزمین ہے جسے بڑی بڑی سنگلاخ چٹانوں اور خود ہوجاڑیوں کے سرسبز قطعات اور خشک پتھروں کے دونوں نے ڈھانپا ہوا ہے۔ اس میں سمجھو کے درخت ہیں اور چمٹے ابلتے ہیں اور اسے دونوں جانب سے پہاڑ گھیرے کھڑے ہیں۔ قدیم شہر تبوک کے کنارے اور سبنا اوچی زمین پر بھجور کے ٹھنڈے گھر گھر ۱۶۹۳۱ء میں ترکوں کا بنایا ہوا قلعہ دفاع تبوک کی یاد لیے کھڑا ہے۔ تبوک میں رسول کریم نے مدینہ منورہ سے دور دراز اس مقام پر رومیوں کے خلاف مدینے کا دفاع کیا تھا۔

تبوک سے آگے حجاز ریلوے لائن جبل شرورہ کے دامن کے ساتھ ساتھ حالات غمار اور قلعات المدورہ سے ہوتی تل الغنم اور وادی رتم سے بطن الغول کی خوفناک ویران جنتاں بھول بھلیوں میں کھو جاتی ہے اور پیکر چکر سیدی چڑھائی چڑھتے چڑھتے اوپر کی طرف باہر نکل کر غدیر جارج سے ہوتی ہوئی صدیوں سے آباد قدیم کاروانی ٹھہراؤ مکتع پہنچ جاتی ہے۔ معان مدینہ منورہ سے آتے



اُن یادوں اور باتوں کا تذکرہ جو
محبت کے تازہ پانیوں میں کسی
چٹلی کی طرح تیر
رہے ہیں۔ اپنے ذہل سے
بھرتے بھرتوں اور
خوبصورت لفظوں سے
دوسروں کو بیدار کرنے
اور ذہنی بیداری پیدا
کرنے والے باپے واقعی
بہت خوبصورت ہوتے ہیں

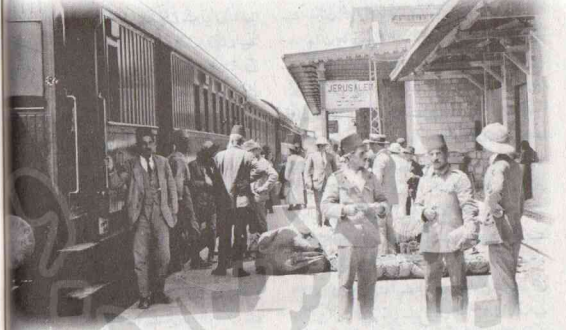
خوبصورت بابا

خستہ عباس

کے حصار میں تھا اور میں دروازے میں گئے شیشے پر ناک
ٹکائے، دیوار پر ہاتھ تھمائے اسے دیکھے جا رہا تھا۔
۱۹۷۸ء کی آخری مہینہ تھا، کاجوں میں طلبہ یونیون
کے انکسشن ہو چکے تھے۔ میں بھی ایس ای کاج بہاولپور
میں چیتنے والے بیٹیل کا حصہ تھا۔ اپنے نائب صدر
رمضان ارشد جوینیہ (اب ایڈووکیٹ)، ظفر اللہ عاصم

کو جب میں نے پہلی بار
دیکھا تو وہ لکھ لکھ مجھے یاد ہے۔
”کوئی بوڑھا آدمی اس قدر
خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔
مطمئن، شانت اور
دھیرے دھیرے پان چباتا وہ نفیس آدمی میری نگاہوں

ان



اولیٰ العزم لوگوں کی محبت اور انجینئرنگ کا یہ عظیم الشان
شاہکار آج آثار پارہ بن چکا ہے۔ اس کے بچے کسم
آثار مدینہ منورہ سے دمشق تک اپنے عہد کے یادگار
ثقافتات کے طور پر باقی ہیں۔ دولت عثمانیہ کی تجار ریلوے
کی خاص نشانی ”سلطان بوکی“، دمشق کے قدیم ریلوے
اسٹیشن پر کھڑی ہے اور اس میں عوامی ریسٹوران کھلا ہے
جبکہ اس کے قریب ہی پرانے ڈبک آلودر ریلوے انجن اور
بوگیاں کھڑی ہیں۔

مجھے سوچتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے بڑی کے
مصطفیٰ کمال پاشا کو دین اسلام سے متفرق کر دیا اور اس نے
پورے بڑی کو ایک لادین ریاست بنا ڈالا۔ کیا وہ شروما
سے ایک سیکلر ذہن کا مالک تھا؟ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر اس
کے لادین بن جانے میں کہیں اس دور کے امراء عرب
کی بے وفائی کا ہاتھ تو نہیں۔ اگرچہ اس میں نقصان تو
مصطفیٰ کمال کا اپنا ہی ہوا، کسی کا کیا بگڑا لیکن تحقیق ذہن کا
اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، وہ صرف پیش نظر ہی کو نہیں
پس منظر کو بھی دیکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔

ہوئے شمال مغرب میں لگ بھگ ۸۰۰ کلومیٹر اور دمشق
سے آتے ہوئے جنوب میں ۴۸۹ کلومیٹر پر تجار ریلوے کا
ایم پڑاؤ تھا۔

سولہویں صدی میں عثمانیوں نے معان (Maan)
کے راستے کو بہتر بنایا۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک قلعہ تعمیر کرایا۔
آب رسانی کے پرانے نظام کو پھر سے قابل استعمال بنایا۔
یہاں گارے مٹی کے بنے ہوئے گھروں کا قدیم عربی
تعمیراتی حسن اور بہتہ پانی سے سیراب ہوتے پھلوں کے
باغ تھے۔ چشموں کے وافر پانی کی نعمت سے فیض یاب
اس نخلستان میں لوگ انجیر اور انار اگاتے اور گزرتے
کاروانوں کو فروخت کرتے۔ شام سے معان تک کے
طویل خاموش اور ویران سفر کے بعد جب حج کے کارواں
قلعات معان پہنچتے تو شاہد نخلستان کی اس سرزمین پر
۲/۳ روز کے لیے آرام اور قیام کرتے۔

تجار ریلوے کی داستان اپنے ساتھ بہت سی کہانیاں
لیے ہوئے ہے۔ زودار تجار ریلوے (The Mighty
Hejaz Railway) بلا ویشام کے قدیم دارالحکومت
دمشق سے اپنے آخری پڑاؤ مدینہ منورہ تک آتی تھی۔

چوہدری (اب تحسیدلار) کے ہمراہ اسلام آباد میں قومی اتحاد کے وزراء سے رابطہ کرنے اور کالج کی تقریبات میں مدعو کرنے کے مشن پر نکلے تھے، میرے لیے یہ ساری دنیا، یہ رابطے، یہ لوگ یا تو کہہ کیے کہ تجربوں اور مشاہدوں کے سارے منظر ہی نئے اور سبز تھے۔

لاہور میں رک رک کر ۵-۷ اے ذیلدار پارک اچھرہ جانا پروگرام میں تو شامل نہیں تھا، وہاں پہنچے تو نماز عصر کا وقت تھا، کتنے ہی لوگ جمع تھے، دالان میں، برآمدے میں، گروپ بننا کر کھڑے تھے، مولانا کی صحت کئی ہے! مرشد کی طبیعت کبھی ہے، معمولات، پروگرامات پر تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔ میرے لیے ان میں کوئی بات بھی دلچسپی والی نہیں تھی، اس لیے برآمدے میں بیٹھی صفوں کو دیکھا اور پہلی صف میں بیٹھ گیا۔ بیچپن سے یہی سننا تھا کہ

پہلی صف میں نماز کا ثواب اور آج مرتبہ زیادہ ہے۔

اچانک درمیانی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک صاحب نے دھیرے سے دہل چہتر کو یوں باہر نکالا جیسے آکٹین کو سنبھالتے ہیں، سفید براق لباس میں لمبوں، سفید ٹوٹی اور سفید ڈائری والا ایک چھوٹا سا وجود اس کرسی پر تھا اور کرسی میرے دائیں ہاتھ بالکل میرے ساتھ دھری تھی۔ لوگوں کا اہانتہ پن، لپکتا، ان کی طرف بڑھنا، پھر رک جانا اور کئی باندھ کر دیکھنا، مجھے بہت عجیب سا لگا اور جواباً میں نے مڑے بھی نہ دیکھا کہ میرے ساتھ کون بیٹھا ہے۔ نماز ختم ہوئی، کرسی اندر چلی گئی، سب لوگوں نے دوبارہ صف بندی کر لی، اب وہ دروازے سے لگے اپنی اپنی باری پر اندر بھاگ کر رہے تھے اور ہر ٹھوڑی دیر بعد ایک صاحب انہیں آگے بڑھا رہے تھے۔ (سالوں بعد مجھے علم

ہو یا مولانا عاصم نعمانی تھے)۔

سب لوگ مٹ گئے۔ ظفر اللہ نے پوچھا ”مرشد کیسے لگے؟“

”کون مرشد؟“ میں نے حیرت سے پوچھا

”سید مودودی۔“ وہ بولا۔

”کون! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی! وہ کہاں سے آگئے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ انہی کا تو گھر ہے۔ تمہارے ساتھ وہی تو تھے ذہیل چہتر؟“ ہمار ہیں بہت۔“

”مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”کیسے بتاتے تم تو جا کر پہلی صف میں بیٹھ گئے تھے۔ ہم نے سوچا تم خود ہی جان جاؤ گے۔“ پھر میں

بھاگ کر دروازے سے جاگا، اکیلا اور آخری۔ دیکھوں تو

کسی ان کا مرشد کیسا ہے؟ انھوں نے سارا انکیشن سیدی مرشدی مودودی، مودودی کے نعرے لگاتے گزرا تھا۔ یہ کب سوچا تھا کہ ایک روز انہی کے گھر پر انہی کے در پر میں خوشگئی کھڑا ہوں گا۔

گورا رنگ، سفید ڈائری، نقاست سے پہنے ہوئے سفید کپڑے، انہی پر میری نظر گئی اور اس حسن اور حسن چہرے پر پٹھریں گی، وہ بوڑھا بانا مجھے بھا گیا، میرے حواس پر چھا گیا اور میں کتنی ہی دیر اسے نگلی باندھے دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔ ”کیا بڑھا ہے میں بھی خوب صورت ہو جاتے ہیں؟“ میں نے جوبیہ سے پوچھا۔

”ہم نے تو تمہیں دیکھے، ہوتے ہوں گے۔ مگر کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”تمہارا مرشد مجھے اچھا لگا۔“ وہ دو ہنسوں پر سے،

برادر محترم عبداللطیف احمد (مینٹینگ ڈائریکٹر) اسلامک جوبلی کیشنز، لاہور کا خط سیدی کی مقبول اور مشہور کتاب ”خطبات“ کے ۱۰۰ اردو ایڈیشن کی دل پر بجز لایا ہے۔ بے شک یہ ان کی بھی خوش بختی ہے کہ اس تاریخی موقع پر اسلامک جوبلی کیشنز کے سیر کاروائی ہیں۔

خطبات سے میری ہی مشکافی یادیں بڑی ہوئی ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ خطبات دوم میری زندگی کی پہلی تحریکی کتاب تھی۔ سلامتی کا راستہ، شہادت حق، رسائل و رسائل کے بعد اول کی باری آئی۔ یہ ستمبر ۸۷ء کا پہلا ہفت تھا جب ڈائری پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا۔ عنوان تھا ”میری زندگی کا بہترین مطالعہ“ خطبات کا ”نماز میں بے اثر کیوں ہو گئے؟“ والا حصہ۔ ڈائری پر تفصیلاً درج ہے۔ اس قدر سادگی اور نقاست سے مولانا نے اس موضوع کا احاطہ کیا تھا کہ گھڑیاں کی مثال کی سمجھتہ لفظ کی طرح دل کی دیوار پر آویزاں ہوئی۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں جب مولانا محترم رخصت ہوئے، اکثر دوست لاہور ان کا جنازہ پڑھنے آئے اور میں ایف ایس سی کے امتحانات کے باعث پہچان پوری رکھنے پر مجبور ہو گیا تو ڈائری کے ان صفحات نے کتنے ہی محنت پھرے آنسوؤں کو جذب کیا۔

۵-۷ اے ذیلدار پارک اچھرہ میں تنہا خاک سوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھلا کھ سوچا ہوگا کہ ان کی اپنی اولاد سے زیادہ ان کی معنوی اولاد میں اور ان کے لکھے لفظوں کو محبوب اور ان کی تحریروں کو زجر جان بنا کر رکھے گی۔

مغرب و مشرق میں سامنے لوگ اب اس نتیجے پر پہنچ کر لکھ رہے ہیں کہ Back to basics ہی میں زندگی ہے۔ مولانا کی بصیرت نے دہائیاں پہلے اس کو سمجھا، جانا اور پھر پھر ہماری اس سمجھتا کے در کی طرف بلاتے رہے۔ ان کی دعوت نظائر سادہ لفظوں اور جملوں سے آراستہ ہے مگر جس چیز نے ان کو یانیداری اور استواری عطا کی ہے وہ دعوت کی ابدی سچائی اور مستقل اقدار کے ساتھ دانستگی ہے جو دہلی کی تاروں سے مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ وہ کیا خوب لکھتے تھے اور کیا خوب لکھا کہ ”قرآن و سنت کی دعوت لے کر اٹھو اور ساری دنیا پر چھا جاؤ۔“

میری خوش قسمتی کہ مولانا کے گھر کے ہمسائیگی میں ۱-۷ اے ذیلدار پر ۱۹۸۸ء میں لگنے والے پہلے پورڈ پر یہ لائینیں لکھوانے کا اعزاز اور پھر اس عہد کی ڈائریوں، کتابوں اور سکرز پر اس کو سلوگن کے طور پر چھپوانے کی سعادت ملی۔ خطبات کے ۱۰۰۰ ایڈیشن کو معلوم میں کون جانے لگتے ویسے بھی مجھے ہیں۔ ملتان میں خطبات بہت باقاعدگی سے چھپتی اور بیقی رہی ہے۔ وہ ایڈیشن کہیں کھتے پڑھتے میں بھی نہیں آتے ہوں گے۔ مولانا محترم کے جانے کے بعد کتنے ہی لوگوں نے صرف خطبات کے لفظ پڑھنے اور ان کی محبت میں جتنا ہو سکے۔ میں ان خطبوں کا نشی شاہد نہ ہوتا تو اس کتاب کی تاثیر اور گہرائی سے شاید پوری طرح آگاہ بھی نہ ہو رہا ہوتا۔

صاحب تعظیم القرآن و خطبات کو یاد کرنے کا یہ خوب موقع ہے حالانکہ وہ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء اور ستمبر ۱۹۷۹ء کے سال، مہینوں اور دنوں کو یاد کرنے اور کیے جانے کی منزل سے کب کے گزر چکے ہیں۔ وہ عزیز جان تو تھے ہی، بار بار آنے والے یہ باب مباحثہ موانع ہر بار ثابت کرتے ہیں کہ وہ عزیز جہاں بھی ہیں۔ مولانا سے محبت کرنے والوں کو خطبات کے ۱۰۰ ایڈیشن کی اشاعت مبارک ہو۔ یہ اللہ کے ہاں قبولیت اور اس کے کرم کا ایک ایک اظہار ہے۔

مجھے یاد ہے مولانا کی ریاضت کی کتنی کتنی سال بعد ایک دانشور نے بڑے انداز میں کہا ”ہاں وہ بڑے مصنف ہیں مگر ان کی تحریر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے خطبات منگوا کر پیش کی اور پوچھا ”حضور! آپ کی بات بجا، آپ ذرا راہنمائی فرمائیے کہ کس کس بات سے کہاں کہاں اختلاف ہے جناب کو؟“ ایسے نوکوں سے دوبارہ آواز نہ کی آئی ہے مگر ایک عرصے تک ہم ایسے نامہاد دانشوروں سے اس قسم کے خطبے سنتے ضرور رہے ہیں۔ ان کا بھی قصور نہیں تھا، انے بے چاروں کو خطبات جیسی تحریروں کی عظمت کا احساس تو بھی ہوتا اگر وہ اس کے مطالعے کی لذت سے آشنا ہوئے ہوتے۔

جانتے تھے کہ گزشتہ ایک سال سے مجھے ان کی کستائیں پڑنے کو دی جارہی تھیں اور میں نے ایک لفظ پڑھ کے نہیں دیا تھا، یہ ملک میں ہجرت میں شامل ہو چکا تھا مگر مولانا کے حوالے سے اتنی مخالفت نہ تھی جتنی کہ ان کی کوئی کتاب اور پمفلٹ پڑھنے پر آبادگی ہی نہ ہوتی تھی۔

ذیلدار پارک سے رخصت ہوئے تو دل میں سوچ چکا تھا کہ جو آدمی اس قدر خوب صورت اور مطمئن ہے۔ اس کی تحریر میں بھی یقیناً خوب صورتی ہوگی، واپس جا کر وہ سارے غمغناہ اور کستائیں لے کر پڑھوں گا ضرور جنہیں اب تک پڑھنے سے بچتا آتا تھا۔

اگلے چند ماہ ای عالم میں گزرے کہ انہی تحریروں کے مطالعے میں صبح ہوتی، انہی کے مطالعے میں شام ہوتی، جو جو کتاب پڑھتا، اس کے نوٹس لیتا، حیران ہوتا کہ خدا نے اس شخص کو بات سمجھانے اور نمونے کی کیا خوبی دی ہے۔ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی یوں آسان بنا دیتے ہیں کہ دل خود بخود مان جاتا ہے، حالانکہ جب یہ لوگ بتاتے تھے کہ مولانا کی کستائیں ۵۶ زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں اور تقریباً ہر ملک میں لوگ ان کی فکر سے متاثر ہیں اور تبدیلی اور انقلاب کے لیے انہیں راہنما مانتے ہیں تو، میں ماننے سے انکار کر دیتا تھا۔

میراثیاں تھا کہ سامنے میں اور بھی کئی نقصان ہیں۔ یہ ہجرت والے سینہاں جا کر قلم نہیں دیکھتے، میں دیکھنے بنا رہ نہیں سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وقتے میں اٹھ کر نماز بھی پڑھ آتا تھا مگر وہ قلم، وہ ماحول، وہ حقوق، میرے اسلام اور تصور ایمان کو کچھ نہ بگھاتا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ اگر ان کی بات مان لی تو اس طرح کی ساری حرکتیں چھوڑنا پڑیں گی۔ پھر ایک دن خطبات پڑھ لیے۔ مجھے وہ دیکھنے نہیں بھولتے۔ مولانا کا پتھان کوٹ میں ان پڑھ لوگوں سے خطاب تھا، لکھا تھا:

”یہ گشتا (دال کاک) جو آپ کے سامنے لنگ رہا ہے اس میں بہت سے پڑے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہیں، جب اس کو ٹوک (چانی) دی جاتی ہے تو

سب پڑے اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اسے ٹوک نہ دیں تو وقت نہیں بتائے گا۔ اگر آپ ٹوک دیں، لیکن اس کے قاعدے کے مطابق نہ دیں جو ٹوک دینے کے لیے مقرب ہے تو یہ بند ہو جائے گا یا چلے گا بھی تو صحیح وقت نہیں بتائے گا۔ اگر آپ جھٹکے نہ لگال دیں اور پھر ٹوک دیں تو اس ٹوک سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر آپ اس کے بعض پڑوں کو نکال کر سنگر مشین کے پڑے لگا دیں اور پھر ٹوک دیں تو یہ نہ وقت بتائے گا، نہ ہی کچھ اے گا۔ اگر آپ سارے پڑے اس کے اندر ہی رہنے دیں لیکن انہیں کھول کر ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیں تو ٹوک دینے سے کوئی پڑہ بھی حرکت نہیں کرے گا۔ اسلام کو بھی اس کا کلاں پر قیاس کر لیں۔ دین کے عقائد، اخلاق کے اصول، دنیا کی ہر چیز کے حقوق سے لے کر حکومتی قوانین سب اسلام کے پڑے ہی تو ہیں۔ ان کو گھڑی کے پڑوں کی طرح ایک ترتیب سے کسا گیا ہے کہ جو بھی ٹوک (چانی) دی جائے، وہ پڑا اللہ کے نظام کا غلبہ ظاہر ہونے لگتا ہے، لیکن اب سارے پڑے ہی ڈھیلے اور الگ الگ ہو کر بکھر رہے ہیں۔

اب کوئی صاحب سنگر مشین کا پڑہ پسند کر کے لے آئے، کسی صاحب کو آنا پسینے کی جگہ کا کوئی پڑہ پسند آ گیا تو وہ اسے اٹھا لائے۔ اب آپ مسلمان بھی ہیں اور چنک سے سودی کاروبار بھی چل رہا ہے۔ کفر کی خدمت بھی وفاداری کے ساتھ ہو رہی ہے۔ غرض کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے ہمارے مسلمان بھائیوں نے لا لاکر اسلام کی اس گھڑی میں ٹھونسنے نہ دیا ہو۔ یہ سب حربیں کرنے کے بعد آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ چانی دینے سے یہ گھڑی چلے۔ کاش! میں آپ کی ہاں میں ہاں ملا سکتا، مگر میں کیا کروں، جس حالت میں آپ اس وقت ہیں، عمر بھر بھی ٹوک دیتے رہیں، گھڑی نہ چلتی ہے نہ چلے گی۔“

چنی بات تو یہ ہے کہ یہ تحریریں میرے دل پر جم چکی، اس نے سوچ میں زندگی بھی بدل کر رکھ دی، فکری سطح پر چھائی وندھ کو صاف کیا اور یہ بتایا کہ ایمان لانے کے بعد یہ

کہنے کا حق نہیں رہتا کہ یہ میری رائے ہے، یہ دنیا کا دستور ہے۔ یہ ماننا ہے، وہ دہن ماننا یا فلاں بزرگ فرما گئے ہیں۔ گلہ نہ لیا، مطلب خدا کے مقابلے میں اپنی آزادی، رائے سے خوشی اور آدمی کے ساتھ دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے ساری بشری کمزوریوں کے ساتھ اپنا پار ہمیشہ بہت عزیز اور پیارا رہا ہے۔ مولانا نے اس تعلق کو اور بھی خوبصورتی دے دی۔ یہ غالباً ”اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات“ میں انہوں نے لکھا تھا کہ اپنی ان تمام وفاداریوں کو دور یا کر دو جو خدا کی وفاداری کے تابع نہ ہوں، بلکہ اس کے مقابل بنی ہوں یا بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت بٹھاؤ اور ہر بات کو دھونڈ دھونڈ کے اپنے نہاں خاندان سے نکال بیٹھو، جو خدا کے مقابلے میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کر رہا ہو۔

ایسا بھی ہوا کہ سوچ اور فکر ایک دن میں بدل گئی۔ وہ انسانی افسانے کو کمال درجے سمجھتے تھے، جانتے تھے کہ سوچ، عمل میں تغیر آتا رہتا ہے۔ مسلسل سمجھنا اور قائل کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہر کتاب میں پیرائے بدل بدل کر وہ دواہن میں تمام لیتے، کتنی ہی باتیں، کتنی ہی تحریروں قطار اندر قطار سامنے آ رہی ہیں، جب لگتا تھا کہ میرے ہی لیے لکھی ہیں۔ دل کو مضبوطی دینے والی، عقل کو قائل کرنے والی، جتنا زندگی میں ایچ پی عمل کی خواہش کے باوجود کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ کہیں حکمت، کہیں مدانت اور کہیں مصلحت، جاننے انسان نے کیا کیا نام پر عملی کے دھونڈ رکھے ہیں۔ یہ کمال، میں بھی کرتا تھا، اب بھی کا ہے کہ لیتا ہوں، مگر ان کا کہا اپنی جگہ پر اٹ مٹا ہے، مثلاً انہوں نے لکھا تھا ”کیا آپ کو بھی نہیں آئے گی اس شخص پر جو حکیم نے نسخہ لائے اور پڑے میں لپیٹ کر گلے میں باندھ لے یا پانی میں گھول کر پی لے۔ کیا اسے پاگل خانے نہیں بھجوا دیں گے جو طب کی کتاب لے کر پیٹھ جائے اور خیال کرے کہ شخص پڑھنے سے بیماری دور ہو جائے گی۔“ مگر مسلمان نے ساری ستم ظریفیاں اللہ کی کتاب کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑے بڑے پبلک

انداز میں کہیں لکھا تھا ”گر کلک طبع کے معنی دل میں نہ اتریں اور ان کے زور سے تمہارے خیالات، اخلاق اور اعمال نہ بدلیں تو زورے الفاظ بول دینے سے کچھ بھی اثر نہیں ہوگا۔ زبان سے خلاف خلاف بیان کرنے سے سر دی کی بند نہیں ہوگی۔ صبح سے شام ہانی پانی پیکارنے سے پیاس نہ بجھے گی۔“ میں جو بھی اس کی تحریروں کے قریب نہیں جاتا تھا، جب پڑھنے لگا تو کچھ لفظوں کی محبت کا ایسا امیر ہوا کہ ان کی کستائیں یہاں وہاں سے دھونڈتا پھرنا، ان کے بارے میں تحریروں، اس کے اوپر لکھی تحریروں، ایسے میں اپنے محبوب کے بارے میں سب کچھ جاننے کو دل چاہتا ہے، انہی دنوں پتا چلا کہ مولانا نے اپنے بارے میں جتنی جتنی کا جواب نہ دینے کی تاکید کی ہے۔ اس سے مجھے ذاتی طور پر بڑی سہولت ہوئی۔ کوئی آپ کے کسی جاننے والے کو آپ کے پسندیدہ مصنف یا فکریے سے اختلاف ہے تو ہوا کرے، آپ کیوں لڑنے بیٹھ جائیں، کبھی کبھی دل میں خیال آتا، مولانا عجیب آدمی ہیں۔ خود ہی اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ میری تحریروں سے اتفاق ہر گز ضروری نہیں اور خداوند برتر کا واسطہ کہ کوئی شخص فقہی کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے جھگڑے کے طور پر پیش نہ کرے نہ میرے ذاتی عمل کو۔۔۔ میری کلامی دعوت قرآن پاک کی طرف ہے، اپنے لیے کسی منصب کے لیے نہیں۔ اپنی ذات کے لیے لڑنے کے لیے نہیں۔ میرا اپنے عقیدے میں سے تعلق بس اور خدا میں ہمسفری کا ہے، اپنے نام پر کسی فکری یا فقہی مسلک قائم کرنے کے لیے نہیں۔

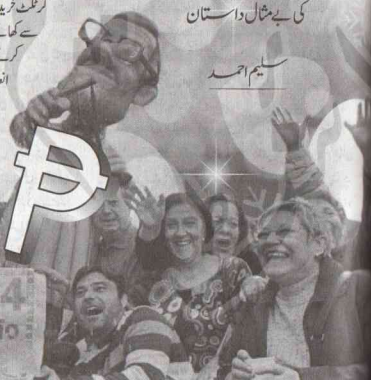
وقت نے ثابت بھی یہی کیا کہ ان کے نام پر کوئی فرقہ نہیں بنا۔ لوگ انہیں پڑھتے رہے، سیکھتے رہے اور خدمت کے لیے اپنے اپنے میدانوں میں جاتے رہے۔ خیال یوں مولانا کو پڑھتے ہوئے سکھا کہ دل بڑا کرے، خیال اور فکر میں ودعت لانا کے کہتے ہیں۔ سوچ کے سنے دروازے کھولتے ہیں۔ انہی کو کچھ کر سولازم، کمیونزم، سٹیٹ سن، موئی سے مارکس تک سب پڑھ ڈالیں کہ جب وہ کہتے ہیں کہ ”ایک دن آئے گا کمیونزم ماسکو میں اپنے

قسمت شراب کھیل

ممالک میں
لاڑی کے
کھٹ خاصے
مغربی
منگے ہوتے ہیں، چنانچہ دوست احباب اور رشتے دار مل کر کھٹ خریدتے ہیں۔ اگر انعام نکل آئے، تو پھر خوشی کے کھانے پینے کی دعوت اڑاتے یا کہیں سیر فرائض کرنے نکل جاتے ہیں۔ عموماً ان کا چھوٹا موٹا انعام ہی نکلتا ہے، لیکن بڑا نکل آئے، تو ان کی چاندی ہو جاتی ہے۔ لیکن ایتھین میں ایک زبردست اٹھوٹی ہوئی کر

ہسپانوی گاؤں کے غریب کرڈ پتی بن گئے
خوش قسمتی، ایسا راور دستر بانی
کی بے مثال داستان

سلیم احمد



آدی بھی ان کے حجرے ۲۵ رسالوں کے بعد بھی آزا نہیں ہو سکا، بے شک زندگی، سوچ اور اعمال دلیے عمدہ نہیں بن پاسے، جیسے مولانا کہتے تھے اور چاہتے تھے، مگر اس میں تصور باطنی اور صابن کا نہیں، کوئلے کی لپٹی سیائی کا ہے۔ اس لیے تو وہ خوبصورت بوڑھا بہت یاد آتا ہے جو میرے دل تک اپنی خوبصورتی، معصومیت اور نفاس کے باعث آیا تھا، بوڑھا پانہ کبھی ان کی سوچ اور لفظوں پر تب آیا تھا، نہ ۲۵ رسالوں بعد بوڑھا پانہ کو ان کی تحریروں کی تاثیر میں لگتا ہے۔

اشفاق صاحب داستان سرائے میں صوفے پر ٹیک لگائے آج بیٹھے ہوتے تو ضرور پوچھتا کیا سارے بابے اتنے ہی خوب صورت اور اچھے ہوتے ہیں اور وہ ناک کھجائے، آنکھیں بند کرتے اور کہتے جو مخلوق کو خالق تک لے جائے، اسی کے در کا سوال بنا دے، اس سے خوبصورت اور کوئی بھی کیسے سکتا ہے۔ یہ تو بابا جب چلا جاتا ہے تو مخلوق کی یاد اور آواز بتا دیتی ہے کہ وہ کتنوں کو پیارا تھا۔ مجھے یاد ہے مولانا کے جنازے سے واپسی پر ظفر شاہد کہتے دن ہسپتال میں رہا تھا، جہیز تھا کہ کیٹھ میں جنازے کے لیے گھنٹے ہوئے اتنا جہیز تھا کہ کیٹھ میں پھنس جانے سے اس کی ۲۲ لیلیاں لوٹ کی تھیں۔ وہ علما تھا امام یوسف قزواہی قطر والے (حال میں وہ دنیا بھر کے علما کے سربراہ منتجب ہوئے ہیں) نے جنازے کے بعد کہا تھا ”کسی کی عزت، محبت اور وقت دیکھتی ہو یا یہ دیکھنا کہ پاکستانی مسلمان کیا چاہتے ہیں تو یہ ریفرنڈم سب کے سامنے ہے۔“ پھر انھوں نے بھرائی آواز میں کہا تھا ”اللہ کے ہاں کسی کے مقبول ہونے کی شہادت کیا کہ ہم کے لاکھوں آنکھیں رو رہی ہیں، اُس کے لیے جو نیکیوں کا مجموعہ تھا۔“

اس خوبصورت بابے کی یاد میری محبت کے تازہ باتوں میں آج بھی کسی کھجلی کی طرح تیر رہی ہے۔ میں تو آج بھی شیشے سے ناک چپکائے ریواری پر ہاتھ جمائے تصور کی آنکھ سے دیکھے جا رہا ہوں کہ دوسروں کو بیدار کرنے اور ذہنی بیداری پیدا کرنے والے لفظوں اور جنتوں میں جینے والے بابے باقی بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔

بچاؤ کے لیے پریشان ہوگا“ تو ضرور کوئی بات تو ہوگی۔ جب وہ کہتے ہیں کہ ”سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لیے لڑ رہا برنامہ ہوگی“ تو دیر سے کبھی ہوگا تو ضرور۔ ان کی وہ بات تو بہت ہی کمال کی تھی: ”آج کا دور تاریخ میں داستان عبرت بن کر رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالمگیر اور جہاں کشا طاقت کے نام لیا بھی اتنے بے وقوف بھی تھے کہ عرصائے موسمی بغل میں تھا اور لاشیوں اور رسیوں کو دیکھ کر کانپا کرتے تھے۔“ یہ وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا، بلکہ ابھی تک دیکھے جا رہے ہیں۔ گھر میں انتم بھی ہے اور سب سے ڈرے جا رہے ہیں۔ ۲۳ مئی کی شام بھی جب ریڈیو پاکستان سے مولانا کی وفات کی خبر آئی۔ یہ میری جذباتی زندگی کا وہ پہلا صدمہ تھا، جس سے میں دوچار ہوا۔ میرے ایف ایس سی کے امتحان ہو رہے تھے، باقی سب لوگ جنازے کے لیے لاہور آ گئے تھے اور میں سیٹلائٹ ناؤن بہاولپور میں اپنے کمرے میں لیٹا، مولانا کو یاد کر کے یوں رو رہا تھا، جیسے کوئی محبوب پتھر کیا ہو۔ لی بی بی لندن سے الطاف گوہر نے جب ہوائی اڈے پر جنازے کے لیے جاتے ہوئے اپنے ٹیکسی ڈرائیور کا سوال بولا کہ تم جس کے جنازے پر جا رہے ہو کیا عزیز تھا اور الطاف گوہر کا جواب تھا، نہیں وہ عزیز جہاں تھا، تو مجھے یاد ہے چار پانی کی پائنتی میں پاؤں پھنسا کر میں یوں تڑپا تھا، جیسے چھلی تڑپتی ہے، یوں رویا تھا کہ سانس بند ہونے کو آگئے تھے۔

لوگ چلے جاتے ہیں، وقت بدل جاتا ہے، جنتوں میں ملاوت ہو جاتی ہے۔ نئے محبوب بن جاتے ہیں۔ روایتیں، رواج، مزاج سب دھیرے دھیرے تبدیلی کی زد میں آ جاتے ہیں، بس نہیں بدلنے تو اصول، باقی رہتی ہیں تو اصولی باتیں، جو کمزور لوگوں اور قوموں سے ہنرم نہیں ہوتیں، بڑے لوگ، بڑے اور پائیدار اصولوں سے ہی بنتے ہیں۔۔۔۔۔

اور مولانا کی بڑائی میں بھلا کیا شک ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔

مولانا تو رخصت ہوئے ۲۵ رسالہ ہونے کو آئے۔ آخر ایسا کیا تھا ان میں، ان کے لفظوں میں کہ مجھ جیسا

پورے گاؤں کے مگرھروں کا لائری میں انعام نکل آیا۔
ہسپانوی دارالحکومت سے ۳۳ کھنڈے کی کارڈرائیو پر
شمال مغرب کی طرف سودیتو (Sodeto) نامی دیہہ آباد
ہے۔ یہ دیہہ ۱۵۰ سال قبل ہسپانوی حکومت نے بسایا تھا
تاکہ وہاں جو غیر آباد زمین پڑی ہے، اسے کھیتی باڑی کے
قابل بنایا جاسکے۔

لائری کھنڈے سے قبل ۶ مگرھروں پر مشتمل سودیتو کے
۲۵۰ افراد تحت معاشی مسائل میں گرفتار تھے۔ تین چار برس
سے وہاں قحط آیا ہوا ہے، چنانچہ فصلیں اچھی نہیں ہو رہیں،
پھر حالیہ یورپی معاشی بحران نے ایتھن کو خاص نشانہ بنایا۔
وہاں ہیر وزگاری عروج پر ہے اور افراد زرعی بھی خاصا ہے۔
لہذا خراب ملکی حالات نے بھی ہسپانوی کی حالت خراب کر
دی ہے حتیٰ کہ سودیتو کے کئی باشندوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس
سال لاکھوں ہسپانیوں کی پسندیدہ ”ال گوردو“ (El Gordo)
لائری بھی نہیں خریدیں گے۔

ال گوردو ایتھن کی سب سے بڑی لائری ہے۔ یہ ہر
سال کرکس کے موقع پر (ماہ دسمبر) میں بھیلی جاتی ہے۔
جب لائری کا انعام کھنڈے والا دن آئے، تو ٹیکڑوں ہسپانوی
چھنی کر کے پی دی سے پیچک جاتے ہیں۔ یہ دن ایتھن میں
تہوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ لائری ۱۸۱۲ء سے چلی آ رہی
ہے۔ ہسپانوی میں ال گوردو کے معنی ہیں ”بڑی موٹی“۔

اس بار انعام رقم ۹۵ کروڑ ڈالر لائری کی تاریخ میں
سب سے بڑی تھی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم ۱۲۵ ارب
۵۰ کروڑ روپے بنتی ہے۔ ایک تو اس انعامی رقم کی کشش،
دوسرے ہوم میکز ایسوسی ایشن کی مدد کے جذبے نے
سودیتو کے باشندوں کو اسیا کی وہ مل کر لائری ٹکٹ
خرید لیں۔ ہوم میکز ایسوسی ایشن گاؤں کی مقامی
فلاحی تنظیم ہے جو ضرورت مندوں کی مدد کرتی ہے۔
کئی سودیتو اور آس پاس کے دیگر دیہات میں ال گوردو
کے ٹکٹ فروخت کرتی ہے۔ بدلے میں اُسے ہر سال
تقریباً ۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم ملتی ہے۔

انہیں انعام ملنے کی خوش خبری ملی، تو وہ کہاں تھے اور انہوں
نے کس قسم کے رد عمل کا اظہار کیا۔ بعض لوگ بتاتے ہیں کہ
انہوں نے قربانی دینا کار زبردست اجتماعی مظاہرہ کیا۔ جن لوگوں

کے پاس زیادہ رقم تھی، وہ انہوں نے پڑوسیوں کو ادھار دے
ڈالی تاکہ وہ بھی ٹکٹ خرید سکیں۔ چونکہ ٹکٹ ۲۶ ہزار
(۲۳۳۰۰ روپے) کا تھا، لہذا بہت سے پڑوسیوں نے مل کر
خرید لیے۔

اس بار ۱۸۰۰ پچھلے انعام تھے۔ ہر انعام کے ٹکٹ کا نمبر
۵۸۲۶۸ تھا۔ جس کا لائری میں ایک ٹکٹ نکلتا، اُسے ۵۸ لاکھ
۲۰ ہزار ڈالر (۲ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے) ملتے۔ تاہم ایک ٹکٹ
کئی لوگ مل کر خریدیں اور ان کا انعام نکل آئے، تو نقد حصے کے
مطابق ہر ایک کو انعامی رقم ملی ہے، کم یا زیادہ۔

چنانچہ ۶ مگرھروں نے مل کر ٹکٹ خرید لیے۔ چونکہ
ان کا اصل مقصد اپنی فلاحی تنظیم کو تقویت پہنچانا تھا لہذا وہ
نتیجے سے بے پروا ہو گئے۔ جس دن لائری نکلی، یہ خبر
جنگل کی آگ کی طرح پورے قصبے میں پھیل گئی کہ بھی
۶ مگرھروں نے کم یا زیادہ رقم جیت لی ہے۔ چونکہ یہ خوشی کا
اجتماعی موقع تھا، لہذا سب نے مل کر جشن منایا۔ کسان اپنے
اپنے فریگٹر لیے قصبے کے چوک میں جمع ہو گئے اور مسرت
سے فحش بارن بجانے لگے۔

قصبے کی میسر، روزا پوس نے میگا فون کے ذریعے تمام
خاندانوں کو مبارک دی۔ قصبے کے واحد کھٹے کی مالک،
انیسابوری خوشی کے مارے چوک میں ناچنے کی حالانکہ اس
پہلے پڑانے موزے پہن رکھے تھے۔ فحش عورتوں نے
چاہا کہ وہ بن مسور کا ہار نکلیں۔ چنانچہ وہ اپنی کٹوائے خاتون
نانی کے پاس بیٹھیں، تو پتا چلا کہ اس کا بھی انعام نکل آیا ہے،
لہذا اس نے چھٹی کر لی تھی۔

قصبے کے ۶ مگرھروں کا مجموعی طور پر ۱۵ کروڑ ڈالر
(۱۳ ارب ۵۰ کروڑ روپے) کا انعام کھنڈے بعض خوشحال
گھرانوں نے ٹکٹوں کے زیادہ حصے خریدے تھے، چنانچہ
انہیں رقم بھی زیادہ آئی۔ وہ زیادہ سے زیادہ ۵۸ لاکھ ۲۰ ہزار
ڈالر تھی۔ جبکہ گھر غریب گھرانوں کو بھی ایک لاکھ ۲۰ ہزار ڈالر
(ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپے) حاصل ہوئے۔

آج بھی قصبے کے مکین مسرت سے سنااتے ہیں کہ جب
انہیں انعام ملنے کی خوش خبری ملی، تو وہ کہاں تھے اور انہوں
نے کس قسم کے رد عمل کا اظہار کیا۔ بعض لوگ بتاتے ہیں کہ

وہ ٹکٹ نہیں لینا چاہتے تھے مگر بے، بیٹی یا چچا، ماموں نے
انہیں رقم ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر احسان اور دینا سدراری کے ناقابل فراموش
واقعات بھی دیکھنے کو ملے۔ ہوم میکز ایسوسی ایشن کی سربراہ
ماری کارمن کی بیٹی کا خاندان ہیر وزگار تھا۔ چنانچہ وہ خاصی مالی
تنگی میں وقت گزار رہے تھے۔ بیٹی نے ماری سے کہا ”ابھی
اس کے پاس پیسے نہیں لیکن تم ٹکٹ میں میرا حصہ محفوظ کرلو۔
میں بعد میں رقم دے دوں گی۔“

جب بھی قصبے والوں کا انعام نکلا، تو سبکی آرزوہ ہو گئی
کیونکہ اس نے ابھی تک اپنے حصے کی رقم ادا نہیں کی تھی۔ لہذا
اُسے یقین تھا کہ ماری نے اس کا حصہ محفوظ رکھا ہوگا۔
مگر ایک موموم امید کے سہارے وہ اپنی دوست کے پاس
پچھنی اور شرمندی کے عالم میں اس سے پوچھا ”کیا تم نے
میرا حصہ محفوظ رکھا تھا؟“

ماری نے ہاں میں سر ہلایا، تو سبکی پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی۔ یہ بھولی سے انسان دوستی اور محبت کی جیت۔ ماری
چاہتی، تو باسانی اس کے حصے پر قہر کر سکتی تھی، لیکن اس نے
دولت پر دیانت اور دوستی کو ترجیح دی۔ بعد ازاں پتا چلا کہ
بیٹی نے ۲ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے جیتے ہیں۔

دولت آتے ہی سودیتو کے دیہاتیوں کو ایک پریشانی کا
بھی سامنا کرنا پڑا۔ بینکار، کاربن فروخت کرنے والوں کے
بمقابلہ سودیتو کے دیہاتیوں کو ایک پریشانی کا
بھی سامنا کرنا پڑا۔ بینکار، کاربن فروخت کرنے والوں کے
بمقابلہ سودیتو کے دیہاتیوں کو ایک پریشانی کا
بھی سامنا کرنا پڑا۔ بینکار، کاربن فروخت کرنے والوں کے

لیکن سودیتو کے رہائشی قسبی کاربن یا فلاحی سامان
خریدنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہ ہی وہ بینکوں میں رقم
ذخیرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ چھپر پھاڑ کر
آنے والی دولت سے نئی زمینیں خریدیں اور انہیں کھیتی باڑی
سے زرخیز بنائیں۔ وہ اپنی سادہ اور روایتی کو بھی سمجھ سے
نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ماری کارمن کہتی ہے ”ہم پہلے
دروازوں کو تالا لگائے بغیر سوتے تھے۔ لیکن شاید ہم اس

سہولت سے محروم ہو جائیں۔“
پائلا سرن گاؤں کا ایک کسان ہے۔ وہ دولت پر ایک
اور پہلو سے بھی خوش ہے۔ اُسے امید ہے کہ اب کئی نسل
گاؤں ہی میں قیام کرے گی۔ دراصل دیہاتیوں کے
بچے بینکوں کو گاؤں کی تعلیمی و چکا چوند سے عاری زندگی پسند
نہیں، چنانچہ وہ رفتہ رفتہ شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ لیکن
اب پائلا کو یقین ہے کہ یہ سلسلہ ختم جائے گا۔

اکلوتا بد قسمت مکین

سودیتو سے آدھ میل کے فاصلے پر ایک گودام میں ایک
یونانی فلم ساز، کوش مشکوسن مقیم ہے۔ وہ ایک دو شیروہ کی
محبت میں گاؤں پہنچا تھا۔ لیکن وہ دو شیروہ چند ماہ بعد کی اور
نوجوان کے ساتھ بارسلونا چلی گئی۔ تاہم کوش گاؤں ہی میں
مقیم رہا۔ دراصل وہ تیز رفتار شہری زندگی سے اکتا کر کئی
دیہہ میں رہنا چاہتا تھا۔

نچانے کیوں ہوم میکز ایسوسی ایشن کے اہل کاروں
نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ سودیتو کا واحد مکین بن
گیا جس کا انعام نہیں نکلا۔ اس بد قسمتی پر وہ اُداس تو ہے،
لیکن پھر بھی اُسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔

اس نے سودیتو آنے کے بعد خاصی زمین خرید لی تھی۔
اب وہ چھ زمین فروخت کرنا چاہتا تھا تاہم گھر بنانے کی
خاطر رقم قلم سکے۔ مگر اُسے خریداری نہیں ملنے تھے۔ لیکن
لائری کھنڈے کے دو دن بعد ایک دیہاتی نے اس سے رابطہ کیا
اور بتایا کہ وہ زمین خریدنے کے لیے تیار ہے۔ شام کو ایک
اور دیہاتی نے بھی پیش کش کر دی۔ لیکن مکشس نے اپنی
زمین کی بولی نہیں لگائی اور پہلے خریداری کو فروخت کر دی۔
وہ کہتا ہے:

”اس گاؤں کے باشندے
سچائی اور مسرت پر مبنی و ایشیا شکی
دولت سے مالا مال ہیں اور میں
ہرگز نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے
بیسال بدی کے بیج بوئے جائیں



جنوری ۲۰۱۲ء کی بات ہے، آسٹریلیو شہر،
پرتھ میں بھارت اور آسٹریلیا کے مابین
تیسرا ٹیسٹ کھیلا جا رہا تھا۔ میچ کے تیسرے
دن کھیل ختم ہونے پر جب بھارتی کپتان،
مہندر سنگھ دھونی اپنے کمرے میں پہنچا، تو اس نے دروازہ
اُپر گھٹکتے کھولے رکھا۔ وہ حیات رنجیٹی ہوئی میٹھی ہوا
سانس کا کرایہ ۲۰۰ روڈالر (۱۸ ہزار روپے) روزانہ ہے۔
۲ گھنٹے بعد ٹیم کے دورکن اتفاقاً وہاں سے گزرے۔
انہوں نے کپتان کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا، تو

ریافت کیا کہ کیا کوئی مہمان آنے والا ہے؟ دھونی بولا
”آسٹریلیویوں نے ہمیں مسلسل تیسرے ٹیسٹ میں بار کا مزہ
پکھلیا ہے۔ میں سب کھلاڑیوں کا انتظار کر رہا تھا تاکہ جو
گندھج گیا ہے، وہ صاف کیا جاسکے۔“

دونوں کھلاڑیوں نے یہ بات سنی، تو بہانہ بنا کر وہاں
سے کھسک گئے۔ دوسروں نے بھی شکست خوردہ کپتان کے
کمرے کا رخ نہ کیا۔ دراصل وہ آئی پی ایل (انڈین پرنسپل
لیگ) کی ہونے والی بنیادی کے متعلق سوچ رہے تھے جو کہ
۱۴ فروری ۲۰۱۲ء کو بنگلور میں ہونے والی تھی۔

یہ ۲۰۰۸ء کی بات ہے جب آئی پی ایل کے تحت
۲۰ مقابلے بھارت میں شروع ہوئے۔ ان کا مقصد
بھارتیوں کو تفریح فراہم کرنا تھا۔ یہ مقابلے بھارت ہی نہیں
غیر ممالک میں بھی مقبول ہوئے۔ ساتھ ساتھ
ارب و کھرب پیسوں نے آئی پی ایل کی سرپرستی کی، تو اس پر
حقیقتاً حیرت برسنے لگا۔ لیکن دولت کی یہی برسات بھارت
میں ٹیسٹ کرکٹ کا خاتمہ بھی کر سکتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ بھارتی کرکٹ کے نامی گرامی ستاروں کی
ساری توجہ اب آئی پی ایل پر مرکوز ہے۔ وہ اسی کے میچ
کھیلتے ہوئے اپنی تمام تر محنت و توانائی خرچ کرتے ہیں۔
وجہ یہی ہے کہ یہ میچ کھیل کر انہیں بھاری بھر کم معاوضہ ملتا
ہے۔ چنانچہ اب وہ خفیہ طور پر اسی کے خوابوں میں مست
رہتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا، کھلاڑی ملک و قوم کا سفر سے بلند

کرنے کی خاطر کھیلتے اور جی توڑ کر مخالفین کا مقابلہ کرتے۔
لیکن اب کم از کم بھارتی کھلاڑیوں کا سطح نظر زیادہ سے
زیادہ دولت کماتا بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اور
آسٹریلیا سے ٹیسٹ ہارنے کے باوجود انہوں نے ضمیر پر بوجھ
محسوس نہ کیا اور میڈیا کے سامنے ہنستے مسکراتے رہے۔ لیکن
بھارتی عوام اور میڈیا بھی بے وقوف نہیں اور ان کے سامنے
بھارتی کرکٹروں کی خفیہ زندگیاں رفتہ رفتہ سامنے آ رہی ہیں۔

مثال کے طور پر پچھلے سال بھارتی کرکٹ کے
ستاروں ۳۰ رسالہ دھونی اور ۳۸ رسالہ یکن ٹنڈولکر نے
آئی پی ایل میچ کھیل کر نو، نو کروڑ روپے کمائے۔ دھونی
چینا سے سپر کنکٹر نسیم سے وابستہ تھا جبکہ ٹنڈولکر ممبئی انڈینز کی
طرف سے کھیلا۔ جبکہ ۳۰ رسالہ گوتم گھمبیر نے کلکتہ نائنٹ
رائڈرز کی کپتانی کر کے ۱۱ کروڑ روپے حاصل کیے۔

یہ رقم ان رقمات سے ”۵ گنا“ زیادہ ہے جو ۲۰۱۱ء
میں تینوں کھلاڑیوں نے تمام ٹیسٹ، ایک روزہ مقابلے اور
ٹی ۲۰ میچ کھیل کر اپنے کرکٹ بورڈ سے پائی۔ بورڈ کی
کنڈیکری اے میں شامل کھلاڑیوں کو سالانہ ایک کروڑ روپے
ملتے ہیں۔ جبکہ وہ فی ٹیسٹ ۷ لاکھ روپے، فی ایک روزہ میچ
۳ لاکھ روپے اور فی ٹی ۲۰ مقابلہ ۲ لاکھ روپے کماتے ہیں۔
۲۰۱۱ء میں صرف ۲ کھلاڑیوں نے ۱۵ ٹیسٹ اور ۲۵ ایک
روزہ مقابلے کھیلے اور یوں سوادو کروڑ کمائے۔

لیکن یہ رقم نامور کرکٹ کھلاڑیوں کے لیے تھوڑی
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ قومی کرکٹ ٹیم میں شامل نہ
ہوں، تب بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آئی پی ایل سے
وہ خوب کمائی کر لیتے ہیں۔ مثلاً ۲۹ رسالہ یوسف پٹھان نے
پچھلے سال ایک بھی ٹیسٹ نہیں کھیلا، مگر آئی پی ایل مقابلے
کھیل کر ۱۰ کروڑ کمالیے۔ اسی طرح ۲۶ رسالہ روبن اٹھاپا
نے ابھی تک کوئی ٹیسٹ نہیں کھیلا، مگر ۲۰۱۱ء میں آئی پی ایل
کھیل کر ۱۰ کروڑ روپے حاصل کیے۔

ان اعداد و شمار سے عیاں ہے کہ جو تنظیم تفریحی پہلو
سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی، اس نے بھارتی کرکٹروں کی
نگاہوں میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ایک
انڈیا ٹائمز اپریل ۲۰۱۲ء ۱۲۱

ہزاروں سال پرانی تاریخ رکھنے والا
حسراں کا اکیلا شاہسوار



گل داؤدی

اس پھول کی
اوٹیاں ۵ ہزار
سے زائد اقسام
پائی جاتی ہیں

نئی سرشید اعوان

”پنٹھی مون“ کا مجموعہ ہے۔ ان الفاظ کے معنی ”سونا“ اور ”پھول“ کے ہیں۔ اس پھول کا آبائی وطن چین ہے۔ ابتدائی صورت میں پھول کا رنگ سنہرا زرد تھا۔ اس لیے چین میں اسے (The Golden Seal) یعنی ”طلاتی ہبر“ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

گل داؤدی گزشتہ اڑھائی ہزار سال سے انسان کا ہمال ہم نشین ہے۔ پھولوں کی کاشت کے متعلق معروف کتاب ”گلابی“ کے مصنف چوہدری خورشید محمد کے مطابق اس دلفریب و دلربا پھول کا آرزو نام گل داؤدی ۲۱ الفاظ کا مجموعہ ہے جو فارسی اور عبرانی زبان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہماری تحقیق کے مطابق لفظ گل فارسی زبان کا ہے جو کہ آرزو میں استعمال ہے جبکہ داؤدی عبرانی زبان کے بجائے چینی زبان کا ہے۔ کنفیئٹس کے دور میں عصر لاؤزے کی مشہور زمانہ کتاب کا عنوان تاؤ-ئی-چنگ یا تھوڑے سے تلفظ کے فرق سے داؤدی جنگ جس کے معنی

داؤدی کا نام لیتے ہی آنکھوں کے سامنے رنگارنگ چھٹی پتھوں پر مشتمل خوشنما اور دیدہ زیب پھول منظر آتے ہیں۔ ان رنگ برنگ اور تہ بہ تہ پتوں کے حامل پھولوں کو دیکھ کر ہم فطرت کی حسن کاری پر اس آس کر اٹھتے ہیں۔ گل داؤدی جسے مشرق کا زرو پھلا پھول کہتے ہیں، ہزار سال پرانی تاریخ کا حامل ہے۔ یہ مشرق کا مغربی ممالک کے لیے ایک نفیس خوشہ شمار ہوتا ہے۔ اس کی کاشت انسانی نفاست پسندی اور حسن شناسی کی دلیل ہے۔

ریسٹس اس پھول کو نباتات کی بین الاقوامی زبان میں ”کر سنٹم“ (Chrysanthemum)، اردو اور فارسی میں گل داؤدی، عربی میں باسوم، سنہری میں دو چرخ گل اور ریسنکرت میں ”سسیا“ کہتے ہیں۔ انگریزی لفظ ”کر سنٹم“ لاطینی کے ۲۱ الفاظ ”کرانی ساس“ اور

گل

انٹومن گائیکارو مشہور سابق کوچ ہیں۔ زرے رفعت کے جدید رجحان کے متعلق ان کا کہنا ہے ”اب تو سلیکٹ بھی جانتے ہیں کہ کھلاڑی کم سے کم وقت میں زیادہ کمائی کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا ٹیسٹ ہارنے پر کسی کی پیشانی پر تل نہیں پڑتے۔“

آئی بی ایل مقابلے بہر حال بدترجیح بھارتی کرکٹ ٹیم کو زوال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ان مقابلوں کے بعد کھلاڑی اتنے تنگ جاتے ہیں کہ وہ پھر قومی ٹیم میں کھیلنا پسند نہیں کرتے۔ ۲۰۱۱ء کے عالمی کپ کے دوران کوئم سمبیر زخمی ہو گیا لیکن وہ آئی بی ایل کے تمام میچ کھیلے۔ بعد ازاں وہ برطانیہ میں صرف ۲ ٹیسٹ کھیلے اور پھر وطن واپس چلا آیا۔

۲۰۱۱ء کا عالمی کپ جیتنے کے بعد بھارتی کرکٹ ٹیم عروج کی بلندیوں پر چا پہنچی لیکن زوال بھی سرعت سے آیا۔ انگلے چین میں برطانیہ میں اسے خوب مار پڑی اور وہ چاروں ٹیسٹ ہار گئی۔ ذلت کا یہ سفر آسٹریلیا میں بھی جاری رہا۔ چاروں ٹیسٹوں میں ان کی بری طرح درگت بنی۔ یوں جوان مردوں کی ٹیم راتوں رات گئی کوچوں میں کھیلنے والے نا تجربے کار کھلاڑیوں میں تبدیل ہو گئی۔ باہر نئے ان عبرت ناک شکستوں کا ذمہ دار آئی بی ایل کو بھی ٹھہرایا کیونکہ ملک وقوم کے بجائے کھلاڑی اسے ترجیح دے گئے ہیں۔

بھارتی ٹیم کی عزت ٹٹی، تو باہمی اختلافات نمایاں ہونے لگے۔ پہلے دھونی ساتھیوں سے مشورہ کرنا تھا، اب اس نے بعض کھلاڑیوں سے بات چیت کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اب یہ نظریے جنم لے چکا کہ وریندر سہواگ نیا ٹیکان ہو گا۔ چنانچہ ناراض کھلاڑی اس کے گرد جمع ہیں۔ یوں ٹیم میں گردہ بازی پیدا ہو گئی جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

بھارتی اخبارات میں یہ خبر بھی آ رہی ہے کہ دھونی جلد ٹیسٹ کرکٹ سے ریٹائر ہو جائے گا۔ پھر وہ صرف ایک روزہ مقابلے اور ٹی-۲۰ کھیلے گا۔ بھارتی قومی کرکٹ کی حالت زار سے تو یہ بھی کہ ہے کہ مستقبل میں دوران ٹیسٹ کمزور کھلاڑیوں کی ٹیم میں میدان قومی کرکٹ کی۔ حقیقت آئی بی ایل ایسا جن ہے جو بھارتی ٹیسٹ کرکٹ کو کھاجائے گا۔

انداز کے مطابق آئی بی ایل کی مایت پونے چار بار ڈالر (۳۳۵) روپے) ہے۔ چنانچہ بھارتی کرکٹ بورڈ اس کے سامنے نئے بچے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

دنیا میں آسٹریلیوی کرکٹ بورڈ اپنے کھلاڑیوں کو سب سے زیادہ معاوضہ دیتا ہے۔ اس کی ٹیکیری اسے میں شامل کھلاڑی ۷۰ کروڑ روپے تک کمایں ہیں جبکہ برطانوی بورڈ اپنے بہترین کھلاڑیوں کو ۳ کروڑ روپے سالانہ دیتا ہے۔ وہاں ٹیلی ٹیکیریوں کے کھلاڑی بھی ایک کروڑ روپے سالانہ کمایں ہیں۔ جبکہ بھارتی کرکٹ بورڈ ٹیکیری سی میں شامل اپنے کھلاڑیوں کو ۲۵ لاکھ روپے سالانہ دیتا ہے۔ اب بھارتی کھلاڑیوں کے لیے یہ کوئی بڑی رقم نہیں۔

مثال کے طور پر ۲۳ سالہ آیش یادو سی ٹیکیری میں شامل ہے۔ لیکن پچھلے سال وہ دہلی ڈیئر ڈیلز کی طرف سے آئی بی ایل کھلا، تو آئی بی ایل اسے ۳ کروڑ روپے کی خلیہ رقم حاصل ہوئی۔ چونکہ آسٹریلیا میں یادو نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا لہذا آمدہ آئی بی ایل میں اس کی مالک بڑھ گئی۔ ابی صورت حال میں وہ کا کہے جو بھارتی کرکٹ بورڈ سے لوگائے گا؟ جبکہ آئی بی ایل سے گلیر، شرت اور دولت وابستہ ہے؟

اب تو یہ حال ہو چکا کہ بھارتی کرکٹ بورڈ بھی اپنے اخراجات پورے کرنے کی خاطر آئی بی ایل کا ہاتھ ہے۔ پچھلے سال بورڈ کو ۱۶ کروڑ روپے کی آمد ہوئی۔ اس میں سے ۹ کروڑ روپے اسے ٹیسٹ رینٹل آئی بی ایل سے ملے۔ حتیٰ کہ دی وی ٹیلیز اور اشتہاری کمپنیاں بھی آئی بی ایل ہیچون کو ترجیح دینے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر پچھلے سال بھارت، برطانیہ کرکٹ ٹیم آئی ایس بی این شار سپورٹس نے دکھا کر اشتہارات کے ذریعے ۱۰۰ کروڑ روپے کمائے۔ ۲۰۱۱ء میں سی بی ٹی بیس نے آئی بی ایل ہیچون دکھا کر بذریعہ اشتہارات ۹۰۰ کروڑ روپے کھرے کیے۔ بھارت اور دیگر ممالک میں کرکٹوں لوگ ٹی وی پر آئی بی ایل ہیچون سے جبکہ بھارتی قومی کرکٹ ٹیم کے مقابلے اتنے ذوق و شوق سے نہیں دیکھے جاتے۔

جاپان کا سب سے بڑا قومی اعزاز نشان گل داؤدی ہے

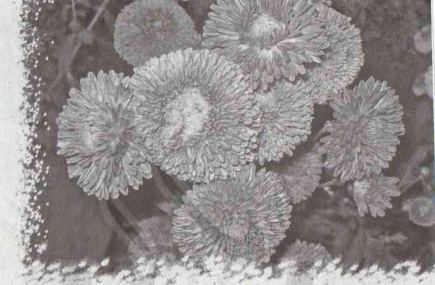
راہرٹ فارچون نے اسی سلسلہ میں جاپان کا دوسرا سفر کیا اور وہاں سے بھی تمام اعلیٰ اقسام انجی کر کے انگلستان روانہ کیے اور اسی سفر کے دوران وہ راجہ ملکہ عدم ہوا۔ برصغیر امریکا میں گل داؤدی کب اور کس طرح پہنچا، اس کا کوئی تاریخی احوال دستیاب نہیں۔ البتہ ۱۸۲۷ء میں فلپ ڈیٹا میں اس کی پہلی نمائش منعقد ہوئی۔ امریکا میں اس پھول کی نئی نئی اقسام پیدا کرنے میں والکوت کا نام قابل ذکر ہے۔ ۱۸۸۰ء میں جان تھورپ نے مغزو رنگوں پر مشتمل اس کی چند نایاب اقسام پیدا کیں جن کی تصویر کشی کسی ادیب نے کبھی اس طرح کی جیسے کوئی سبز بری، لیکن اور منور فانوس اٹھائے رقصاں ہو یا جیسے کوئی نازک اندام ہتھیلیوں پر گھومتی ہوئی خوب رنگ طعتری رکے مسکرا رہی ہو۔ امریکا میں اس طرز کا ایک پھول مسز پلفنس ہارڈی نے ۱۸۸۸ء میں پیدا کیا جو ۱۵۰۰ امریکی ڈالر میں فروخت ہوا۔

طب اور ادب کی مختلف کتب سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ گل داؤدی یورپ سے بہت پہلے ایران اور برصغیر میں پہنچ چکا تھا۔ خزان الادویہ میں نسخہ سیدی کے حوالے سے گل داؤدی کی شناخت اور خواص کے حوالے سے

سنوارے کھسارے اور نت سے رنگ اختراع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہرین نباتات کے مطابق گل داؤدی جنگلی کی ۲۲ اقسام گل داؤدی ہندی اور گل داؤدی چینی آج کے گل داؤدی کے آبا، واجداد میں شمار ہوتی ہیں۔ گل داؤدی ہندی اپنی خوبصورت بناوٹ اور نیم دائرہ پتیوں کی بدولت عہد قدیم سے لے کر جدید تک کا دل پسند پھول ہے۔ آج بھی یہ اپنی اصل شکل صورت میں سنوارے کھسارے اور نت سے رنگ اختراع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہرین نباتات کے مطابق گل داؤدی جنگلی کی ۲۲ اقسام گل داؤدی ہندی اور گل داؤدی چینی آج کے گل داؤدی کے آبا، واجداد میں شمار ہوتی ہیں۔ گل داؤدی ہندی اپنی خوبصورت بناوٹ اور نیم دائرہ پتیوں کی بدولت عہد قدیم سے لے کر جدید تک کا دل پسند پھول ہے۔ آج بھی یہ اپنی اصل شکل صورت میں

سنوارے کھسارے اور نت سے رنگ اختراع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہرین نباتات کے مطابق گل داؤدی جنگلی کی ۲۲ اقسام گل داؤدی ہندی اور گل داؤدی چینی آج کے گل داؤدی کے آبا، واجداد میں شمار ہوتی ہیں۔ گل داؤدی ہندی اپنی خوبصورت بناوٹ اور نیم دائرہ پتیوں کی بدولت عہد قدیم سے لے کر جدید تک کا دل پسند پھول ہے۔ آج بھی یہ اپنی اصل شکل صورت میں سنوارے کھسارے اور نت سے رنگ اختراع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہرین نباتات کے مطابق گل داؤدی جنگلی کی ۲۲ اقسام گل داؤدی ہندی اور گل داؤدی چینی آج کے گل داؤدی کے آبا، واجداد میں شمار ہوتی ہیں۔ گل داؤدی ہندی اپنی خوبصورت بناوٹ اور نیم دائرہ پتیوں کی بدولت عہد قدیم سے لے کر جدید تک کا دل پسند پھول ہے۔ آج بھی یہ اپنی اصل شکل صورت میں

سنوارے کھسارے اور نت سے رنگ اختراع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہرین نباتات کے مطابق گل داؤدی جنگلی کی ۲۲ اقسام گل داؤدی ہندی اور گل داؤدی چینی آج کے گل داؤدی کے آبا، واجداد میں شمار ہوتی ہیں۔ گل داؤدی ہندی اپنی خوبصورت بناوٹ اور نیم دائرہ پتیوں کی بدولت عہد قدیم سے لے کر جدید تک کا دل پسند پھول ہے۔ آج بھی یہ اپنی اصل شکل صورت میں سنوارے کھسارے اور نت سے رنگ اختراع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہرین نباتات کے مطابق گل داؤدی جنگلی کی ۲۲ اقسام گل داؤدی ہندی اور گل داؤدی چینی آج کے گل داؤدی کے آبا، واجداد میں شمار ہوتی ہیں۔ گل داؤدی ہندی اپنی خوبصورت بناوٹ اور نیم دائرہ پتیوں کی بدولت عہد قدیم سے لے کر جدید تک کا دل پسند پھول ہے۔ آج بھی یہ اپنی اصل شکل صورت میں



”باگ کا گنگ“ اور ”پانی پنگ“ کے درمیانی علاقے میں درحقیقت یہ ہندوستان کا پودا نہیں بلکہ سویڈن کے مشہور سائنسدان لائیڈ نے غلط فہمی کی بنا پر گل داؤدی کی اس بنیادی قسم کو ہندی یعنی انڈیم کا غلط نام دے دیا تھا۔ بعد کے سائنسدانوں نے لائیڈ کی غلط فہمی کو صحیح کر کے اس کا نام گل داؤدی جاپانی یعنی ”کرسمس جاپوینا“ تجویز کیا۔ گل داؤدی چینی اکبری پتیوں والا سفید رنگ کا پھول ہے۔ اس کا ذکر تاگم عہد حکومت یعنی (۱۶۱۸ء تا ۱۶۹۲ء) کے ادب اور شاعری میں بار بار ملتا ہے۔ درحقیقت یہ پہلے گل داؤدی سے بہت بعد کی پیداوار ہے۔ تاگم عہد حکومت کے بانی نے اس کی نئی نئی انواع پیدا کرنے میں باغبانوں کی دل کھول سرپرستی کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے آبائی شہر ژونگ شان کی کے شاؤن ٹاؤن کا نام بدل کر ”جوژیان“ (Ju-Xian) یعنی ”گل داؤدی کا شہر“ رکھ دیا گیا۔

موسم خزاں میں جب باغ باغوں کی فضا اجڑے اور بکھرے لگتی ہے تو گل داؤدی کا پودا گل افروز ہو کر انجمن آرا ہوتا ہے۔ راہرو خزاں کا اکلا شاسو ارا پنا پھر ابرے نہ لگتے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے تنہائی عزت نشینی اور

چین، جاپان، مغولیا اور کوریا میں اس کی جنگلی اقسام پائی جاتی ہیں۔ شہرہ آفاق فلسفی ”کنیوشس“ نے اسے ۵۰۰ سال مسیح میں جنگلی کی پہنائیوں سے نکال کر باغ کی زینت بنایا۔ اب یہ دنیا کے تقریباً ہر قابل ذکر باغ میں رونق افروز ہے اس ہمہ جہت اور دلربا پھول دینے والے پودے کا ذکر چین کی قدیم رسم اور چینی مظلوم کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ کنیوشس سے لے کر اب تک اسے

تفصیل درج ہے۔ گل داؤدی مزاجا گرم و خشک ہے۔ گردہ و مثانہ کی ریاچ کو تحلیل کرتا ہے۔ گردہ و مثانہ کی پتھری کو نکالتا ہے۔ سبک گردہ و مثانہ کو توڑ کر نکلنے کے لیے اس کا سفوف یا جوشانہ بنا کر دیتے ہیں۔ اس کا لیپ بلغمی درموں کو تحلیل اور رزموں کو خشک کرتا ہے۔ اس کی سفید چنگی قسم کا جوشانہ نزلہ زکام میں مفید سمجھا جاتا ہے۔ اس کے چند ایک مضارثات بھی ہیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نسخہ سیدی تقریباً ۳۰۰ سال پرانا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن دھونی کا یہ شاہکار پھول اٹھارویں صدی سے قبل برصغیر میں موجود تھا۔ ہومیو پیتھی طریقہ علاج میں گل داؤدی سے بنی ادویات اعصابی نظام میں بے سکوئی، دانت، موڑھے اور جڑے کی ہڈی میں شدید درد کے لیے برس برس سے مستعمل ہیں۔

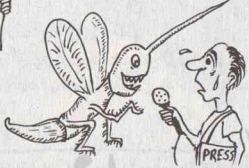
گل داؤدی کئی بیماریوں کے علاج کے طور پر بھی اکیسیر ہے

اس وقت دنیا میں اس پھول کی تقریباً ہزار سے زائد اقسام موجود ہیں۔ پاکستان میں موجود اقسام میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔ نیم دہرے داؤدی، چاک داماں داؤدی، سنگھ داؤدی، گولا داؤدی، لینگے دار داؤدی، معکوس داؤدی، آفتابی داؤدی، چینی اور جاپانی داؤدی اور کڑا داؤدی وغیرہ۔ پاکستان میں گل داؤدی کے شائقین کی تعداد کسی بھی دوسرے ملک سے کم نہیں۔ حد درجہ سختی اور ذوقِ سلیم کے حامل حاجی مہتاب دین مرحوم نے مسز وی ایچ بولہ کی کوٹھی ڈپوس روڈ لاہور میں بہت سی نئی اقسام بچوں سے تیار کیں جس پر ۱۹۱۱ء میں انھیں تمغہ حسن کارکردگی دیا گیا۔ اس کے علاوہ سفید پالوں والی ایک قسم ۱۹۲۳ء میں پیدا کی جس پر وہ انعام کے شوق منہرے۔ چوہدری چراغ دین مرحوم نے

نے ڈاکٹر فیلر کی کوشی پر اندر کی طرف خمیدہ چوڑی پر لٹا والے پیلے رنگ کے علاوہ سفید برش نما پھول پیدا کیے چوہدری محمد دین مرحوم نے لاہور ہائی کورٹ کے باغ میں سیٹی رنگ کا پھول پیدا کر کے ڈاکٹر حسین حاصل کی۔ اس فن کے حوالہ سے چوہدری محمد دین مرحوم اور چوہدری خدا بخش مرحوم کا ذکر خالی از و پسینہ نہ ہوگا کہ جنھوں نے ”سادو“ نام کا بیج دار پتھرزیوں والا پیلے رنگ کا نما پھول تیار کیا۔

پاکستان میں ہر سال ماہ نومبر کے آخر پر گل داؤدی کی نمائش کراچی، اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد، ملتان اور پشاور میں گزشتہ کئی سالوں سے باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہے جس میں شائقین و ناظرین کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے۔ مقابلہ میں شریک کھانوں کو اول، دوم اور سوم

پنجاب حکومت نے نصاب میں شامل کیا۔ جہاں اتنی عزت ملے وہاں سے ہم کیسے جائیں



Bobby

عمران سہیل بوبی کی تازہ پہلجہ ٹریاں

حکومت پنجاب نے اچھے غبروں سے پاس ہونے والے طالب علموں میں ”لیپ ٹاپ“ تقسیم کرے۔ (ایک خبر)



فہر دار! آئندہ سے ”ل“ سے لوٹا نہیں، لیپ ٹاپ پڑھنا ہے

مریم جمیلہ

اور ایک رنگ ہیں۔

این مسیری شمل

☆ مذہب کی تاریخ میں جسے ”پیغمبرانہ“ انداز کا تجربہ کہا جاتا ہے، اقبال اُس کی بہترین مثال تھے۔

فقیر سید وحید الدین

☆ اقبال کی شخصیت بہت عظیم المرتبت تھی۔ لیکن اُن کی ذاتی زندگی مرد درویش و قلندر کے مانند تھی۔ سیدی سادھی معاشرت، کوئی تصنع نہیں، کسی شہر کا کر دفر نہیں۔ مکان کے در و دیوار آرائش سے عاری۔ ہر شخص ان تک بغیر کسی دشواری کے پہنچ سکتا تھا۔ آرائش اور نمائش کی طرف اُن کی نظر ہی نہیں جاتی تھی۔ ان کی زندگی ایک صابر اور متوکل مسلمان کی زندگی اور ان کا عمل ان کے فکر و نظر کا نمونہ تھا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

☆ اقبال کو اس بات سے چڑھتی کہ شاعری یا کوئی اور فن افادیت و مقصدیت اور زندگی کی تعمیر و تہذیب سے عاری ہو۔

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

☆ علامہ اقبال کے ہاں فکر و تحقیق کی پیش کش، اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت پُر تاثیر اسلوب میں ہوتی ہے۔ خاص طور پر فارسی زبان میں علامہ اقبال نے غیر معمولی ذہانت و فطانت کا اظہار کیا ہے۔

فیض احمد فیض

☆ جہاں تک شاعری میں حساسیت، زبان پر عبور اور غنائیت کا تعلق ہے، ہم تو اُن (اقبال) کے خاک پا بھی نہیں۔ اگر علامہ شوکت مزمع کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جائے تو ہمارا کوئی شک نہ رہتا۔

شورش شامییری

☆ لوگ جوں جوں کلام اقبال سمجھتے جائیں گے، ان میں فراتِ زیت سے مردانہ وار گزرنے کا حوصلہ اور صلاحیت پیدا ہوتی چل جائے گی۔

☆ اقبال کو پاکستان سے متحدہ کردیں تو پاکستان ذہانت ملی کے اعتبار سے محض ایک بظان رہ جاتا ہے۔

☆ اقبال نے روحانی و جہولانی، ظرافت و سلامت، تجربہ و تشبیل، آواز و طریق، استدلال و اشارات اور تخلیق و فن کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ مجھے اُن کے ساحر ہونے کا یقین ہو گیا۔

☆ اقبال نے بلاشبہ کروڑوں انسانوں کو بالواسطہ اور بالواسطہ سنا کر کیا اور شاید پوری تاریخِ انسانی میں اس لحاظ سے اتنا بڑا شاعر کوئی نہیں۔

عرفان صدیقی (انڈیا)

☆ اقبال کے ہاں تاریخی، مذہبی، اساطیری حوالے، تعبیرات اور استعارے بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ اقبال کو سمجھنے کے لیے ہمیں لغت سے زیادہ انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت پڑتی ہے۔

☆ اقبال زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ زبان سے ان کا بڑا اجتہادی رشتہ تھا بلکہ کہیں کہیں تو بڑا باغیانہ رشتہ ہو جاتا ہے۔

☆ عشق کو آپ پرانے حوالے سے پڑھنا چاہیں گے تو اقبال آپ پر کھلیں گے یہ نہیں۔ اقبال نے بہت سے شعری کلیدی الفاظ استعمال کیے لیکن ان میں دوسرا رنگ اور معنویت بھردی ہے۔ اس معنویت کی تلاش اقبال کی تفہیم میں ایک بڑا کام ہے۔

سید اقبال عظیم

☆ اقبال کو اُردو شاعری کی معراج سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ تمام شعراء میں سے صرف ایک کا

انتخاب کرو تو بلاشبہ اقبال کا دامن تمام لوں کا، اس لیے کہ اقبال نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، وہ ہمارے پورے سرمایہ شاعری پر بھاری ہے۔

نشمی الرحمن فاروقی

☆ اقبال کے کلام کی ایک طرح سے بنیادی یا زیریں لہر یہی سوال ہے کہ کائنات میں انسان کا کردار کیا ہے اور کائنات سے انسان کا رشتہ کیا ہے؟ اس کی انہیں بہت فکر ہے اور وہ اس کے بارے میں بہت سوچتے ہیں اور بہت پوچھتے رہتے ہیں۔ خود سے بھی، اللہ سے بھی، تمام لوگوں سے بھی۔ خود کائنات سے سوال کرتے ہیں اور غالباً پہلی بار اتنا آجاستہ، اتنا سوال اور استفسار اُردو کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی

☆ نظم ”طلوع اسلام“ میں اتنے پھیلے ہوئے مواد کو سمیٹ کر ایک منظم ہیئت مرتب کرنا اور شروع سے آخر تک بنیادی تحلیل کو مسلسل ترقی دینا نہ صرف ایک غیر معمولی ذہنی استعداد کا ثبوت ہے بلکہ زبردست جذبہ فنی کا نشان ہے۔ اس میں فکر کی وسعت اور فن کی بلوغت اپنے عروج پر ہے۔ یقیناً یہ ایک الہامی کیفیت کا سرچشمہ ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد

☆ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے فرد کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہوئے اسے ایک ایسا دلول عطا کیا جس کے بل بوتے پر وہ سامراج سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کر سکتا تھا۔ انہوں نے ماضی کی قوت سے حال کا مقابلہ کرنے کی تدبیر کی۔

ڈاکٹر صفدر محمود

☆ علامہ سے محبت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے فلسفہ، تاریخ و حدیث، عربی، فارسی اور تاریخ اسلام پر گہری نظر ضروری ہے۔

حباوید ہاشمی

☆ دیکھا تو یہی دیکھا کہ جو اقبال کے حرم میں گرفتار ہو جائے، اُسے اپنی منزل چرخِ نیلی قام سے پرے نظر آتی ہے۔

ہارون رشید

☆ اقبال ایک آدمی بھی نہیں، فقط ایک ادارہ بھی نہیں۔ اقبال ایک حیرت کدہ ہے، تاریخ میں جس کی کوئی دوسری نظیر نہیں۔ اس جہان میں جو داخل ہوا، عمرِ عمر اسی کا ہو رہا۔

☆ اُردو شاعری کے ہاتھ میں بھیک مانگنے کا کشکول اور آواز میں خونخوہی کی جگہ، وہ (اقبال) شعر کے رقی پر ابھرے، امید، ایمان اور عزم کی مٹھل تھامے، چالیس برس اُس نے اُردو ادب کے دھندلے میدانوں کو روشنی سے بھر دیا۔ انسان کی پوری تاریخ میں کوئی شاعر ایسا نہ تھا جس نے سیاسی، لسانی اور فکری اعتبار سے کسی معاشرے کو اتنی گہرائی اور وسعت میں متاثر کیا ہو۔ اُردو زبان کے تیوری اُس نے بدل ڈالے، اُس کا لسانی لہرِ دراندہ ہو گیا۔

محمد حسین گوہر

☆ اقبال نے اُردو شاعری کو فکری اور ذوقی یقین دیا۔ اقبال کی شاعری کی ہمدی، حیاتِ آفرینی، فعالیت و عملی امکانات، انقلابی حیاتِ آفرینی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اُن کا فلسفہ خودی فرکو کو اپنی شخصیت کی تکمیل پر آمادہ کرتا ہے اور اُسے سماجی مقاصد سے ہم آہنگ انجمنِ آرائی کے کام میں لاتا ہے۔

☆ اقبال نریشہ میں ثبت ایک نہیں ہے، آئندہ کے لیے ایک امکان اور بنیاد کا زندہ و جاوید نشان ہے۔

☆ عقل پر وجدان کو، ہے روحِ عبادت پر مذہبی جبر ہے کہ روایتِ مذہبی پر ہم کو اور تسلیم و رضا پر تشہیر کی طلب اور شوقِ فرداں کو اقبال جو ترجیح دیتے ہیں

۱۳۴ اُردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۳ء

☆ اقبال کی فنی مہارت و چابکدستی اور بلبلِ منظر کشی و سماں بندی کے حالات و واقعات کی تصویر نگاہوں میں پھر جائے اور قاتلِ حال اور جنتِ بغیر بن جائے۔

☆ اقبال اپنی تدریسی و قیدی بھی، درون بینی اور بالغ نظری سے ملکوں، تہذیبوں، مذہبوں اور قوموں کی روح میں اتر جاتے ہیں اور پھر اپنا ذاتی مشاہدہ اور صداقت کا تجربہ و تجزیہ شعر و نثر کے پردوں کی آڑ میں ہو ہو سانسے رکھ دیتے ہیں۔

سعیم صدیقی

☆ وہ وقت جسے مذہب قرار دے کر شعر و فن کی محفلوں سے نکال دیا گیا تھا اُسے اقبال ایک پُر عظمت تحریک کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے کر ایوانِ سخن میں داخل ہوئے۔

☆ اقبال نے دلوں اور دماغوں پر نہایت ہی گہرا اثر اس لیے ڈالا کہ ملت نے اپنے سفرِ جستجو میں اُس کے شعاعی نوا کو بہترین قندیل پایا ہے۔ ان کے یہاں ہمیں اپنی بھری ہوئی ہستی کا سراغ ملتا ہے۔ ہم کیا تھے؟ کیا ہو گئے؟ اور ہمیں کیا ہونا چاہیے؟ کون سے عقائد و تصورات ہمارے لیے روح کی حیثیت رکھتے ہیں؟ ہمارا ڈھانچہ کن اصولوں، قدروں اور روایتوں سے بنتا ہے؟ ہماری زندگیوں کا اعلیٰ ترین مشن کیا ہے؟ ہمارے انسانِ مطلوب کے وجود کا کیا پس؟ ان سوالوں کا اقبال کے یہاں واضح جواب ملتا ہے یا کم از کم جواب تک پہنچنے کے لیے واضح اشارے ملتے ہیں۔

☆ اقبال نے اسلام کی روشن صداقتوں کو شعر میں اس شان سے سمجھا کر شعریت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا بلکہ شعریت اور زبانِ گھر کی جن کے ناک اور زیادہ کو نیلے ہو کر دلوں میں تازہ ہو گئے۔

رشید احمد صدیقی

☆ معلوم ہوتا ہے جسے شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں اپنی ساری آزمائشیں ختم کر دی ہوں اور اُن کے

اُردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۳ء ۱۳۵



یہ پھانسی میری

خوش قسمتی ہوگی

کسی کا لے فتون سے نہیں

جیل میں قید سابق امیر جماعت اسلامی بنگلہ دیش کا
بہادر آدمی کے دل سوزی سے کہے الفاظ ہیں

پروفیسر اعظم

اپنے عوام کے نام خط، جو ایک بوڑھے
اُردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے بطور خاص

بنگلہ دیش

کی حکومت ملک کو سیکلر بنانے کے لیے ملک کی اسلامی جماعتوں کو کا اعدام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس گناہوں کے مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے نہ صرف آئین سے اسلامی دفعات نکالی جا رہی ہیں بلکہ ملک بھر سے جماعت اسلامی کے سرکردہ راہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان کے خلاف ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء کے قانون کے تحت مقدمات قائم کیے جا رہے ہیں۔ اس کا لے سامنے پیش ہونے سے قبل انہوں نے اپنی قوم کے نام ایک تحریری بیان لکھوایا۔ یہ ایک ایسے بوڑھے بہادر اور جی دار راہنما کی باتیں ہیں جنہیں آنے والے دنوں میں حکومت چھائی کے گھات چڑھانے کا پختہ ارادہ کیے ہوئے ہے۔ ”جنگل کے قانون“ کے تحت ایک تفتیشی ادارے نے میرے خلاف ۱۲ الزامات تیار کیے ہیں۔ ان الزامات کے تحت مجھے ۹۰ سال کا بوڑھے کو جو خود سے نماز کے لیے مسجد بھی نہیں جا سکتا، جیل بھیجا جا رہا ہے۔ میں جیل سے نہیں ڈرتا۔ پہلے ۱۲ بار جیل کاٹ چکا ہوں۔ مجھ سے مقدمے جھگڑا نہیں سکتے۔ میں اللہ کے سوا کسی سے ڈرتا نہیں۔ میں شہید ہونے کی تمنا لے کر ہی اسلامی تحریک میں شامل ہوا تھا۔

اب اگر اس جھوٹے مقدمے میں مجھے چھائی پر بھی لٹکا دیا گیا تو مجھے شہادت کا درجہ ملے گا، جو یقیناً میرے لیے خوش قسمتی کا باعث ہوگا۔ اگر عمر سید کی اپنا بیویوں کی بھرمار کے ساتھ جیل میں میرا وقت کس طرح گزرے گا، اس کو میں اپنے اللہ پر چھوڑتا ہوں۔ آپ لوگوں کو یاد ہوگا کہ ۱۱ برس پہلے یعنی ۲۰۰۰ء میں رضا کارانہ طور پر جماعت اسلامی کے امیر کی ذمہ داری سے از خود فراغت لینے کے بعد میں نے بھی سیاسی بیان نہیں دیا لیکن گزشتہ کچھ دنوں سے میرے خلاف میڈیا میں جو جھوٹا، بے بنیاد اور من گھڑت پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں چھائی کو سامنے لانے کے لیے مجھے کچھ کرنا چاہیے۔

شانہ بشارت جمہوریت کے لیے جدوجہد کی۔ بنگلہ دیش کی خدمت آج تک کر رہا ہوں۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ نے ہماری کامیابی حاصل کی تو اکثریتی جماعت کو اقتدار منتقل کرنے کا مطالبہ کیا۔ صدر پاکستان اور شیخ مجیب الرحمن کے مذاکرات کی حمایت کی۔ فوجی آپریشن ہونے سے مذاکرات کا کامیابی کا علم ہوا۔ عوامی لیگ کی ساری قیادت اور ارکان پارلیمنٹ نے بھارت جا کر پناہ لی۔ سر شیخ مجیب الرحمن نے خود کو پاک آرمی کے حوالے کر دیا، وہ کیوں بھارت نہیں گئے، اس کی وضاحت آج تک سامنے نہیں آئی۔ جنگی جرائم کی سزا پانے والے ۱۹۵۵ء بھروسوں کو تو مذاکرات کے نتیجے میں معاف کر دیا گیا اور شیخ مجیب نے کبھی بھی کسی سولین کو جنگی مجرم قرار نہیں دیا، جبکہ آج

میں ۱۹۲۲ء میں لکشی بازار ڈھاکا میں اپنے نضیال میں پیدا ہوا اور پہلی جماعت سے ایم اے سیاسیات تک ساری تعلیم ڈھاکا میں حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء میں لگاتار ۲ بار ڈھاکا یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ یونین کا جنرل سیکریٹری منتخب ہوا۔ میں نے بنگلہ دیشی عوام کی بہتری کے لیے ساری زندگی سیاسی جدوجہد کی۔ بنگلہ زبان کو بھی پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دلانے کی تحریک کی قیادت کی اور ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۵ء میں ۲ مرتبہ گرفتار ہوا۔ میں نے متحدہ پاکستان میں ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک تمام جمہوری تحریکوں میں حصہ لیا۔ پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ، کمانڈنٹ انویشن پارٹیز، ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شیخ مجیب الرحمن اور دوسرے سیاسی راہنماؤں کے

حکومت ان کو جنگ کی مجسم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے جن کے خلاف سرے سے الزام لگائے ہی نہیں گئے تھے

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا

راست فکر کر کر مل امام بعض قوتوں کو نافرمانی برداشت ہو چکے تھے

امیر حسین

”اللہ کسی پر اس کی طاقت سے بڑھ کر جو مجھ نہیں ڈالتا“، کرمل امام کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اپنے انخوا کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بڑے امتحان سے ڈالا۔ ابراہیم خاں اور بنی خاںوں میں اسیری کے دوران بہت ہی تنہا اور کڑے امتحان سے بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ گزرنے والے ۶۷ سالہ جواں بہت کرمل امام نے دہشت ناک ماحول میں جس دلیرانہ انداز میں موت کو گلے لگایا، غیر معمولی استقامت اور جواں مردی کا یہ خوبصورت انسانی اداؤں اب لوک داستانوں اور دیوالیائی قصوں کہانیوں کا موضوع بن چکا۔ کرمل امام نے قبولیت کے کسی خاص لمحے میں آرزو کی تھی ”اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب فرمائیں اور وہ بھی دھڑلے کے ساتھ“ اللہ تعالیٰ نے اُن کی آرزو قبول فرمائی اور انہیں اس زبردست شہادت میں جس کا نظارہ پوری دنیا نے میڈیا پر دیکھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے ”میری قبر کا بھی لوگوں کو پتا نہیں ہوگا۔“ اللہ تعالیٰ نے اُن کا یہ کہنا بھی قبول فرمایا۔ ستارہ شجاعت و تمہد بسانت کرمل امام نے اپنی جوانی کے ۴۰ سالہ پاک فوج کی نذر کیے تھے۔ کیا ۴۰ سالہ پری محیط جہاد افغانستان میں کرمل امام کا کوئی مقام تھا؟ ہر سو پھیلی کھری ہے کسی کی گھٹا ٹوپ میں ایسے تھے ہی سوال کم ہیں۔

۴۰ برس کے بعد حکومت اُن لوگوں کو جنگی جرم ثابت کرنے کی سرچشموں کر رہی ہے جن لوگوں کے خلاف اُس وقت کسی قسم کے جرم کے الزامات ہی نہیں لگائے گئے تھے اور نہ ہی انہیں گرفتار کیا گیا۔

ہنگلہ دیش بنانے میں، بھارت نے جو کردار ادا کیا، اس میں بھارت کے نقطہ نظر سے بھارتی فوج کے کردار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بھارت خود بھی اس بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہنگلہ دیش کی آزادی کا حصول بھارت کا مہونہ منت ہے۔ اس سلسلے میں بھارت کا کہنا ہے کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج نے بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، ہنگالیوں کے سامنے نہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ خود ”ہنگلہ دیش فریڈم فائرڈ“ کی اعلیٰ قیادت جنرل جتینی کو بھی ہتھیار ڈالنے کی تقریب میں آنے سے روک دیا گیا۔ اسے وہاں پہنچنے ہی نہیں دیا گیا۔ تقریباً ایک لاکھ جنگی قیدیوں کو ہنگلہ دیش میں رکھنے کے بجائے بھارت میں لے جا کر رکھا گیا اور پاکستانی فوج کا اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان انڈین آرمی لوٹ کر لے گئی، حالانکہ یہ سب کچھ پاکستان اور بعد ازاں ہنگلہ دیش کا اٹھا تھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بھارت نے پورے ملک میں لوٹ مار کی۔ ہنگلہ دیش ریلوے کا سامان لوٹ کے اسے کھولنا کر دیا۔ یہاں تک کہ ڈھاکا یونیورسٹی کے ہالوں (Halls) کا سامان تک بھارت نے لوٹ لیا۔ اصل میں بھارت ۱۹۷۱ء کی جنگ میں، ہنگلہ دیش کی آزادی کے لیے نہیں کودا تھا، بلکہ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کو الگ کر کے، اپنے سب سے بڑے دشمن پاکستان کو کمزور اور

(ترجمہ: اے این جہاں/این جیو)

پاکستانی فوج نے بھارتی فوج کے سامنے
ہتھیار ڈالے تھے، ہنگالیوں کے سامنے نہیں

بین الاقوامی

کردار کے باعث اسلامی جہادی قوتوں کے غیر متنازع نمائندہ تصور کیے جاتے تھے۔ وہ افغانستان میں امریکا اور نیٹو افواج کے خلاف برسرِ پیکار طالبان کے حق میں واحد مؤثر آواز تھے۔

علامہ طاہر محمود اشرفی نے بالکل صحیح کہا ہے ”کرگل امام سیاح بالوں سے سفید بال ہونے تک جہاد افغانستان پر امریکی حملے کے بعد واپس پاکستان آئے تو اپنی تمام صلاحیتیں افغانستان سے غیر ملکی فوجوں کے انخلاء اور خطے میں قیام امن کے لیے وقف کردیں۔ اس سلسلے میں وہ قوی اور یقین والا قومی میڈیا پر اپنے نقطہ نظر کا بڑے کھلے انداز میں اظہار کرتے تھے۔ مارچ ۲۰۱۰ء میں شمالی وزیرستان روانگی سے قبل انہوں نے ”طالبان“ کے عنوان سے ایک رپورٹ تیار کر کے جنرل مرزا اسلم بیگ کے حوالے کی۔ اس میں طالبان کے تاریخی پس منظر، افغان معاشرت پر ان کے اثرات اور مستقبل میں ان کے کردار پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا گیا تھا۔

انہوں نے ”مستقبل کا منظر نامہ“ کے عنوان سے لکھا: ”غیر معمولی قیادت، اعلیٰ درجے کی مقصدیت اور عوام کی غیر شرط حمایت جیسے اہم بنیادی عوامل کے باعث طالبان کی شکست کا کوئی امکان نہیں۔ اگرچہ ۳۰ سالہ جنگ نے بہت سے لیڈر منظر سے غائب کر دیے چنانچہ آج ملٹا مچھر عجمہ جہادی کو سب سے زیادہ عوامی حمایت حاصل ہے۔ افغانستان میں امن اور خوشحالی کے جذبے سے سرشار، بے لوث اور بہادر ملٹا مچھر مناسب موقع پر چلک کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے قابلِ اعتماد سابق ساتھیوں کی بات سننے کو تیار ہیں۔ ۲۵ جنوری ۲۰۱۰ء کو مجھے ملنے والے ایک پیغام میں انہوں نے تمام دوستوں کو امن مذاکرات میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے کہا ہے۔ (کرگل امام سے کہا گیا تھا کہ وہ آجھ، دس معاملہ فہم

۱۴۰ انڈوڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

حضرات، جہاں دیدہ اکابرین اور زیرک ماہرین کا گروہ تشکیل دے کر اپنے دس نکاتی ایجنڈے پر، جو حتمی بھی ہے اور قابلِ عمل بھی، کام شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں پہلا قدم لویا جرگہ اور عبوری حکومت کا قیام ہوگا۔ ۲۳ مارچ ۲۰۱۰ء کو شہادت کے المناک سانحہ پر پٹ بننے والے سفر سے قبل کرگل امام اور خالد خوجاہی نے جنرل مرزا اسلم بیگ کے گھر ان سے ملاقات کی۔ ۲۶ مارچ کو یوں سے شمالی وزیرستان جاتے ہوئے انہوں نے اپنے جانے کے بعد کرگل امام ۳۰ ستمبر تک لشکرِ تحکوی نامی تنظیم کے قبضے میں رہے جو ایشین ٹانکر، اسلامک ٹانکر اور پوٹالی طالبان کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس گروہ کی تحویل میں کرگل امام کی ۳ ویڈیو مختلف اوقات میں جاری کی گئیں۔ یہ گروپ وقفہ وقفہ سے نیٹو فون اور ای میل کے ذریعے ان کے خاندان سے رابطہ کرتا رہا۔ اپنے مطالبات جلد پورے نہ ہونے کی صورت میں خالد خوجاہی کی شہادت جیسے نتیجے کی جھمکا دیات۔



اس گروہ نے کرگل امام کی رہائی کے بدلے مختلف پاکستانی بیلیوں میں قید ۱۶۰ افراد کی رہائی کا مطالبہ کیا اور یہ دھمکی بھی دی ”ہم کرگل امام کو ان ملکوں کے حوالے کردیں گے جنہیں وہ مطلوب ہیں۔“ اور یہ بھی ”پڑوسی ملکوں نے ڈالروں کے حساب سے کرگل امام کو خریدنے کے لیے رقم لگائی ہے۔“ اب اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ خالد خوجاہی کی شہادت کے بعد جو جرگے کرگل امام کو نقصان نہ پہنچانے کی ضمانت کے حوالے سے

اے، ان میں حکیم اللہ محمود کیوں شامل ہوتا تھا؟ برطانوی صحافی اسد قریشی کی رہائی کے بدلے ہماری ۱۶۰ کی تقسیم پر لشکرِ تحکوی میں اختلاف ہوا تو صابر محمود نے خٹان پختی اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ جبکہ حکیم اللہ محمود گروہ نے ۳۰ ستمبر کو صابر محمود اور اس کے ساتھیوں کی اور کرگل امام اپنے قبضے میں لیے۔ اس کے بعد وہ شہادت تک انہی کے پاس رہے۔ اس عرصے میں گروہ نے نہ تو ان کی کوئی ویڈیو جاری کی اور نہ ہی کرگل صاحب کے خاندان سے کوئی رابطہ یا مطالبہ کیا۔ شروع کے تقریباً ۳ مہینے کے دوران گروہ کرگل امام کے حوالے سے خاموش رہا اور کسی رابطے کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ اسی گروہ کے قبضے میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امین کی اب تک ۱۰ ویڈیو جاری کی جا چکی۔

اکتوبر کے آخری تہتے کرگل امام کا پہلا اور آخری ٹیلی فون اپنے گھر آیا۔ دراصل وہ جنرل بیگ کا ٹیلی فون نمبر



اُن کی رہائی کے بدلے ۱۶۰ افراد کی رہائی اور ۲ کروڑ روپے مانگے گئے

لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے بیٹے سے بات کی اور کہا ”جنرل بیگ، جلال الدین خانی کے بھائی حاجی ابراہیم سے بات کریں اور وہ انہیں (خوفا کاروں کو) سمجھائیں کہ میں یہاں دشمن کی حیثیت سے نہیں آتا تھا میری رہائی کے تبادلے میں یا کسی اور شرط کے بدلے نہیں ہونی چاہیے۔“ کرگل امام کی جنرل بیگ سے بھی بات ہوئی۔

کرگل امام کا خاندان قوی سلامتی کے اداروں سمیت ایسے تمام لوگوں سے مسلسل رابطے میں رہا جو ان کی وادعت میں مدد کر سکتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے بھی مدد مانگی جن کی آزادی اور خود مختاری کے لیے کرگل امام نے گزشتہ تیس سال سے اپنی زندگی واؤ پر لگائی ہوئی تھی۔ وہ ان احباب تک بھی پہنچے جن کی کوششوں سے اسد قریشی کو رہائی ملی تھی۔ انہوں کا رد کرگل امام کے خاندان سے تو کوئی رابطہ نہیں تھا تاہم بعض اطلاعات کے مطابق رہائی کے بدلے تاوان کی ہماری رقم اور دیگر مطالبات پر بات چیت جاری تھی۔ پھر ۲۳ جنوری ۲۰۱۱ء کو پہلے کرگل امام کی شہادت اور ساتھ ہی عارضہ قلب کے باعث وفات کی خبر ذرائعِ ابلاغ پر آئی۔ آزاد ذرائع اس خبر کی تصدیق نہیں کر رہے تھے کہ ۱۹ جنوری کو کرگل امام کے قتل کی ویڈیو جاری کر دی گئی۔

انڈوڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء ۱۴۱

کرنل امام کی شہادت اور اس کے حرکات پر نظر ڈالیں تو بڑی حیران کن باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ مذاکرات کے دوران انھوں نے معافی کو قتل کر دیا۔ ہمیشہ کی پیغام، خبر یا ویڈیو کے ذریعے آخری تاریخ ضرور دی جاتی ہے۔ ادارہ علوم حقانیہ کے ماہنامہ ”الحق“ نے سچ لکھا ہے ”کرنل امام کے پسپانگان تاوان کی بھاری رقم دینے سے قاصر رہے کیونکہ ان کے باپ کا دامن بہت چھوٹا تھا۔ اُس میں کرپشن، حرام کی کمائی اور جہاد افغانستان کے لیے اربوں ڈالروں کا حصہ نہیں شامل تھا۔“ تاہم انھوں نے کوئی رقم ضرور مل جاتی کیونکہ کرنل امام کا خاندان، اپنا سب کچھ بیچنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ پھر ایسا کیوں ہوا.....؟“

حکیم اللہ محمود نے کرنل امام کی شہادت کے موقع پر خود موجود ہونا ضروری سمجھا۔ خود ساختہ الزامات پر مبنی فرد جرم پیش کی۔ ۱۴ برس لگے، بے بس قیدی کو اپنی موجودگی میں اپنے ہتھیار سے نہایت سفاکانہ طریقے سے قتل کر کے نعشے لٹوائے اور اس تمام عمل کی تفصیلی ویڈیو بنوا کر پوری دنیا کو دکھائی۔ یہی نہیں بلکہ میت بھی حوالے نہیں کی اور اس کے بدلے ۲ کروڑ روپے نیز اپنے آدمیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ یہ سب کچھ انتہائی غیر معمولی ہے اور حیران کن بھی۔ بظاہر لگتی تو یہ انتہائی درجے کی انتقامی کارروائی ہے، جو کلک و صورت سے افغان مجاہد دیکھنے، سننے بولنے، سمجھنے، ہر قسم کے ہتھیار چلانے کی مہارت رکھنے والے اور قیادت کے اعلیٰ اوصاف سے آراستہ، افغان جہاد کے ہر ویرکرمل امام سے روکاری گئی۔ معاملات اس سچ اور انتہا تک کیوں اور کیسے پہنچے؟ کیا مادیوں کے کئی اہم رازوں کے انہیں کرنل امام کو پاکستان کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا گیا جو انہوں نے انکار کر دیا؟ یا پھر انتہائی باؤ اور تشدد کے باوجود کرنل امام نے اس انفرادی بے باک و فرد جرم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جیسا خالد خلیفہ سے اقراری بیان ریکارڈ کیا گیا تھا۔

دراصل اپنی راست فکر اور پختہ صالح کردار کے

کرنل امام بڑے عزم اور حوصلے سے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے قریب ۳ افراد، ایک حکیم اللہ محمود، دوسرا ناعلم شخص اور تیسرا نقاب پوش کھڑے ہیں۔ حکیم اللہ محمود نقاب پوش سے مخاطب ہوا، تو کرنل امام اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ حکیم اللہ محمود اپنا ہتھیار نقاب پوش کو دیتا ہے جو ان سے تقریباً چار سے پانچ فٹ دور کھڑا ہے۔ غیر ہموار پتھریلی زمین پر رہنے پاؤں کھڑے کرنل امام ایک لمبے کے لیے بائیں طرف ہوتے ہوئے سیدھے چٹان کی طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ نہایت اطمینان سے اپنی آستین سیدھی کرتے ہوئے قاتل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں۔ کبھی نقاب پوش قاتل ان پر فائر کھول دیتا ہے۔

بہادر کرنل امام سیدتانے پہاڑ کی مانند کھڑے تھے۔ انہوں نے انتہائی دلیری سے ۱۲ گولیوں کا سامنا کیا۔ تیسری گولی ان کی پیشانی پر لگی اور وہ گر گئے۔ ان حالت میں جب موت ان کے سامنے ہے، اس مرد مومن نے دُشمن دُشمنوں سے زندگی کی بجائے نام کی بجائے کھڑے ہوئے اللہ اکبر پکارتے ہوئے ایسی عمر میں جام شہادت نوش کیا جو میدان جنگ میں رہنے کی نہیں تھی۔

ان کی شہادت نے بہت سے دلوں کو گرما دیا اور



چٹان کی طرح سیدھے کھڑے کرنل کے سینے پر قاتل نے ۲ گولیاں چلا لیں

مجاہدوں کی طرح زندہ رہنے اور بہادری کی طرح موت کو گلے لگانے کی اہمک پیدا کر دی۔ مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر جس نے بھی یہ ویڈیو دیکھی، وہ کرنل کی موت کا سامنا کرنے والی دلیرانہ ادا کو خراجِ حسین پیش کے بغیر نہ رہ سکا۔ فلسفۂ جہاد کے ایک مخالف نے راولپنڈی کی ایک محفل میں جب یہ فلم دیکھی تو کہا ”میں فیض احمد فیض کا ایک شعر اکثر پڑھتا، لکھتا اور سناتا تو رہا مگر اس کی عملی تفسیر یہ ویڈیو دیکھ کر سمجھ آئی۔ کرنل امام کے قتل عمل سے شدید اختلاف کے باوجود میں دعوے سے کہہ رہا ہوں کہ فیض نے کرنل امام کے بارے میں ہی کہا تھا:

جس دُشمن کے کوئی دلیرانہ نہ کیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آتی جاتی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں
اس محفل میں موجود ایک دانشور نے قسم اٹھا کر کہا کہ
فیض ایک بڑا شاعر تھا، لیکن میں نے جو وہ اس کا کوئی شعر
بلکہ مصرع اپنی کسی تحریر میں لکھا نہ بولا، نہ کسی لکچر میں
شایا۔ یہ ویڈیو دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ کرنل امام!

قتل گاہوں سے چن کر ”تمہارے“ علم
اور انگلیں گے عشاق کے قافلے
ساتھ ہی وہ بے قابو ہو کر ہزارم سے زمین پر گر
پڑے۔

ایک ہفتے میں

۱۰۰ ڈرامے

عروسیم پندرہ



خواتین کے رسائل میں چھپنے والی تحسیریوں میں گہرائی کہاں تھی جواب ڈراما لکھنے والیوں کے ہاں اب ملتی کسی ایک بھی ڈرامے میں پاکستانی افسدرا کا ذکر نہیں، صرف گیسرا اور تعسقات کی بد صورتی ہی تو گل دینا نہیں

سید امتیاز علی تاج نے زمانہ طالب علمی میں اورانا انا کھلی لکھ ڈالا تھا۔ انھیں خود بھی یہ قطعاً شائبہ نہ تھا کہ مستقبل میں وہ اس پائے کی کوئی اور چیز بھی تصنیف کر پائیں گے یا نہیں۔ اہل نگاہ کے نزدیک وہ اس ڈرامے سے شہرت کی بلندی پر ایسے پہنچے کہ دوبارہ اس کام کے لیے فرصت ہی نہ نکال پائے یا ممکن ہے انھوں نے اسی شاہکار کو ہی غنیمت جانا۔ وقت زمانے کی قید سے نکلا، علم وفنون کی ترقی نے تصنیف، شج سے نکل کر ریڈیو اور ٹی وی کی ہاں میں ہاں ملائی اور ڈراما سازی پوری صنعت کی شکل اختیار کر گئی۔ پاکستانی ڈراموں نے نہ صرف پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں اپنی بحیثیت اور اہمیت متواہی اور خصوصاً ماضی میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ اسی لیے اب یہ شعبہ سب سے زیادہ منفعت بخش کاروبار بن گیا ہے۔ کبھی زمانہ تھا اشتقاق احمد، باقود سہ، احمد اسلام احمد، امیر ندیم سید، یونس جاوید، ذوالنظر طارق عزیز، انور سجاد، مرزا ابراہیم بیگ، حیدر مہمن کے ڈرامے آتے تھے اور ملک ہی نہیں ملک سے باہر بھی اکٹیں پسند کیا جاتا تھا۔ پاکستانی ڈرامے انڈیا کے پونا انٹرنیٹ ٹیٹ تک میں دکھائے اور پڑھائے جاتے تھے۔ عہد محرف نے ڈرامے کے ایک اور طرح کا رخ عطا کیا اور عروج پر موجود ڈراما نہ صرف لکھنے والے بڑے ناموں سے محروم ہوا بلکہ نئے لکھنے والے اور خصوصاً خواتین کے رسائل کی افسانہ نگاروں کے ڈرامے جو اکثر انہی کے ناموں اور افسانوں پر مبنی اور کسی بڑی سوچ اور پیغام سے محروم تھے۔ اس نئے دور میں صرف عیرہ احمد کا نام سامنے آیا، باقی سب مصنفین نے مارکیٹ کی ڈیمانڈ اور بھارت میں چلنے والے سیریل اور سوپ کی نقل میں اپنی پوری روایات کو طاق میں دھک دیا۔

ماضی

وہ یوں کو اچا کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ پورا خاندان ایک ساتھ بیٹھ کر ڈرامے سے محفوظ ہوتا۔ حتیٰ کہ بھارت تک میں وہ ڈرامے دیکھے اور پسند کیے جاتے۔ جس طرح ہر چیز کے مثبت اور منفی پہلو ہوتے ہیں، اس طرح ٹی وی منفی پہلو رکھتا تھا لیکن بحیثیت مجموعی اُسے پسندیدگی سے دیکھا جاتا۔ لوگوں کے لیے شام دھلتے ہی یہ تفریح کا سامان مہیا کرنا تھا۔ ٹی وی اس حوالے سے اپنی خصوصی پہچان رکھتا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب سکرین پر بہن اور بیٹی کے سر سے دوپٹا نہیں اترتا تھا۔ عہد محرف میں جدیدیت اور روشن خیالی کے نام پر وقت نے ایسی ہمدردی کر دی کہ پہلے بہن اور بیٹی کے سر سے دوپٹا اترتا اور پھر ماں کے سر سے اچھل غائب ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ ماں اور بیٹی کے کردار میں پہچان سے قاصر ہونے لگے کہ ماں کون ہے اور بیٹی کون؟ دونوں ہی اپنے اپنے معاملات میں مصروف دکھائی دیتے لگیں۔

اہل دانش نے اس تبدیلی کے پیچھے کئی محرکات گنوائے ہیں۔ کوئی جمہوری آرموں کو قصور وار ٹھہراتا تو ہے کوئی جمہوریت پر شرب خون مارنے والے حکمرانوں کو۔ ان عوامل کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ کیا ہمارا معاشرہ اتنا ہی بے رحم ہے کہ اس کے سامنے سرخیلو رشتوں کے تقدس کو پامال و مجرد کر دیا

گیا اور وہ خاموش تماشا ہی بنا رہا۔ یہ کام باعوم سرکاری سرپرستی میں ہوا۔

ہماری معاشرتی اقدار نے ذرائع ابلاغ کے اس ذریعے سے ۱۸۰۰ درجے کا موڑ لیا اور عورت کو اس طرح موضوع بحث بنایا کہ یوں لگ رہا ہے، عورتوں کے ساتھ زیادتی دنیا میں صرف پاکستان میں ہی ہوتی ہے۔ یہاں کی ہر شادی شدہ عورت اپنے میاں سے بے وفائی پر آمادہ ہے، صرف سستی صنفی تسکین کے لیے کبھی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں، نہ کوئی اصول، نہ ضابطہ، نہ انتہائی، نہ سلیقہ، بڑے بڑے گھر، بڑے بڑے امیر اور پھر بڑی بڑی سزا میں۔ ساری قوم کو عجب عجیب عذاب میں مبتلا کر دی۔ نہ تفریح ملی نہ تشریت..... ملا تو یہ کہ معاشرے کے ڈھانچے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

اقدام خمدہ اور دیگر ذرائع ابلاغ کی رپورٹیں چشم کشا انکشافات بیان کرتی ہیں کہ عورت پر ظلم و تشدد سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں ہی ہوا رہا ہے۔ اہل مغرب کے لیے یہ خود سے ایک سوالیہ نشان ہے۔ بات گھوم گھما کر عورت پر تشدد سے شروع ہو کر پاکستانی معاشرے میں حقوق نسواں کے استحصال کا نعرہ لگا کر ختم ہوتی ہے۔ عورت کے دائرے سے نکل کر بات کی جائے تو دولت کی ہوس کو ٹھکانا کیا جا رہا ہے جو شاید پاکستان کے ایک فیصد طبقہ کا ہی معیار زندگی ہے۔ نتیجتاً معاشرے کا ہر فرد انتشار و پریشانی کا شکار نظر آتا ہے۔ چنانچہ جو ڈرامے جو کبھی تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے، اب منظر بننے کا باعث بن رہے ہیں۔

اس وقت پاکستان میں ایک ہفتے میں ۱۰۰ سے زائد

”یوں لگ رہا ہے کہ عورت کے ساتھ زیادتی دنیا بھر میں صرف پاکستان میں ہوتی ہے“

ایک زمانہ تھا جب بھارت میں پاکستانی ڈرامے پسند کیے جاتے تھے

ڈرامے بننے اور سکرین پر آتے ہیں۔ ان میں جو رنگینی اور گلیر دکھایا جاتا ہے، ان کا تعلق شاید ہی پاکستان کے ایک فیصد طبقے سے ہو۔ لیکن اس میں اسلامی و پاکستانی اقدار سر سے نظر نہیں آتی۔ پاکستانی بڑے چینلو جن میں جیو، آے آر وائی، ہم ٹی وی اور ایکسپریس ٹی وی وغیرہ ایسا معیار زندگی پر دان چڑھا رہے ہیں جو پاکستانیوں کے ہاں وجود ہی نہیں رکھتا۔ چنانچہ دولت اور شانہ طرز زندگی کی ہوس بڑھ رہی ہے۔ ابھی چینلو پر بعض ٹی وی شوز بھی دکھائے جاتے ہیں۔ ان میں بعض مکمل طور پر بھارتی اداکاروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بعض میں بھارتی اور پاکستانی شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح کے پروگراموں کی پروڈکشن دہلی میں کی جاتی ہے۔ ایسے موقع پر کئی سوال ابھرتے ہیں مثلاً ہم کیوں اپنی اقدار کو اپنے ہاتھوں ختم کر رہے ہیں؟ وہ کون سی وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے ایکٹرز وکٹ چینلوں سے یہ کام شروع کر دیا ہے؟

ایک نقطہ نگاہ یہ ہے کہ چینل کے پاس ۲۴ گھنٹہ کی نشریات پورا کرنے کا نہ سامان ہے نہ وسائل اور نہ ہی سیرت چنانچہ یہ آسان ہے کہ جو بھی ڈرامے مل رہے ہیں، سستے داموں اٹھاؤ اور یہاں دکھا دو۔ یہ سمجھنے بغیر کہ وہ کن کے لیے تھے۔

آخریاب کیوں؟

پاکستان میں باقی شعبوں کی طرح ہمارا میڈیا بھی زیادہ سے زیادہ مال بنانے کی لت کا شکار ہے۔ جہاں سے جو ملتا ہے، اسے خوش آمدید کہتا ہے۔ پاکستان کے مشہور ٹیلی ویژن چینلو جیو اور ایکسپریس نے اپنا وقت وائس آف امریکا کو فروخت کیا ہوا ہے۔ ان پر باقاعدہ ان کے طے شدہ پروگرام آتے ہیں۔ عالمی دن (انٹرنیشنل

ڈے) مثلاً ویلنٹائن ڈے، بہبود آبادی، حقوق نسواں وغیرہ کے موقع پر ملی ٹیش کمپنیز اور بڑی این جی اوز ان کو باقاعدہ اپنے پروگرام پیش کرتی ہیں۔ جیو اور ٹانمز آف اٹھیا کے مابین اس کی آتش بھی اسی لیے چلی اور ہمیں آزادی صحافت کے نام پر دکھائی جا رہی ہے۔

ڈراما سازی کی اصل صنعت اب پروڈکشن ہاؤسز ہیں۔ پاکستان میں یہ بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی باقاعدہ رجسٹریشن کا کوئی طریقہ کار نہیں، لہذا یہ شخصیات کی طرح آگ آگ آتے ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن (PTV) سمیت دیگر ڈرامے دکھانے والے چینلو ان ہی کی مرہون محنت ہیں۔ بعض چینلو تو کچھ ڈرامے خود بناتے لیکن زیادہ تر پروڈکشن ہاؤسز سے خریدے جاتے ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ان چینلوں میں مرکزی خیال اور تکنیک ایک ہی قسم کی استعمال کی جاتی ہے، جس سے معاشرے میں مزید انتشار اور پاکستانیت سے دوری کی سبب سر اٹھاتے ہیں۔ یہ ڈرامے کیسے بننے اور ان کو کس طرح چلایا جاتا ہے؟ یہ ان کے مالکان اور نوآموز پروڈیوسروں کی مرضی پر ہے۔

حد تو یہ ہے کہ آج جبکہ ہر ہفتے کم و بیش ۱۰۰ ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں، کوئی بڑا نام، کوئی بڑا پیغام، کوئی بڑی سوچ جو ملک و ملت سے جڑی ہو جو معاشرے کو بنانے ستاروں میں معاون ہو۔ ماشاء اللہ نہیں کوئی ایسا ڈراما سامنے آجائے تو آجائے۔ ڈراموں میں نہ تو کسی پاکستانی قدر کا ذکر ہے نہ اس کی ترویج کی کوشش۔ جیسا کہ بھارت کے ہر ڈرامے کا محور مرکز ہے۔ صرف گلیر اور مرد و عورت کے تعلقات کی خرابی اور بدصورتی ہی تو کل دنیا کے موضوعات نہیں۔

محبت بھری یادیں

وہ علم فضل اور
دنیاوی حیا و قسمت
کے نہیں بھرتے و مشقت،
ملیقت شعاری، جنت کشی، دل سوزی
اور خیر خواہی کے بلند معیار پر نر نہیں

تشریشی برادران کی اماں جی

فکری سوسائٹیز

ایک مثالی ماں کا محبت بھرا تذکرہ، جن کی دعاؤں نے اولاد کو شہرت، عزت اور دولت سبھی نعمتوں سے ہمکنار کیا

اُردو ڈائجسٹ جیسے خبر ساری داری بنیادیں کا فرما س عید دروح کی باتیں، جن کو رخصت ہوئے ۳۰ برس ہوئے کو آئے

کے سال ہے۔ موجودہ مشرقی پنجاب کے منتقل کرنال کے ایک گاؤں ہاڑی میں ایک شیرخوار بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔

تین چار دن گزر جاتے ہیں اور بخار اترنے کا نام نہیں لیتا۔ اسی حالت میں ایک ہفتہ گزر جاتا ہے۔ گاؤں کی بڑی بوڑھی اور سیانی عورتیں بچے کی حالت دیکھ کر کہتی ہیں: ”اے بہن! تمہارے بچے پر چچک کا حملہ شروع ہو چکا ہے۔ جب تک چچک پوری طرح نکل نہیں آئے گی اور اپنی مدت پوری کرنے کے بعد واصل نہیں جائے گی، اس تک بچہ کا بخار اترے گا نہ اسے ہوش آئے گا۔ اسے بہن! یہ بڑا موڈی، خطرناک اور تباہ کن مرض ہے۔ بچہ تمہارا دودھ پیتا ہے۔ اگر تم نے اس کی بیماری کے دوران نمک مرچ والی کوئی چٹ پٹی چیز کھائی تو اسے فوراً خارش ہو جائے گی اور اس کی بے چینی کی وجہ سے وہ ہچکا ہچکا کر اپنا جسم اور چہرہ فوج والے گا۔۔۔۔۔ اور یہ نشانات ساری عمر اس کے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر موجود رہیں گے جو اس کے چہرے کی زیناتی اور رعنائی کو ہمیشہ کے لیے داغدار کر کے رکھ دیں گے۔“

تجربے کار بزرگ خواتین کی باتیں سن کر ماں کا دل دھک دھک کر رہ جاتا ہے۔ وہ چچک کی تباہ کاریوں سے واقف ہے۔ اسے علم ہے کہ یہ مرض نہایت ہی موڈی اور جان لیوا ہے۔ اگر مریش جانیر ہو جی جائے تو اس کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ اکثر مفلون اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ چہرہ بدنامی و خوں کی وجہ سے کربہ انظرین بن جاتا ہے۔ ہاڑی ایک ایسا گاؤں ہے جہاں کوئی ڈاکٹر نہ ہے نہ طبیب۔ اسے انگریزی اور دیہی دوا کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خطرناک اور اذیت ناک مرض کی ایک طرف

یہ بے پناہ شدت اور دوسری طرف علاج و دوا کے اسباب کی ناپائی، ماں کے دل پر خوف اور وحشت طاری کر دیتی ہے اور وہ تفکرات اور دوسموں کے بھجم میں اپنے آپ کو بے بس، بے سہارا اور بے یار و مددگار پاتی ہے۔ اس

آخر کار مرض کی وہ عمرانی رات آجاتی ہے جو اس مرض میں اکثر آتی ہے۔ بچہ موت و حیات کی تکفیش میں گرفتار ہے۔ زندگی اور موت کی سرحدیں بالکل قریب آگئی ہیں۔ صرف ایک بال کا فرق ہے۔ ان لحاظ میں ماں کے دل پر جو بھتہ پھرتی رہی ہوگی، اس کا اندازہ ہر وہ

ماں کر سکتی ہے جو اپنے سینے میں اپنی اولاد کے لیے مانتا بھرا دل رکھتی ہے۔

ان نازک ترین لحاظ میں ماں سراپا التجا بن کر اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں ذمے کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی ہے اور اس کی جناب میں اسی کی رحمت کا واسطہ دے کر نہایت خشوع اور گریہ و زاری سے عرض کرتی ہے:

”اُمّی! میں تیری نہایت عاجز و بے نوا بندی ہوں۔ تیرے در کے سوا میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ میرے بچے کی صحت و سلامتی اور زندگی صرف تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو اپنی رحمت سے اسے زندگی بخش اور زندگی بھی دو جس میں تندرستی بھی ہو اور سلامتی بھی۔ میں تیری جناب میں تیری ہی عظمت اور بابرکت کتاب کو وسیلہ بناتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ اگر میرا یہ بچہ جو تیرا ہی عطا کردہ ہے، اس موڈی مرض سے صحیح اور سلامت بچ نکلا تو میں اسے تیری پاک اور سراپا رحمت کتاب کا حافظ بنائوں گی۔“

ماں کی یہ دعا دل کی گہرائیوں سے پچھاسی طرح نکلی تھی کہ رحمت خداوندی جوش میں آجاتی ہے۔ مرض کی عمرانی کیفیت ختم ہوتی ہے۔ بچہ آنکھ کھول دیتا ہے۔ ماں کی جان میں جان آجاتی ہے۔ وہ اپنی دعا کی قبولیت پر جذبہ تشکر و امتنان سے سرشار ہو کر اپنے مولائے حقیقی کے سامنے تہجد پڑھ جاتی ہے۔

وہ ماں جس نے اپنے شیرخوار بچے کی سلامتی، صحت یابی اور زندگی کی بھیک اپنے رب کے کرم سے اس کی کتاب کا واسطہ بنے کر مانگی تھی، وہ امان جی تمیں اور جس کے خالق نے اپنے محسن حقیقی سے اس کی کتاب کا حافظ بنانے کا عہد کیا تھا، وہ میں تھا۔

اماں جی علم و فضل اور نواہی جاہ و شہمت کے اس بلند مقام پر تو فرخندہ نظر تھیں جو عام طور پر اس دنیا میں عزت اور شہرت کا موجب بنتا ہے لیکن یہ بات بلاخوف تردید یہی جاسکتی ہے کہ ایک خاتون خانہ کی حیثیت سے انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت جس محنت اور مشقت، سلیقہ شعاری و جفاکشی،

میرے حفظ

کے دوران اماں جی مجھے

مختلف قسم کے بادام اور

مغزیات کے حلوے بنا کر

دیتی تھیں

دوسری و غیر خواہی اور عزیمت و استقامت سے کی وہ انہیں عظیم اور بلند ہمت خواتین کی صف میں لکھ کر کرتا ہے۔

☆☆

اماں جی ضلع مظفرنگر (پونہ) بھارت کے ایک مشہور گاؤں شاہ پور میں پیدا ہوئیں۔ محترم ماموں غلیس احمد صاحب کی روایت کے مطابق اُن کی تاریخ ولادت ۶ اپریل ۱۸۹۱ء ہے۔

ہمارے نانا جان نے اُن کا نام فردوسی بیگم رکھا۔ نانا جان سعید احمد صاحب قرآن کے حافظ اور جید عالم دین تھے۔ عربی اور فارسی پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ دینی علوم کی تکمیل مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا شریشا احمد صاحب گنگوٹی جیسے بلند پایہ اور تہذیب روزگار علما سے کی تھی۔ باطنی علوم اور روحانی فیوض مولانا غوث علی شاہ صاحب پانی پتی سے حاصل کیے، جو اپنے دور کے بلند پایہ شیخ طریقت تھے۔

نانا جی کے نزدیک انگریز کی ملازمت حرام تھی۔ ساری عمر سرکاری ملازمت سے وابستہ نہ ہوئے۔ گاہے گاہے فنی کری اور مدداری اختیار کر لیتے تھے۔ طبیعت پر استغنا اور بے نیازی اور فقر و درویشی کا ذوق غالب تھا۔ تبلیغ دین کا جوش اور ولولہ انہیں بے چین کیے رکھتا اور اس

مقتدر کی خاطر وہ دور دراز مقامات کا سفر بھی کرتے اور خدا کی رضا حاصل کرنے کی خاطر دین چھپانے کا فرض ادا کرتے۔
 تانا جان مولانا حافظ سید احمد صاحب عالم فاضل اور مبلغ دین ہونے کے ساتھ ساتھ زہد شریف عالم دار بھی تھے۔ رات کا بڑا حصہ عبادت اور ذکر الہی میں صرف ہوتا۔ کثرت ذکر سے اُن کی روحانی قوت میں ایک گوند کی مانند اور سر آفرینی پیدا ہوگئی جس کو اثر اہل الذکا خاصہ ہوتا ہے۔
 اماں جی نے بچپن ہی میں اپنے والد صاحب سے ناظرہ قرآن پڑھا اور اُنھی سے قرآن مجید کے ترجمہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُرڈو کی ایسی کتابیں پڑھیں جن میں شریعت کے احکام و مسائل بیان ہوئے تھے۔

اماں جی کے ساتھ اُن کے بڑے بھائی جناب خدوم احمد صاحب مرحوم، جناب مشتاق احمد صاحب مرحوم اور حافظ شفیق احمد مرحوم اپنے اپنے والد صاحب سے اُرڈو، عربی، فارسی اور ریاضی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سختی لکھنے کی مشق پر بہت زور دیا جاتا لیکن اماں جی کو سختی لکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اماں جی اُرڈو کی مشکل سے مشکل کتاب پڑھ اور سمجھ سکتی تھیں لیکن لکھنا انہیں بالکل نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

اماں جی کا بچپن شاہ پوری میں گزارا۔ تانا جی کے فقیرانہ مزاج کے باعث گھر میں اکثر غربت و تنگدستی کا عالم رہتا۔ لیکن اس غربت و افلاس کے ماحول نے اماں جی میں محنت و مشقت، اپنے ہاتھ سے کام کرنے اور سلیقہ کے ساتھ تھوڑی چیز سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی عادت اور صلاحیت پیدا کردی تھی۔

قرآن مجید کے مطالعہ، تانا جی کی روحانی اور اخلاقی تربیت اور گھر میں تنگدستی کے ماحول نے اماں جی میں یہ جذبہ بچپن ہی سے پیدا کر دیا تھا کہ وہ کمزوروں، ضعیفوں اور بیمار کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔ ماموں خلیق احمد کی روایت کے مطابق اماں جی اپنے محلے کی بڑی بڑی اور ضعیف عورتوں کی خدمت کر کے بے حد خوش

محسوس کرتیں۔ بوجھوں کو ہلاتیں، اُن کے سر اور کپڑے دھو کر صاف کرتیں۔ اُن کے کپڑے سی دیتیں۔ اگر کوئی خاتون غامہ بیمار ہو جاتی تو اُس کے گھر کا کام کر دیتیں۔ بیمار اور ضعیف عورتوں کے ہاتھ پاؤں دبا کر اُن کو آرام و راحت پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ اس طرح اُن کے دلوں سے نکلی ہوئی دعائیں حاصل کر کے اپنی خوشیوں میں بے پناہ اضافہ کرتیں۔ شاہ پور کے قیام کے دوران یعنی شادی تک اماں جی کا یہی طرز عمل رہا۔ اس طرح دین کی محنت کے ساتھ خدمت خلق کا شوق اُن کی طبیعت کا لازمی عنصر بن گیا۔

اماں جی کی شادی ۱۰ مئی ۱۹۰۹ء کو اُن کے تایا زاد عبدالغفار صاحب سے ہوئی۔ وہ اُس وقت ضلع حصار صوبہ پنجاب میں ٹکڑ نہر میں بطور پٹواری ملازم ہو چکے تھے۔ وہ زیادہ وقت کساد بازاری کا تھا۔ ایک مسلم نوجوان کے لیے بدل پاس کر کے سرکاری ملازمت پر آجانا اُس کی بہت بڑی خوش قسمتی تصور ہوتی تھی۔

ابابی نے تیشی کی حالت میں اپنے بھائی حاجی محمد بیٹی صاحب کے پاس ہائی ضلع حصار میں تعلیم حاصل کی۔ دادا بی عبدالحمید صاحب جو حافظ قرآن اور عربی و فارسی کے عالم تھے، اپنے پیچھے ۲ بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑ کر تھوڑی عمر ہی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

☆☆☆

۱۹۱۱ء میں والد صاحب تبدیل ہو کر منگالہ آگئے۔ منگالہ سرسہ سے ۶ میل کے فاصلے پر دریائے گھگر کے کنارے مسلمان اریٹوں کا ایک گاؤں تھا۔ اسی محلے کے خوشبودار چاولوں کی پیداوار کے لیے یہ گاؤں پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اماں جی ۳۱ سال یہاں مقیم رہیں۔ ۲ بچیاں بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

اماں جی کی پرورش یو پی میں ہوئی تھی اور منگالہ پنجاب کے اُس حصے میں تھا جسے بالڑ کہا جاتا تھا۔ دونوں علاقوں میں زبان، تہذیب، بول چال، رنگین بہن اور طرز معاشرت میں نمایاں فرق تھا۔ لیکن اماں جی نے اپنی

خدا اور صلاحیت کی بدولت اس غیر مائوس ماحول سے جلد ہی ہم آہنگی پیدا کر لی۔ گاؤں کی خواتین سے میل جول اور تعلقات کچھ اس بیچ پر استوار کیے کہ ساہا سالگرہ جانے کے باوجود اُن کی شادی اور تازگی میں کوئی کی نہ آئی۔ مجھے یاد ہے کہ تنظیم ملک یعنی ۱۹۳۷ء تک کچھ بزرگ خواتین منگالہ سے آیا کرتی تھیں۔ اماں جی ان سے بڑی محبت و شفقت سے ملتیں۔ وہ کئی کئی دن ہمارے گھر ٹھہرتیں۔ آپس میں حقیقی بہنوں کی طرح دیکھ سٹھ کی باتیں کرتیں۔ تحفہ و تحائف کا تبادلہ کرتیں۔ ہم سب بہن بھائی بھی اُن کا بے حد احترام کرتے۔

آج خیال آتا ہے کہ اماں جی کے خلوص میں کتنی شیرینی اور نرملگی کی جتنی جاذبیت اور میل جول اور تعلقات قائم کرنے کے انداز میں کتنی سادگی اور پاکیزگی تھی کہ اتنا زیادہ عمر گزر جانے کے باوجود اُن کی مہمک اور خوشبو ایسی طرح تازہ رہی۔ آج تو حال یہ ہے کہ قریب ترین خوشی رہتی بھی آٹھ سے اوصل پہاڑ اوصل کی نذر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۱۹۱۵ء میں ابابی کا تبادلہ ضلع کرنال کے گاؤں ہاڑی میں ہو گیا۔ یہ مسلمان راجپوتوں کا گاؤں تھا۔ یہاں کے باشندے علم کی روشنی سے محروم تھے لیکن تھے بڑے جفاکش اور سختی۔ زبان کے جتنی اور قول کے بکے۔ اس گاؤں میں اماں جی کا قیام ۱۲ سال رہا۔ ہم چاروں بھائیوں یعنی برادر محترم حاجی گل حسن، میری اور برادران عزیز اعجاز حسن اور الطاف حسن کی جائے پیدائش یہی گاؤں ہے۔ اس گاؤں بلکہ پورے ضلع میں جاہل و گورے رشتہ دار نہ تھا لیکن جب بچوں نے خالو کو چاروں طرف اپنا تہ تی محسوس کی۔ ہر بڑا شخص کوئی تیا تھا تو کوئی ماموں، اُن کی طرف سے ہمیشہ بزرگانہ شفقت اور عنایت کی مٹاس ہی جسے میں آئی۔ خواتین میں کوئی ماما تھی، کوئی خالہ، کوئی پوپھی تھی تو کوئی تائی۔ یہ رشتے سب زبانی تھے مگر خلوص و ایثار اور بے لوث تعلقات نے ان میں بے پناہ استحکام پیدا کر دیا تھا۔ نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے

اماں جی

صبح قرآن مجید کی تلاوت

کرتیں تو سارا گھر نورانی اور

روح پرور نغموں سے

گونج اٹھتا

باوجود اب بھی ان مخلصانہ روایت کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ہاڑی میں تعلیم کا مناسب بندوبست نہ تھا، اس لیے ۱۹۳۱ء میں ابابی تبادلہ کر کر سرسہ تشریف لے آئے اور ایک چکا مکان رہائش کے لیے خرید لیا جسے اماں جی نے بڑی محنت و مشقت سے لپ پوت کر رہائش کے قابل بنایا۔ یہاں آ کر ہم چاروں بھائیوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ برادر محترم گل حسن، ڈاکٹر اعجاز حسن اور الطاف حسن نے سرسہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں بالترتیب میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اعجاز اور الطاف میٹرک کے امتحان میں اپنے اسکول میں اول آئے۔ اس علاقے میں یہ احساس پہلی بار ابھر کر سامنے آیا کہ مسلمان طالب علم بھی اپنی محنت و ریاضت اور قیامت حاصل کر سکتے ہیں۔

میں نے ۱۹۳۵ء میں پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا تو مجھے سکول سے اٹھا کر قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے جناب قاری حافظ محمد شفیع صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا، کیونکہ اماں جی نے اپنے خدا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے حافظ قرآن بنائیں گی۔

قاری محمد شفیع صاحب، اللہ اُن کی قبر کو منور کرے اور اُسے جنت کا ایک بانچہ بنائے، نہایت خداترس، متقی اور پاکیزہ انسان تھے۔ اُن کا تعلق بائیس کے مغل خاندان سے تھا۔ پولیس میں بطور کانسٹیبل اپنے فرائض نہایت ذمہ داری اور دیانت داری سے ادا کیے اور ملازمت کے دوران میں قرآن پاک زبانی یاد کیا۔ رات کو گشت پر ہوتے تو چاند کی روشنی میں حائل شریف سے اپنا سبق یاد کرتے جاتے۔ ہیکل کانسٹیبل کے عہدے پر ترقی پا کر ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

۱۹۳۰ء میں ملازمت سے فارغ ہو کر اہل سرسکی خواہش اور اصرار پر وہاں کی عالی شان اور عظیم الشان جامع مسجد میں امامت کے فرائض سنبھال لیے۔ ساتھ ہی مسجد کی ملحقہ عمارت میں ایک مدرسہ قائم ہوا جہاں بچوں کو قرآن مجید ناظرہ پڑھانے اور حفظ کرانے کی ذمہ داری بھی قاری صاحب کے سپرد ہوئی۔

اُستاد محترم قاری محمد شفیع صاحب کو قرآن سے شغف عشق کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اُن کا سارا وقت قرآن پڑھنے یا سنتے میں گزرتا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ چشمہ فیض پوری آب و تاب سے روانہ ہوا رہا۔ ہزاروں بچوں نے ناظرہ قرآن پڑھا اور ہیکروں نے حفظ کیا۔ وہ سرسہ جہاں کی سترہ مساجد میں کوئی مقامی حافظ تراویح میں قرآن کرآنے کے لیے نہ ہوتا، اپنے خدا کے فضل اور قاری صاحب کی محبت شاقہ کی برکت سے ہر مسجد میں مقامی حافظ قرآن سنانے والا بھی موجود تھا اور سامع بھی۔

اُستاد محترم کے پاس جن خوش قسمت لوگوں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے، ان میں معلومات اور تجربے کی حد تک ان میں ۱۲ بہم خصوصیات پاتا ہوں۔ اول، انہیں قرآن مجید اچھی طرح یاد ہے۔ دوم، انہوں نے قرآن مجید سننے اور سنانے کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

قاری صاحب کے شاگردوں پر اللہ کا یہ خصوصی انعام اور یہ امتیازی اعزاز اُستاد محترم کا قرآن پاک سے

والہانہ لگاؤ اور اپنے عزیز شاگردوں کے لیے خالص دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

قرآن مجید کا حفظ کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں مسلسل پختہ داری اور سخت محنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ طالب علم کے لیے دلچسپی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ایک بچے کے لیے یہ سنگناخ اور سخت دشوار گزار وادی طے کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک مال باپ کی خصوصی محنت و اُفتاد اور اُستاد کی عمومی عنایت و شفقت ہر لمحہ اُس کے شامل حال نہ ہو۔ اُس کا ہر غمہ اور ہر ناز خندہ پیشانی اور خوشی سے برداشت نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حفظ کرنے والے بچوں کے مال باپ کا اللہ کی بارگاہ کی نہایت بلند اور ممتاز مقام ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کے ارشاد کے مطابق قرآن مجید یاد کرنے والوں اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کے مال باپ کو قیامت کے دن ایسے نورانی تاج پہنانے جائیں گے جن کی روشنی سورج کی روشنی سے بھی زیادہ خوبصورت اور منور ہوگی۔

مال باپ کو یہ انعام اسی لیے عطا ہوگا کہ انہوں نے اپنے بچے کو قرآن کا حافظ بنانے کے لیے لگاتار ایثار و قربانی اور محنت و توجہ سے کام لیا تھا۔

قرآن مجید حفظ کرنے میں مجھے ۳۳ سال کا عمر لگا۔ اس دوران اماں جی اور اباجی کی خصوصی توجہات اور نوازشات دیدنی تھیں۔ اماں جی میرے لیے مختلف قسم کے بادام اور مغزات کے طوے تیار کر کے رکھیں اور انہیں کھانے کی بار بار تاکید فرمائیں کہ میری طبیعت اُن سے بُری طرح خیر ہو چکی کی۔ انہیں جھٹکے کو بھی دل نہ چاہتا۔ میرے بہن بھائیوں کی خوب مومن بنی رہتی۔ گرمیوں کے موسم میں اباجی اپنی ملازمت کی گھنٹوں معروضیات کے باوجود میرے لیے بادام کی ٹھنڈائی خود اپنے ہاتھ سے رگڑتے اور مجھے پینے کے لیے دیتے۔ میرے لیے ان کی یہ ساری توجہ و عنایت اور سعی و کوشش قرآن پاک کی نسبت سے تھی۔

۱۹۳۷ء میں اباجی کا تبادلہ سرسہ سے ضلع کربلا کے

ایک گاؤں بھانہ میں ہو گیا۔ اباجی اکیلے ہی وہاں تشریف لے گئے لیکن چند ماہ بعد ہم سب کو وہاں جانا پڑا کیونکہ برادر مکمل حسن صاحب کو طیبہ کالج دہلی میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اب تین جگہ خرچ کا پورا کرنا محال ہو گیا تھا۔ بھانہ ہندو جانوں کا گاؤں تھا۔ آبادی تقریباً ۲۵ ہزار تھی۔ تین چار مسلمان بھی تھے جن کی حیثیت گھوٹ کی تھی۔ اباجی اس گاؤں میں منتھے سے تھرا رہے گاؤں کی مشترکہ عمارت چنچ گھر کی بالائی منزل پر رہے۔ اُن کا معمول تھا کہ تنہا اور فجر کی نماز میں قرأت بلند آواز سے کرتے۔ اس گاؤں میں کسی مسلمان فقیر کو اللہ کا نام لے کر مانگنے کی بھی اجازت نہ تھی لیکن اباجی کی قرآن خوانی میں کچھ ایکی تاثیر اور آخر فجر پنی تھی کہ کچھ دنوں ہی گاؤں کے لوگ ان کو دیتا اور ادھر جیسے الفاظ سے یاد کرنے لگے۔

ہم اماں جی کے ساتھ بھانہ پیچھے تو بارہائش کے لیے بالائی منزل کے ۲ کمرے ملے۔ ان کمرے کے دروازے بھی نہیں گتے تھے۔ ہوا کی زکات کا کوئی موثر ذریعہ نہ تھا۔ انہی دنوں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔ میں تازہ تازہ قرآن مجید ختم کر گیا تھا۔ لیکن اچھی طرح ضبط نہ تھا۔ اباجی نے تراویح کا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا۔ رمضان کا چاند نظر آتے ہی چنچ گھر کی چلی منزل کے برآمدے میں نماز باجماعت کا اہتمام ہوا۔ بارہائش کے کچھ مسلمان مزدور جو نہر پر مٹی ڈالنے کا کام کرتے تھے، رات کو اسی عمارت میں آکر ٹھہرے، وہ بھی اسی جماعت میں شریک ہوتے۔

میں سارا دن وہ سپیارہ یاد کرتا جو رات کو سنانا ہوتا۔ دو تین مرتبہ اماں جی کو سنانا۔ تراویح کی جماعت بارہائش ہونے لگی۔ دو ایک دن کے بعد کچھ لوگ تراویح کے وقت چنچ گھر کے دروازے پر آکر کھڑے ہو جاتے۔ خضر ہوا شاید یہ لوگ کچھ شہادت کرنے کی نیت سے آتے ہیں یا نماز کا سلسلہ بند کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ نماز ختم ہوتے ہی واپس چلے جاتے۔ آہستہ آہستہ اُن کی تعداد بڑھتی گئی جن میں دوسری بھی ہوتے اور عورتیں بھی، جوان بھی اور بوڑھے

اماں جی کے

سایہ رحمت سے محروم ہوتے
ہی قریشی برادران کے خاندان
پر شدید ابتلا و آزمائش کا

دور آن پڑا

بھی۔ ہجوم کتابی ہوتا خاموشی کا سناٹا طاری رہتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن سب کو گھروں سے نکال کر سردی کے موسم میں خاموش اور ساکت کھڑا کرنے والی چیز قرآن پاک کی تلاوت تھی۔ قرآن کے الفاظ میں اُن کے لیے عجیب قسم کی کشش اور جاذبیت تھی۔ یہ قرآن کا زندہ اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ انسانی قلب و روح پر ایک لطیف اور شیریں اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتے۔

رمضان بخیر تہہ گزر گیا۔ سردی نے پورا زور پکڑا۔ ٹھنک ہواؤں کے تیز و تند جھونکے چلتے گئے۔ سردی کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ جسم میں خون جتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مکان میں یہ اہمیت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے کیمپوں کو ہوا کی اس شدید لہری کی زد میں آئیں اور انہیں بخار ہو گیا۔ اباجی سرکاری امور کے سلسلے میں باہر تشریف لے گئے تھے۔ ہم سب بہن بھائی جو اماں جی کے پاس موجود تھے، اپنے کم عمری اور تہہ تجر بہ کاری کی بنا پر مصورت حال کی گنتی سے بے خبر تھے۔

اماں جی کا بخار بڑھتا گیا۔ بخار کے باوجود وہ گھر کے کام کاج میں حصہ لیتی رہیں۔ اُن پر سردی کا حملہ معمولی نہ تھا وہ سخت خطرناک تھا، چنانچہ بخار کے ساتھ

نمونہ بھی ہو گیا۔ سب بیمار دارنا تھے، نہ دوا نہ علاج۔ اللہ نے اماں جی کو بے پناہ قوت مدافعت عطا کی تھی، وہ اسی کے بل بوتے پر اس شدید اور خوفناک مرض کا مقابلہ کر کے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور گھر کی ذمے داریاں انجام دینے میں مصروف ہو گئیں۔ بخار تو جاتا رہا اور نمونیا کے درد کی شدت بھی ختم ہو گئی مگر اس کے اثرات پچھپھروں پر ایسے پڑے کہ ذمے کا مرض لاحق ہو گیا اور سانس تکلیف سے آنے لگا۔

الہامی ۱۲ مئی بعد واپس آئے اور اماں جی کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئے مگر وہاں گاؤں میں علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ تیل گاڑی پر سوار کر کے ۸ میل کے فاصلے پر پونڈری لے کر گئے۔ وہاں گھینے کے ایک عالم دین تھے جو حافظ قرآن اور قصبے کی مرکزی جامع مسجد کے خلیفہ تھے اور طبیب حاذق ہونے کی وجہ سے مریضوں کا علاج بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اماں جی کا طبی معائنہ کر کے مرض کی تشخیص کی اور بتایا کہ مرض ابھی ابتدائی سچا ہے۔ اگر علاج باقاعدہ سے کرایا گیا تو شفا کی امید ہے۔ اگر بے پروائی سے کام لیا تو یہ مرض منتقل دے کی صورت اختیار کر لے گا۔ حکیم صاحب نے ایک ہفتے کی دوا تجویز کی اور تاکید کی کہ ہر ہفتے مریض کی حالت سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ علاج شروع ہو گیا۔ میں ہر ہفتے صوبہ سے بھانے سے پیول پونڈری روانہ ہو جاتا۔ حکیم صاحب کو سارے حالات بتاتا اور وہ نسخہ تجویز کرتے۔ بازار سے دوا خرید کر دن کے تقریباً ۱۱ بجے واپس گھر آتا تھا۔ یہ معمول تقریباً ۷ ماہ جاری رہا۔ مسلسل اور باقاعدہ علاج کے باوجود مرض میں کوئی افادہ نہ ہوا۔ اُس وقت کے حالات پر غور کرنے سے سخت حیرت ہوتی ہے کہ اماں جی دم کشی کی سخت اذیت ناک تکلیف کے باوجود اپنی ذمے داریوں سے بھی غافل نہ ہوئیں۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا، بیٹوں کے لیے چارہ تیار کرنا، اگلی میں دھان چھڑنا، بچے سے آپنا پنا اور اسی قسم کے دوسرے سخت محنت و مشقت والے کام کرنا ان کا معمول تھا۔ اس

سے اُن کی غیر معمولی اور غیر معمولی قوت ارادی کا اندازہ ہوتا ہے جو ان اہل دل لوگوں کا نصیب ہوتی ہے جن کا ذکر الہی سے شاداب اور جن کی روح اللہ کے ساتھ تعلق ہے جس سے معنی و محو کی ہوتی ہے۔

بھانے میں جس مکان کے بالائی حصے میں ہمارا رہائش تھی، وہ ایک پتے کی ملکیت تھا۔ اس مکان کے زیریں حصے میں رات کے وقت اُس کے جانور بندھے تھے۔ صبح کو اُس کی گھروالی اُن کو برو غیرہ اور کر کے تھاپتی اور صفائی کرتی۔ ساتھ ہی بچے سے اماں جی کے ساتھ بات چیت کرتی جاتی۔ ایک دن خلاف معمول صبح سویرے کے بجائے دوپہر کے بعد آئی۔ اماں نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ کل میرا گھر والا باہر کسی گاؤں گیا ہوا تھا۔ دکان پر میں بیٹی تھی۔ ایک چمار کا لڑکا سودا لینے آیا تو اُس کا کپڑا میرے جسم کے کپڑوں سے چھو گیا اور اس طرح میں بھڑکت ہو گئی۔ مصیبت یہ تھی کہ گھر میں میرے سوا کوئی اور نہ تھا۔ میں گھر میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی۔ ورنہ وہ بھی گندی ہو جاتی۔ اس لیے رات کو میں نے بچہ نہیں کھلایا اور ساری رات بھوکی رہی۔ سخت سردی تھی، مگر گریز میں لیٹ سکی کیونکہ میں بھڑکت تھی۔ اگر بستر کو ہاتھ لگاتی تو وہ بھی کدھر اور ناپاک ہو جاتا۔ چنانچہ ساری رات پوری اذہر کر کپڑوں میں پڑی سردی میں ٹھٹھرتی رہی۔ صبح دن چڑھے میرا گھر والا آیا۔ وہ تو میں سے تازہ پانی لایا اور مجھے بھلا کر پاک صاف کیا۔

اب اس واقعے کو یاد کر کے بھی نمی آتی ہے اور ساتھ ہی خدا کے اس احسان کے تصور سے روح جھوم جھوم بھتی ہے کہ اُس نے اپنے آخری نبی کے ذریعے انسانیت کو کتنا سادہ، پاکیزہ اور قابلِ عمل ضابطہ حیات دیا جس میں طبقاتی تقسیم سے نہ اونچ نیچ کا تصور، غیر فطری بندش ہیں نہ ناقابلِ برداشت صعوبتیں۔ یہاں سہولتیں ہیں اور آسائشیں ہیں اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق میل ملاپ اور روابط و تعلقات کی وسیع راہیں کشادہ ہیں۔

قریباً سو سال کی مدت قیام کے بعد اماں جی کا تبادلہ بھانہ سے بھر سہرہ کے علاقے کی طرف ہو گیا۔ گاؤں سے دھانگی کے وقت بہت سی عورتیں اماں جی کو ملنے آئیں۔ ان میں وہ اچھوت زدہ خاتون بھی تھی۔ پہلے تو وہ دور کھڑی اپنا درد دل بیان کرتی رہی لیکن ٹھوڑی دیر بعد کھڑے قابو ہو کر آگے بڑھی اور اماں جی سے لگنے لگے کہ خوب دلی اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالی کہ طبیعت کو اندر سے آدھو کی بھٹی۔

☆☆

۱۹۳۹ء کے شروع میں اماں جی اور ہم سب واپس بھانہ آئے۔ گھر میں آگے۔ برادر محترم گل حسن صاحب کو ہمیں طبی تعلیم کے لیے طیبہ کالج دہلی میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہاں کی تعلیم سے خوفزدہ اور وحشت زدہ ہو کر واپس آ گئے تھے۔ وہ کساد بازاری اور مسلم نوجوانوں کے لیے ملت ہیز نگاری کا دور تھا تاہم کچھ عرصے بعد انہیں ملکہ نہر میں داخل باہوئی آسانی پر مجبور کیا۔

اماں جی کی طبیعت پر دینی اور روحانی رجحان جوانی سے لگے بچپن سے غالب تھا اور یہ سب کچھ نانا جی کی تعلیم اور تربیت کا نتیجہ تھا۔ بچہ وقت نماز کی پابندی اور باقاعدگی سے تلاوت قرآن مع ترجمہ کے اہتمام کے ساتھ سرخیز اور نوافل تنبیہ کی ادائی آن کے روزمرہ کے معمولات کا ایک اہم اور لازمی حصہ تھا۔ اُن کی خواہش رہتی تھی کہ اُن کی اولاد دینی و دینی فرائض کی پابندی کرے اور حج کے وقت نماز فجر کے بعد باقاعدگی سے قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حج کو اماں جی کا گھر قرآن مجید کی تلاوت کے روحانی اور روح پرور نغوں سے گونجنے لگا اور یہ روح افزا اور دل بہا سنا منظر اس گھر پر سارا دن خدا کی رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں کے نزول کا باعث بنارہتا۔

اماں جی کے اس دینی اور روحانی ذوق نے اُن میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کسی صاحبِ کمال بزرگ کے حلقہٴ امداد میں شامل ہو کر تزکیہٴ نفس کی منتریں طے کریں اور اپنی دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت و نشوونما

اماں جی کو قرآن پاک اور اس کے ترجمے پر اتنا عبور حاصل تھا کہ زیر زبر کی غلطی پر فوراً ٹوک کر اصلاح کر دیتیں

کے ذریعے سعادت آخری کا سامان مہیا کریں۔ یہ ۱۹۳۹ء کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے۔ الہامی نے اماں جی کی یہ خواہش اپنے روحانی پیر و مرشد حضرت خواجہ حافظ عبدالصمد سجادہ نشین خانقاہ مظفری حصار کی خدمت میں پیش کی جب وہ سرے تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ خواہش معلوم کرتے ہی حضرت صاحب زادہ ازراہ کرم فوراً الہامی کے ساتھ پایادہ ہمارے گھر تشریف آئے۔ کتنا خوب نصیب تھا ہمارا گھر جس کے فرش کو اللہ کے ایک نیک، مقرب، صاحبِ دل اور با عظمت انسان کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ حضرت صاحب نے اماں جی کو طریقہ تشنبہ سے محدد یہ کے مطابق اپنے حلقہٴ بیعت میں شامل کیا۔ سابقہ اناہوں سے تو یہ کرانی دینی فرائض کی پابندی کا عہد لیا۔ درود شریف اور استغفار کی تسبیح پڑھنے کی ہدایت کی اور اہم ذات کے ذکر کی تلقین فرمائی۔

☆☆

اماں جی، جنہیں ذکر الہی اور تلاوت قرآن سے پہلے ہی والہانہ شغف تھا، اب جو انہوں نے ایک صاحبِ نسبت اہل اللہ کی راہنمائی میں ذکرِ اکرام ذات کی مشق شروع کی تو شروع شروع میں ذکر الہی کے انوار و تجلیات سہانی پھوار کی صورت میں ان کے

قلب صافی پر پڑنے لگے، جس سے اُن پر غم و غمناخ اور فرحت و انبساط کی وجد آفریں کیفیت طاری ہوگئی لیکن جب اس ہلکی پھلکی اور دھیمی پھوار نے موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی تو طبیعت میں عجیب تغیر پیدا ہو گیا۔ دنیا اور اس کے لوازمات و مشاغل سے نفرت و وحشت اور اذکار و اوراد میں بے پناہ لذت و حلاوت۔ معلوم ہوتا تھا کہ اہم ذات کے ذکر کی کثرت سے اُن کے رگ و پے میں محبت الہی کی وارفتگی سراپت کر گئی ہے۔ اس کیفیت کی موجودگی میں دنیا و مافیہا سے کیا تعلق؟ اسی کی طبیعت کے اس رحمان اور ذوق سے سب گھر والوں کو قدرے فکر لائق ہوا۔ مجھے سخت خوشی تھی۔ آخر کار ایک دن جرأت کر کے میں نے عرض کی:

”اماں! آپ پر خانہ داری اور اولاد کی پرورش و تربیت کی اہم ذمہ داریاں ہیں جنہیں خدا کی رضا کے لیے پورا کرنا بھی عین عبادت ہے۔ اذکار و اوراد نوافل میں شامل ہیں۔ اگر نوافل کی وجہ سے اہم فرائض فوت ہو جائیں تو یہ دین کی روح کے سراسر خلاف ہے، اس لیے آپ ذکر و نوافل کے سلسلے میں قدرے احتیاط و اعتدال سے کام لیں۔“

خدا کا شکر ہے کہ اماں جی نے میری مؤدبانہ گزارشات قبول سے سنیں اور انہیں شرف قبولیت بخشے ہوئے اپنے معاملات میں بتدریج اعتدال کی راہ اختیار کر لی۔ یہ اُن کی پختہ دینی بصیرت اور مستحکم ایمانی فراست و حکمت ہی تھی جس کے باعث انہوں نے اعتدال و توازن کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا، ورنہ اس شیطانی و وارفتگی اور جذب و تھکت کی وادی میں قدم رکھ کر کون کسی کی نصیحت پر کان دھرتا ہے اور کب اسے حکمت و مصلحت کی باتیں پسند آتی ہیں۔

دورہ انہیں اٹھا کر بٹھا دیتا۔ پھر یہ تکلیف خاساں دن چڑھ کر بعد آہستہ آہستہ کم ہوتی۔ بعض دفعہ سارے دن تکلیف کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ سامنے اور تجربے کا رولگ آکر آتے کہتے کہ دمہ ایسا موزی مرض ہے کہ یہ دم کے ساتھ ہی جا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اماں جی پر بھی مایوسی ناسیدی اور دل تنگی کی کیفیت طاری نہ ہوتی۔ وہ تسلیم و رضا کا پیکر بنی پورے عزم و ہمت اور حوصلہ و ارادے کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھاتے جاتیں۔ تکلیف کا سلسلہ ۱۹۳۳ء کے آخر تک چلتا رہا۔ آخر کار اللہ کو اپنی بندگی پر ترس آیا۔ اُس کی رحمت جوش میں آئی اور ایک روزانی ذریعے کو حش کا ذکر ابھی بعد میں آئے گا، اس تکلیف اور بیماری سے نجات کا باعث بنا دیا۔

۱۹۳۷ء تک اماں جی کا قیام سرسہ ہی میں رہا۔ ۲۲ مئی ۳۷ء کو بہنو اور سکھ مسلح حملہ آوروں نے مسلم گھلوں پر یورش شروع کر دی۔ بیکڑوں، بچے، عورتیں اور مرد بڑی بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔ ہمارا گھر سبزی منڈی میں تھا۔ خدا کے فضل سے یہ محلہ مادھار اڈا آتش زنی کی واردات سے بچا رہا، اسی لیے پورے شہر کے بچے بچے مسلمان اسی محلے میں آ کر پناہ لینے لگے۔ ۲۳ مئی کو بول انتقامیہ نے اس علاقے کو مسلمانوں کا خانقاہ کی شکل قرار دے دیا اور مخالفت کے لیے لوگوں کو فوجی دستے تعین کر دیے۔

اماں جی کے گھر میں پناہ لینے والوں کی تیز تعداد جمع ہو چکی تھی۔ جس میں بچے، عورتیں اور مرد بھی شامل تھے۔ سب کچھ پورے دو ماہ تک قائم رہا۔ اس عرصے میں اماں جی کا کردار انصاف پرندہ کے عظیم المثال کردار کا ایک بلا سا عکس تھا۔ جو کچھ گھر میں تھا، اُسے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بڑی خوشی اور فراخ دلی سے بے دریغ خرچ کیا۔ ایسا و قربانی اور حسن سلوک و مرحمت کی ایسی درخشندہ مثالیں قائم کیں کہ اُن کا گھر پورے ۲۴ ماہ تک کینوں کے ہجوم اور حالات کی سخت تنگی و پریشانی کے باوجود امن و سکون اور باہمی مؤدت و اُلفت کا گہوارہ بنا رہا۔

۳ نومبر ۱۹۴۳ء کو ہمارے کپ کے کینوں کو اجنبش کر کے انہیں اٹھا کر بٹھا دیتا۔ پھر یہ تکلیف خاساں دن چڑھ کر بعد آہستہ آہستہ کم ہوتی۔ بعض دفعہ سارے دن تکلیف کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ سامنے اور تجربے کا رولگ آکر آتے کہتے کہ دمہ ایسا موزی مرض ہے کہ یہ دم کے ساتھ ہی جا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اماں جی پر بھی مایوسی ناسیدی اور دل تنگی کی کیفیت طاری نہ ہوتی۔ وہ تسلیم و رضا کا پیکر بنی پورے عزم و ہمت اور حوصلہ و ارادے کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھاتے جاتیں۔ تکلیف کا سلسلہ ۱۹۳۳ء کے آخر تک چلتا رہا۔ آخر کار اللہ کو اپنی بندگی پر ترس آیا۔ اُس کی رحمت جوش میں آئی اور ایک روزانی ذریعے کو حش کا ذکر ابھی بعد میں آئے گا، اس تکلیف اور بیماری سے نجات کا باعث بنا دیا۔

☆ ☆ ☆

پاکستان کے بن جانے کے بعد اماں جی کا مستقل گھر آخر عمر تک لاہور میں رہا۔ اپریل ۱۹۴۵ء ہی میں وزارت سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی اس علاقے میں تجربے کار پٹواریوں کی شدید کمی ہوئی، چنانچہ لاہور آکر عارضی بنیاد پر انہیں ۲۲ سال تک مندرجہ امور منجھ جالیات میں بطور پٹواری کام کرنے کا موقع مل گیا۔ برادر مرزا محترم گل حسن صاحب کا سلسلہ ملازمت جاری تھا۔ کچھ عرصے بعد برادر عزیز الاکرم جن کو بطور کلک اور عزیز الطاف حسن کو بطور سکلیرلر انجنیئر میں ملازمت مل گئی۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد عوامی لحاظ سے ہمارے گھر کے حالات سخت پریشان کن تھے۔ تقریباً خالی ہاتھ آئے تھے، پاس سرائی تھانہ گھر کی ضروریات کا سامان، مزر کو سامان حاصل کرنے کے لیے اس ہمت و جرأت، مستعدی اور ہوشیاری سے غیبتی کی صفات کی ضرورت تھی، ان کام سب میں فقدان تھا لیکن خدا کا رحم و فضل شامل حال تھا۔

☆ ☆ ☆

وسط اپریل ۱۹۴۵ء میں اُن کا بلڈ پریشر بہت بائی ڈاکٹر عبدالرشید نے معائنہ کر کے علاج تجویز کیا مگر

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

مقدور ہے۔ یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو بروز ہفتہ تین اس وقت جب وہ اپنے تحریرچی کے معمول کے مطابق اپنے رب کی پارگاہ میں حاضر ہو کر اس سے راز و نیاز کیا تئیں کیا کرتی تھیں، دعوتِ اہل کو لبیک کہتے ہوئے اپنی جان اپنے خالقِ حقیقی کے سپرد کر دی۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

اس طرح ہم سب بہن بھائی ایک ایسے سایہ رحمت و شفقت سے محروم ہو گئے جو نہایت ٹھنڈا، سہانا، فرحت بخش، دلنواز، روح پرور اور حوصلہ افزا تھا۔ اس سایہ میں ہمارے لیے ہر قسم کے رنج و محن، آلام و مصائب اور شدائد و خطرات کے مقابلے میں تحفظ کا احساس، امن و سلامتی، برکت و عافیت اور راحت و رحمت کی تکلیف موجود تھی۔

اماں جی کو غسل آن کی بیٹیوں اور بھوں نے اپنے ہاتھ سے دیا۔ نہلانے اور کفنانے کے بعد جب ان کی میت منہ دکھانے کے لیے کمرے میں رکھی گئی تو ان کے وجہہ چہرے پر عجیب قسم کی روحانیت اور نورانیت تھی۔ نورانیت ایسی جس میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی آب و تاب اور چمک دکھ تھی۔ میں اپنی حد تک نگاہ بھا کر دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ اماں جی کی وصیت کے مطابق برادرِ گل حسن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر رونی ہوئی آنکھوں، ترپے اور ٹیکے ہوئے دلوں اور رز تے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مہانی صاحب کے قبرستان میں ہزاروں من مٹی کے نیچے ان کو دفن کر دیا جہاں اب وہ بھوسا سڑتا ہے۔

اماں جی کا سایہ اپنی اولاد کے لیے کتنا باعثِ برکت اور موجبِ رحمت تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ۲۳ جولائی ۱۹۷۲ء کو رات ۸ بجے ان کے ۱۲ بیٹوں یعنی برادران عزیز و ذاکر اعجاز حسن اور الطاف حسن معروف بہ قریشی برادران کی مارشل لا ضابطے کے تحت گرفتاری عمل میں آ گئی۔ ان کے رسالے ”اردو ڈائجسٹ“ اور ”زندگی“

نہیں دے دیے گئے۔ فوجی عدالت قائم ہوئی جس نے ایک طرف سرسری سماعت کے بعد دو دو سال قید یا سزا اور لاکھوں روپے جرمانے کا حکم سنایا۔ قریشی برادران ان کے خاندان والوں پر شدید اعتلا و آزار کا یہ دور ۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء سے شروع ہو کر وسط جولائی ۱۹۷۳ء تک یعنی ۵۷ سال سے زیادہ رہا۔ اس میں قید و بند، صعوبتیں، مقدمات کی بھرمار، ذرائع آمدنی کی کلی طور پر بندش اور دینی کرب چھی زہرہ گداز اور حوصلہ شکن صورتیں مسلسل پیش آتی رہیں۔ اپنی اولاد کے حق میں اماں جی دعاؤں کا وہ ذخیرہ جو خزانہ خداوندی میں جمع تھا، قریشی برادران کو اس مسلسل، متواتر اور ناقابلِ برداشت ابتلا آزمائش کے امتحان میں کامیاب اور سرخرو بنانے کا ذریعہ بنا۔ وہ پامردی اور جرأت سے یہ ظالم اور سنگدلانہ اور مقابلہ کرتے رہے۔ آخر کار ظلمِ تھک کر چور چور اور پاش پاش ہو گیا۔ اگر اماں جی کی محفوظ دہائیں رحمت خداوندی کو رقم و کرم پر آمادہ نہ کرتیں تو قریشی برادران اور ان کے خاندان کی جنگجو و خوار کی تباہی و بربادی اور ہلاکت و خسران میں کون ہی کس بات کی روٹی تھی؟

☆☆☆

اماں جی کی پرورش و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، فرائضِ نماز اور نوافلِ تہجد کی ادائیگی ان کا مستقل معمول تھا۔ جب تک نگاہِ کام کر رہی قرآن مجید کی تلاوت و دینی تذکرہ صاحب کے ترانے کے ساتھ کرتی رہیں۔ انہیں قرآن پاک اور اس کے ترجمے پر اتنا عبور تھا کہ اگر قرآن پڑھنے والا زیرِ برکی غلطی بھی کر دیتا تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح فرمادیتیں۔ قرآن مجید کی کسی آیت کی تلاوت کرو وہ اس کا ترجمہ سناتیں۔ قرآن مجید میں اس قسم کی مہارت رکھنے والوں کے لیے رسول کریم ﷺ نے مندرجہ ذیل بشارت دی ہے:

”قرآن مجید میں مہارت رکھنے والے نیک اور معزز فرشتوں کے ساتھ ہیں۔“

اماں جی کو آخری سیپاروں کی اکثر سریتیں زبانی یا

اماں جی کو قرآن مجید سے جو گہرا لگاؤ تھا اس کے سبب اپنی اولاد کو اس کی تعلیم دلانے کا پورا اہتمام کیا۔ اپنی بیٹیوں کو گھر پر خود ناظرہ قرآن پڑھایا اور بیٹوں کو اپنی صاحب سے اس کی تعلیم دلوائی۔ ۵۷ سال کی عمر میں وہ بیٹوں کو داخل کر دیا جاتا تو ساتھ ہی مسجد میں اپنی صاحب کے پاس قرآن کی تعلیم کے لیے بخاندیا۔ سردیوں میں ہم فجر کی نماز جامع مسجد ادا کرتے۔ اس کے بعد قادری صاحب سے قرآن پاک کا مطالعہ ہو کر کھڑے آتے اور رونی کھا کر سکول کی طرف چل جاتے۔ کیمپوں کے موسم میں نماز ظہر سے نماز عصر تک قرآن پاک کی تعلیم ہوتی۔ جونہی ہم کوئی جماعت پاس کرتے، اس کا پھر قرآن بھی ختم کر لیتے۔ قادری صاحب نے قرآن پڑھانے کا طریقہ نہایت مؤثر اور جدید ترین مہاشی انداز کا تھا۔ ان سے جو ناظرہ قرآن پڑھ لیتا اس میں بلا کی روانی ہوتی۔ حروف کے صحیح بخارج سے ادائیگی پر ہوتا۔ قرأت میں سین لٹکھی کی دلنوازی کیفیت ہوتی۔ گھر کی بھرپور ذمہ داریوں کے باوجود ہاڑی اور صبر کے قیام کے دوران اماں جی کا یہ معمول رہا کہ وہ ہر صبح بیٹوں کو ناظرہ قرآن پڑھاتیں۔ بیٹیوں بیٹیوں نے ان سے قرآن پاک پڑھا۔ قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں خانہ داری کی تربیت دیتیں۔ اس طرح اماں جی کا گھر ہمیشہ ایک دینی اور معاشرتی تربیت گاہ کی حیثیت اختیار کیے رہا۔ اس تربیت گاہ میں جو بچی آجانی اماں جی کے ساتھ آ کر کمال کا شریعتی اور منظم بنیادوں پر قائم ہو جاتے وہ بڑی ہوشیار، ان کی شادیاں ہو جاتیں، مال بچوں والی ہو جاتیں لیکن اس رشتے کی پاکیزگی اور حفاظت میں کوئی فرق نہ آتا۔ اماں جی ان کے دل کے گھر میں کام آتیں، عید پر انہیں عید یا بھجواتیں۔ اگر ان کی خانگی زندگی میں کوئی نامواری پیدا ہو جاتی تو دعا و خلعت

☆☆☆

اماں جی یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو سحر خیزی کے وقت اپنے رب کے پاس چلی گئیں

کر کے ان کو ہوا و رادست کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کے سرال والے بھی اماں جی کی بزرگانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔

☆☆☆

ذکر الہی اور تلاوت قرآن کی کثرت کے باعث اللہ تعالیٰ نے اماں جی کی زبان اور ان کے دم میں ایک شفا بخش تاثیر پیدا کر دی تھی۔ وہ جس مریض پر آیات الہی پڑھ کر دم کر دیتیں وہ خدا کے فضل سے شفا یاب ہو جاتے۔ بعض بیمار یوں میں ان کا یہ عمل تریاق کی حیثیت رکھتا تھا۔ مثلاً آنسو، بچوں کا نمونیہ، موزی اور زہریلے جانوروں کا کاٹ لینا اور دوسرے وغیرہ۔ مریض ٹھٹھکے اور ترپے آتے اور ہنسنے پھیلنے جاتے۔ مارگریڈہ مریض آتا۔ اماں جی اسے نیم کے پتے چوساتیں اور ساتھ ساتھ دم کرتی جاتیں۔ جب تک زہر کا اثر جسم میں ہوتا نیم کے پتے مریض کو ٹھٹھے یا پھینکے محسوس ہوتے، دم کا سلسلہ جاری رہتا۔ یہاں تک کہ ان کی کڑواہٹ اس کی قوت سے زہر کا اثر ختم کرنے لگتی۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ قسم کے زہر کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ یہ سب قرآن پاک کی برکت اور اس کا اعجاز تھا۔ دین کے ساتھ گھر سے رابطہ بننے ان کے اندر ایک روحانی قوت پیدا کر دی تھی۔ اس قوت کے چند واقعات بیان کرتا

آنکھیں پتھرائی ہوئیں اور لب محروم سوال
 برزخ یاس میں صدیوں سے جیے جاتے ہیں
 یہ جو ہیں کشتہ زدگانِ بے مہری وقت
 ٹھہرے معتب بارگاہِ جمال
 رائیگاں ہوتے رہے رسمِ غلامی کے اسیر
 اے خدا ان کو رہائی دے دے
 اک نیا عزم دے اک جرأتِ زندان دے
 چند کرئیں کسی خورشید جہاں سوز کی دے
 جن کی حدت سے پگھل جائے کھولت کا جمود
 ان کی آنکھوں میں نئے خواب جگا
 ان کے ہونٹوں کو ملیں معجزہ آسا الفاظ
 ان کے ہاتھوں کو بنا تیغِ مزدور وفا
 ان پر ایسا اتار اسمِ عظیم
 جو انہیں پھر سے معتبر کر دے



ایک دعا

مبصر جنرل (ر) محمد جاوید

سفید پوش اور سفید ریش بزرگ ایک ایک مریض کے
 سر ہانے جا کر کچھ پڑھ کر دم کر رہے ہیں۔ میں نے اُن
 سے دریافت کیا ”آپ کون ہیں؟“ جواب میں انہوں نے
 فرمایا ”کیا تم ہمیں نہیں جانتیں؟“ ساتھ ہی ہاتھ سے اشارہ
 کر کے بتایا کہ ہم تمہارے قریب سامنے ہی رہتے ہیں۔
 اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ
 سب مریض اٹھے بیٹھے ہیں۔ کوئی پانی مانگ رہا ہے تو کوئی
 روٹی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ
 بیماری سے رہائی پا چکے ہیں۔ میں نے اللہ کے اس احسان
 پر سجدہ شکر ادا کیا۔

ہوں جو بڑے ہی دلچسپ ہیں:
 اماں جی نے خود بیان کیا تھا کہ ماہی میں ایک مرتبہ
 ایک ایسی بیماری وبا کی صورت اختیار کر گئی جس میں مریض
 پہلے بخار میں مبتلا ہوتا، آہستہ آہستہ بخار کی تیزی اور شدت
 بڑھ جاتی اور مریض بے سدھ ہو جاتا۔ اس بیماری نے
 میرے گھر پر بھی حملہ کیا۔ ایک ایک کر کے سارے بچے اور
 تمہارے اماں جی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ گھر میں صرف
 میں اکیلی تندرست تھی جو سب بیماروں کی دیکھ بھال کر رہی
 تھی۔ میں ساری رات جاگتی اور بچوں کو باری باری دیکھتی
 جاتی۔ پریشانی کی حالت میں تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔
 ایک رات جو میری آنکھ لگی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک



جارج

اورک امریکا کے مشہور ٹیلی ویژن میٹ ورک اے۔ بی۔ سی نیوز سے بطور محقق منسلک ہے۔ پچھلے

دسمبر کو وہ کیمرا ٹیم کے ساتھ انٹارکٹیکا گیا تاکہ وہاں امریکیوں نے تحقیق و کھوج کی جو مہمات شروع کر رکھی ہیں، ان کے متعلق تفصیلی رپورٹ تیار کر سکے۔

ماہ دسمبر میں انٹارکٹیکا خوب سرد ہوتا ہے اور وہاں کپکپا دینے والی سردی پڑتی ہے۔ تاہم جارج نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر جگہ سہولت سے سفر کیا۔ وہ ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر یا برف میں پھسلنے والی گاڑیوں کے ذریعے منزل تک پہنچتے، ہم جوئی کا جائزہ لیتے گرم اگلوؤں میں غذائیت بخش کھانے کھاتے اور آگے چل پڑتے۔ انھیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ مہذب دنیا سے دور ایک خطرناک جگہ آئے ہوئے ہیں۔

قطب جنوبی میں میکرو دواٹیشن امریکا کا مرکزی اڈہ ہے۔ ایک دن جارج اٹیشن میں کام کرتے کچھ سائنس دانوں کے ساتھ ۱۰ میل دور واقع راس آئس نامی برفانی تختے (Shelf) پر گیا۔ دراصل وہاں دو کوہ پیا، ڈیو لاسو سا اور ٹونی پارکر اٹیشن میں کام کرنے والوں کو زندگی بخش طریقوں کی تربیت دیتے تھے۔ تاکہ کوئی خدا نخواستہ برفانی صحرا یا پہاڑوں میں کھو جائے، تو جان بچانے کی سعی کر سکے۔

راس آئس برفانی تختہ ۵۰۰ میل چوڑا اور ۴۰۰ میل لمبا تازہ پانی کی برف پر مشتمل وسیع و عریض خطہ ہے۔ اس میں گلیشئروں سے پانی آتا اور انہی کے دباؤ سے تختہ سمندر کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ جارج اپنے میزبانوں کے ہمراہ تختے پر ایسی جگہ پہنچا جہاں برف تقریباً ایک ہزار فٹ موٹی تھی، تاہم جگہ جگہ دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ تختے کی بے ترتیب حرکت کے باعث وجود میں آئی تھیں۔ ان دراڑوں کے آس پاس واقع برف خاصی نرم ہوتی ہے۔ اس پر ذرا سا زور پڑے، تو وہ تروخ جاتی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ

ہے کہ تختے پر آس برف کو پہنچانا بڑا کٹھن کام ہے۔ اسی لیے ایسی برف مسافروں کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

ڈیو اور ٹونی نے ۵ سائنس دانوں کو روس کے ساتھ باندھ کر ایک دوسرے سے منسلک کر دیا۔ اب انھوں نے قریب ہی واقع جھوپٹی سی پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ چونکہ جارج اور اس کے ساتھی، جبکہ نے کوئی تربیت نہیں لی تھی لہذا وہ نیچے ہی رک گئے۔ میکرو دواٹیشن کے چیف سائنسداں، فرینک ولیم نے بھی انہی کے پاس ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ دراصل اس کی طبیعت کچھ ناسازگھی۔

جب بقیہ لوگ پہاڑی پر کچھ اوپر جا کر تربیت پانے لگے، تو نیچے کھڑے تینوں آدمیوں نے سوچا کہ ادھر ادھر چہل قدمی کی جائے۔ چلتے چلتے وہ کچھ دور نکل گئے اور انھیں احساس ہی نہیں رہا کہ وہ ایک برفانی تختے پر چل رہے ہیں جہاں جگہ جگہ کھائیاں موجود تھیں۔

برفانی تختے پر جس جگہ برف نرم ہو، وہاں پہلے دراڑ پڑتی ہے۔ پھر کمری وزن کے باعث وہ ٹوٹے ٹوٹے کھائی وجود میں آجاتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جو شخص ایسی کھائی میں گرے، اس کا مرنا یقینی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر وہ بچ بھی جائے، تو ایک گھنٹے کے اندر اندر شدید ٹھنڈا اُسے مار ڈالتی ہے۔ مزید برآں ایسی کھائی میں پھنسے شخص کو نکالنا بھی جان جو کھم کا مرحلہ ہے، کیونکہ خطرہ ہوتا ہے کہ نرم برف ٹوٹنے سے بچانے والے ہی موت کے منہ میں نہ پہنچ جائیں۔

جب تینوں ایک جگہ کھڑے گرد و پیش کا نظارہ کر رہے تھے، تو فرینک کو دور کوئی سفید شے حرکت کرتی نظر آئی۔ وہ اُسے دیکھنے ٹھوڑا آگے ہوا تو اسی وقت دھماکا سا ہوا اور برف تروخ گئی۔ فرینک بھی گرتی برف کے ساتھ نیچے جانے لگا جہاں ایک گہری کھائی نمودار ہو رہی تھی۔

فرینک نے گرتے گرتے چیخ ماری اور دونوں ہاتھ آگے کر کے سطح کو تھامنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن برف بہت چکنی تھی اور وہ آہستہ آہستہ نیچے کھسکتا چلا گیا۔ فرینک کے نزدیک ہی جارج کھڑا تھا۔ اس نے سارا منظر دیکھا تو

ہکا بکا رہ گیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر حواس بحال ہوئے، تو وہ تیزی سے لپکا اور فرینک کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔

اب جارج کی بھرپور کوشش تھی کہ فرینک کو جنم لیتی کھائی میں نہ گرنے دے۔ اس نے اپنے جوتے مضبوطی سے برف میں گاڑ دیے اور پوری قوت سے فرینک کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی احمقانہ حرکت کر چکا ہے۔ جس جگہ وہ بیٹھا تھا، اگر اس کی برف بھی نرم ہوئی، تو یقیناً جارج فرینک کے ساتھ ہی کھائی میں جا پڑتا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ پیچھے ہٹ جائے لیکن جارج کے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ وہ ایک قیمتی انسان کی جان ضائع ہونے دے۔ وہ اپنی ہمت بندھاتے ہوئے بڑبڑایا ”مجھے فرینک کو زندگی گزارنے کا دوسرا موقع دینا ہوگا۔“

اسی دوران جبکہ ابھی ان کی مدد کرنے پہنچ گیا۔ جبکہ نے فرینک کا کندھا تھام لیا تاکہ اس کا نیچے سر کننا بند ہو سکے۔ اب جارج کے سر پر سے بار کم ہوا تو اس کی جان میں جان آئی۔ شاید مزید چند سیکنڈ گزرتے تو وہ ہمت ہار بیٹھتا۔ ان دونوں نے پھر بڑی احتیاط سے کھائی میں آدھے لٹکے فرینک کو نکالا اور اُسے بحفاظت محفوظ مقام پر لے گئے۔

فرینک کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی۔ اب حادثے نے تو اس کی ٹی گم کر دی۔ چنانچہ سبھی کام ادھورا چھوڑ کر واپس اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں فرینک نے چائے کافی پی، پھر آرام کیا، تو اس کے اوسان بحال ہوئے۔ فرینک نے پھر سبھی سائھیوں کو خود پر گزرا حادثہ سنایا اور بتایا کہ جارج نے بڑی بہادری سے اس کی جان بچائی۔ پوری داستان سن کر بھی لوگوں نے تالیاں بجا کر جارج کو خراج تحسین پیش کیا۔

لیکن جارج یہ منظر دیکھتے ہوئے قیمتی یادوں میں کھو گیا۔ تب ۲۰ سال میں پہلی مرتبہ اس نے وہ المناک لمحات یاد کیے جب وہ ۱۷ برس کا بھرپور جوان تھا۔

جارج نیویارک کے مضافات میں واقع ایک نیم دیہی بستی کا رہنے والا تھا۔ بستی کے قریب ہی ایک بڑی جھیل تھی جہاں چھٹیوں میں نیویارک سیر و تفریح کی غرض سے آتے۔ جارج کا باپ بھی ایک کشتی کا مالک تھا، جس میں سیاحوں کو سیرا کرانا اور ڈالر کھڑے کرتا۔

جون کی ایک دوپہر کا ذکر ہے۔ جارج جھیل کے کنارے کھڑی اپنی کشتی کے قریب بیٹھا فطری مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وسط جھیل میں ایک کشتی ہوئے ہوئے کھڑی تھی جس میں چند سیاح بیٹھے تھے۔ اچانک جارج نے دیکھا کہ کشتی کے کنارے بے پروائی سے بیٹھا ایک شخص پانی میں جا پڑا ہے۔ اب کشتی کی طرف سے شور و غل بلند ہوا۔ دراصل اُسے ایک نا تجربے کار نوجوان چلا رہا تھا جسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ سیاحوں نے جارج کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس سے مدد مانگی۔

جارج بچپن سے تیراکی کر رہا تھا اور ماہر تیراک بن چکا تھا۔ پھر اس کے قریب ہی کشتی بھی کھڑی تھی۔ وہ چاہتا تو تین چار منٹ میں ان کے پاس پہنچ جاتا۔ پھر ڈوبتے شخص کو بچانا جارج کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن انفسوس وہ نہیں جاپایا۔

دراصل وہ ایک رو بوٹ تھا، بچپن ہی سے مار پیٹ اور گالم گلوچ کے ذریعے باپ نے جارج کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ وہ حد سے زیادہ باپ کا تابع فرمان تھا۔ وہ بعض معاملات میں اپنی مرضی کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں اتنی خود اعتمادی نہیں تھی کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا۔ باپ کی سختی اسے اکثر ناراض اور غصیلا بنا دیتی لیکن تب بھی وہ اس کا ہر حکم مانتا۔ چنانچہ ایسی صورت میں جارج کے لیے یہ سوچنا بھی محال تھا کہ وہ باپ کی اجازت کے بغیر کشتی لے جائے، چاہے ایک شخص کی جان ہی بچانی ہو۔ بہر حال اس نے یہ ضرور کیا کہ بھاگ کر اپنے گھر پہنچا جو قریب ہی تھا۔ باپ برآمدے میں کرسی ڈالے کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ جارج نے پھولی سانسوں سے اسے بتایا ”جھیل میں

مچھر کا شجرہ نسب

پہلی نظر میں انھوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی میں کیڑے ڈالتے شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا: ”حضرت! یہ مچھر ہیں یا مگر مچھر؟ کراچی کا مچھر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا صرف قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے، یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولاد مرتا ہے۔ نمرود مرد کی موت ناک میں گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مچھروں کا شجرہ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اس مچھر سے جا ملتا ہے۔“

(مشاق احمد یونی کی آب گم سے)

اسے ہوش آیا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ کف افسوس ملنے لگتا۔ لیکن انارکلیک میں ایک انسان کی زندگی بچا کر اس کی روح پر بے حسی کا جو بوجھ براجمان تھا، وہ خاصی حد تک ہٹ گیا۔ نیویارک واپس پہنچ کر جارج پھر سوچوں میں غطلاں رہنے لگا۔ وہ راتوں کو اٹھ کر سوچتا اور چہل قدمی کرتے ہوئے خود سے سوال کرتا ”کیا واقعی میں نے فرینک کی جان بچا کر اسے دوسرا موقع عطا کیا ہے؟“ پھر وہ سوچتا ”یقیناً اس دوپہر میں باپ کی حکم عدولی کرتا تو آج ڈوبنے والا شخص بھی زندہ ہوتا۔“

یہ حقیقت ہے کہ جو انسان احساس گناہ میں مبتلا ہو جائے وہ پھر بے شکل ہی اس سے چھٹکارا پاتا ہے۔ جارج جب بھی خود کو امتحانی سوالات سے گزارتا، ایک ہی جواب سامنے آتا..... اس نے ڈوبتے شخص کو زندہ رہنے کا دوسرا موقع فراہم نہیں کیا، لیکن فرینک خوش قسمت تھا کہ اسے مل گیا۔ سوچ بچار کے بعد جارج نے یہی نتیجہ نکالا کہ اس نے درست قدم نہ اٹھا کر بڑی بھیاں ک غلطی کر ڈالی تھی۔

اب ۲۰ برس میں پہلی مرتبہ جارج میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی تھی کہ وہ ڈوبنے والے شخص کا پتا لگائے،

ایک شخص ڈوب رہا ہے۔ کیا میں اسے بچانے کے لیے کشتی لے جاؤں؟“

باپ نے جھیل کی طرف دیکھا اور خاصی دیر تک اسی سمت نظر میں جمائے رہیں۔ بے چین بیٹے نے پھر اجازت طلب کی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ جب بیٹے نے کچھ زیادہ ہی اظہار بے چینی کیا، تو باپ غصے سے چلایا ”چپ ہو جا خنزیر کے بیچے۔“

اسی دوران دوسری طرف سے ایک مقامی نوجوان اپنی کشتی لیے ڈوبنے والے انسان کی مدد کو پہنچ چکا تھا۔ جلد ہی دیگر کشتیاں بھی آگئیں۔ اب بہت سے لوگ پانی میں گرے شخص کو تلاش کرنے لگے۔ کچھ تلاش بے سار کے بعد وہ بچا را مردہ حالت میں مل گیا۔ اس کی لاش کشتی میں رکھ کر جارج کے سامنے کنارے پر لا ئی گئی۔

نوجوان جارج نے پانی میں شرابور مردہ دیکھا تو صدے اور شرمندگی کے مارے گنگ رہ گیا۔ لوگ اسے مصنوعی تنفس دے کر ہوش میں لانے کی سعی کر رہے تھے، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جارج سر جھکائے چپ چاپ گھر پلٹ آیا۔ اس شام جارج نے بہت کم باتیں کیں۔

اگلی صبح سورج طلوع ہوا اور پرندے اپنی بولیاں بولنے لگے، تو حسب معمول جارج جنگل کی سیر کو نکلا۔ اس نے شروع میں یہی خیال کیا کہ کوئی خاص ماجرا پیش نہیں آیا۔ لیکن ایک اہم واقعہ انجام پا چکا تھا..... ایک انسان ڈوب گیا تھا اور وہ چاہتا تو اسے زندہ رہنے کا موقع فراہم کر سکتا تھا۔

اس دن جارج کے سر پر یہی بات سوار رہی۔ حتیٰ کہ شام تک وہ ایک انقلابی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے طے کیا کہ وہ باپ کا کوئی ایسا حکم نہیں مانے گا جو اخلاقی اصولوں کے خلاف ہو۔ جلد ہی وہ گھر چھوڑ کر اپنی زندگی خود بنانے نکل کھڑا ہوا اور اس کا باپ سے نانا ٹوٹ گیا۔

لیکن جارج کو اکثر یہ غم ستاتا رہا کہ جب اس کی کوتاہی و غفلت کے باعث ایک قیمتی جان تلف ہوگئی، بھی

روزمرہ معاملات
میں کشادہ دلی اور
وسعت نظر اختیار
کی جائے، تو وہ
خوشی و مسرت کے
تحفے عطا کرتی ہے

66

آنکھیں ڈال کر آنے سامنے بیٹھے اور مہذب انداز میں
گفتگو کی۔ اب دونوں کی یہی سعی تھی کہ دوسرے کو کسی قسم
کا دکھ نہ پہنچے اور ان کے مابین ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا
ہو جائے۔

احساس گناہ سے چھٹکارا پا کر جارج نے بہر حال خود
کو بڑا ہلکا چھلکا محسوس کیا۔ ضمیر سے پہلا اور سب سے
وزنی بوجھ اٹھا، تو بہت سے دوسرے بھی اترتے چلے
گئے۔ دراصل یہ اندرون ذات میں جھانکنے کا پورا سلسلہ تھا
جواب تک جاری و ساری ہے۔ جارج جب جو کہ بھائی
اور دوستوں سے ملا، تو انھیں مشفق و ہمدرد پایا۔ جب باپ
سے ملا، تو اُسے محسوس ہوا کہ اب وہ اس سے نفرت نہیں
کرتا۔ رفتہ رفتہ جارج کو معلوم ہوا کہ روزمرہ معاملات
میں کشادہ دلی اور وسعت نظر اختیار کی جائے، تو وہ
خوشی و مسرت کے تحفے عطا کرتی ہے۔

آج جارج کے پاس ایک سرٹفیکٹ محفوظ ہے۔ اس
میں درج ہے کہ اُسے قطب جنوبی جانے کا اعزاز حاصل
ہے۔ لیکن جارج کے نزدیک دراصل وہ اپنی خودی و ہستی
پہچاننے کا تصدیق نامہ ہے کیونکہ انٹارکٹکا کے غیر آباد و بخر
علاقے میں ان چند نمٹوں کے دوران جو کچھ پیش آیا، اس
نے جارج کو زندگی سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے کا
سلیقہ سمجھا دیا۔



لی بابت جانے۔ اخبارات کی جانچ پڑتال سے
پتہ ہوا کہ اس کا نام جولوبلی تھا۔ وہ ریاست استہاکا
تھا اور ۲۶ سال کی بھرپور جوانی میں دنیا چھوڑ گیا۔
جارج نے پھر تفتیش کر کے جو کہ بھائی کو ڈھونڈ
بھائی نے اسے ان ۳ آدمیوں کے متعلق بتایا جو
حادثہ جو کہ ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ جارج پھر ان
ملنے ریاست استہاکا گیا تاکہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا
کے۔ چاروں آدمیوں نے ایک تقریب میں ملاقات
کھانے پینے کے دوران بہت سی تلخ و شیریں باتیں
کیاں۔ جب جارج رخصت ہونے لگا، تو ایک شخص نے
کہا ”میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ تم نے کسی اور
یادہ اس دن کو یاد رکھا ہوگا۔“

گھر واپس پہنچ کر ایک ہفتے بعد جارج نے باپ کو
ایا۔ ۲۰ سال ہوئے جب اس نے آخری بار باپ
گفتگو کی تھی۔ اس نے باپ کو بتایا ”میرا خیال ہے،
ہمارے درمیان امن قائم ہو جانا چاہیے۔“
”کیوں نہیں؟“ باپ نے جواب دیا۔

جب جارج اپنے آبائی گھر پہنچا، تو اس نے ایک
مے کھوسٹ کو اپنا منتظر پایا۔ پہلے وہ دونوں اکٹھے جارج
کی قبر پر گئے۔ پھر وہ ماضی کی تلخ یادوں سے بچتے
مگرے دوستوں کے مانند باتیں کرنے لگے۔
گفتگو آخر باپ نے ایک چھتا ہوا جملہ کہہ کر اُسے
”دیا“ میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارا بچپن بڑا خوفناک
ت گذرا ہے۔“

جارج نے کوئی جواب نہ دیا اور انھیں جولوبلی کے
بننے کا واقعہ یاد دلایا۔ پھر یہ بتایا کہ انٹارکٹکا میں کیا ماجرا
آیا پھر انھیں کہا ”میں نے بچپن میں جو ظلم سہا، جو کونہ
نے پر جو غصہ محسوس کیا اور بعد ازاں ساری زندگی جس
لی میں مبتلا رہا، اُسے میں بھول چکا ہوں۔“ تاہم
کی باپ جو والے حادثے کو یاد نہ کر سکا۔

جب جارج رخصت ہونے لگا، تو باپ نے اُسے
لی بات سنی ”تم نہیں جانتے، میں ہرگز نہیں چاہتا تھا

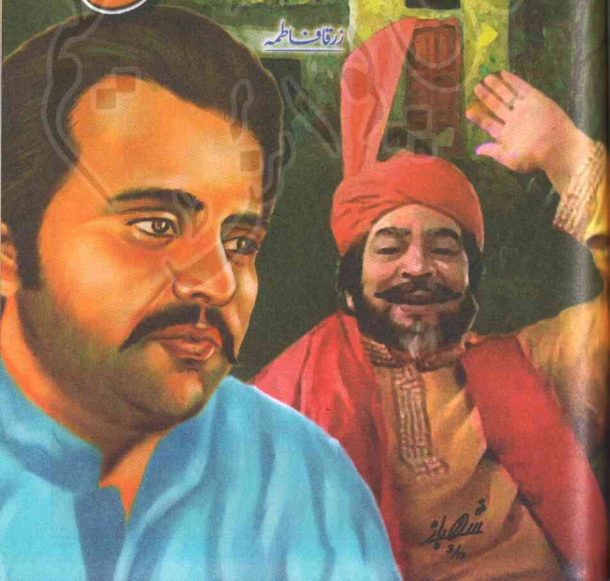
دل پذیر
کہانی

وفا اور بے وفائی کے جذبوں سے گندھی
ایک جھٹے کی دل پذیر کہانی چچا سے اُس کی
بھیسگی آنکھیں دیکھی نہ جاتی تھیں

نقصان

اعتبار ٹوٹے
تو سب کچھ
ٹوٹ جاتا ہے

زرقاں طمہ



شہیناز

”آیتر“

ہو گیا۔ تبھی چاچے نے تان لگائی:

بہر آکھیا جو گیا جموٹ بولیں
ساکوں وچھڑے یاد ملا وندا ای
میں ڈھونڈ تھکی کوئی نہ ملیا
جھیرا گیا نوں موڈ لیا وندا ای!

منیریا، او بے وفا، ایک ہی
گلی میں رہتے ہو پھر بھی
آج تیرے دن کھڑا
دکھایا اپنے چاچے کو!

”بس چاچا! تجھے پتا ہے گندم کی کتنائی مٹ نہیں
موڑنے دیتی۔ تُو سُنا آج تو سویرے سویرے
بہر وارث شاہ لیے بیٹھا ہے۔ لگتا ہے آج چچی کی یاد زیادہ
ہی آرہی ہے۔“ منیر نے نیم کے نیچے پتھی چارپائی پر
بیٹھتے ہوئے کہا۔

چاچے نے ایک شندڑی سانس لی اور بولا ”اچھی ہوتی
ہیں یہ بھاگ بھریاں! بڑا چائن (روشنی) رہتا ہے ان سے
دل اور ویڑے میں۔ اور کچھ وقت وقت کی بات ہے منیر!
جس ویلے (وقت) کا میں بندہ ہوں نا، وہ رشتے نبھانے
کا تھا۔ جہاں رشتہ بن جاتا، وہیں دل کا رشتہ جوڑ لیتے اور
دل کا رشتہ جڑ جائے نا تو پھر نہ کالے گورے کا چکر رہتا
ہے، نہ ڈھلتی عمروں کا خوف۔ یہ در در پھرنے اور ڈراسی
بات یہ رشتے توڑنے کی مصیبتیں تو اب لوگوں میں بڑی
ہیں۔ لگتا ہے منیر، بندے کی سہن (برداشت) ختم ہوئی
ہے اور رشتے تو جڑتے اور پھلتے پھولتے ہی سہن شکتی کے
بل پر ہیں۔ تیری چاچی زندہ تھی تو اپنا آپ بڑا بھاری لگتا
تھا کہ کسی کی ذمہ داری ہے مجھ پر، ایک گھر کا نگہبان
ہوں میں! پر اب تو بچ پوچھ، بڑا ہی اکلپا ہے۔ بندہ
بندے کے ساتھ ہی جتا ہے۔“ چاچا کچھ اداس سا ہو گیا۔

”ہم سب کیا تیرے اپنے نہیں ہیں؟“ منیر نے چاچے
کے بوڑھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”منیریا! بڑھا بندہ بھی زنانی جیسا ہو جاتا ہے۔ مانتا
نہیں پر ہو جاتا ہے۔ کب تو کوئی آکر ڈکھتے ڈکھتے پر لپ
لگائے، پاس بیٹھے ڈکھ سکھ سنے۔“

”اچھا چاچا، یہ تو بتا، یہ تیرا وارث شاہ کیا کہتا ہے؟“
”وارث شاہ نے کیا کہنا ہے، وہ تو خود اپنے چم کے
ہوتے بنوائے کو تیار ہے جو پچھڑے مل جائیں تو!“ یہ سن کر
منیر کی آنکھ میں گلابیاں سی اُتر آئیں۔ وہ خاموش سا

چپ ہو کر پھر چاچے نے حقے کا کش لیا۔ منیر کے
چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ ”کی گل اے پتر، آج کچھ
چپ چاپ سا لگتا ہے۔ شاید تو نے دل سے بات نکالی
نہیں۔ پتر یادوں کی بیٹھڑ چھڑا تو آگے جانے کا رستہ ملے
نا۔ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ چھڑ نہ سوچا کرتا!“

”پتا نہیں کیوں چاچا دل میں ایک عدالت سی لگی
رہتی ہے۔ رانو نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میں تو
اُسے بہت پیار کرتا تھا۔ کیا لیاقت کی دولت میں اتنی سیخ
تھی کہ میرا ہیر جیسا پیار ٹھکرا دیا۔ اگر ہمارا کوئی بچہ ہوتا تو
کیا اُسے بھی ٹھکرا کر چل دیتی؟“

”میں کیا کہوں؟ بھلا بندے کے دل کی بات کس
نے جانی؟ پتا نہیں دل کیسے مجبور کرتا ہوگا۔ پر ایک بات
میری مان لے منیر، اس بات کو روگ نہ بنا۔ اب جیسی بھی
عدالت لگا لے، جو بھی سوال جواب کر لے، رانو مڑ کر
آنے والی تو نہیں نا۔ تو بھول جا اُسے۔“ چاچے نے یہ
کہہ کر دوبارہ حقے کا کش لیا۔

”چاچا! یاد ہے نا کچھ، اب انہیں مانتا تھا۔ کہتا تھا،
منیریا! چھڑ دے کھڑا (در) اُس کا! توں میرا ایک ہی پتر
ہے اور یہ پتن (دریا کے کنارے) رہنے والے وفادار نہیں
ہوتے۔ پھر تو نے ہی تو منایا تھا، اے کو! اُسے بھی میرا ہی
ڈکھ لے گیا۔ بڑا پیار کرتا تھا اب مجھ سے۔ لیکن میں چاچا!
تب کچھ اور سوچ ہی نہ سکتا تھا، پیار بھی نشے کی طرح چڑھ
جاتا ہے۔ تب اب مجھے بے سمجھ لگتا تھا۔ بھلا ذاتوں اور
زمینوں سے بندے تھوڑی پہچانے جاتے ہیں۔“

”اچھا چل پھڑ، جو ہوا سو ہوا، مٹی پا۔ وہ جو تیری
ماسے کی دھکی بیاہ کر لائی ہے تا تیری ماں، اُس کو دیکھا کر۔“

پاپ سنگر

ایک پاپ سنگر کو ایک شخص نے اپنے گھر گانا سنانے کے لیے بلایا۔ گلوکار نے بڑے انداز سے پوچھا ”پہلے کون سا گانا سناؤں؟“
”کوئی بھی سنا دو، ہمیں تو پڑوسیوں سے گھر خالی کروانا ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ (محمد بن خالد)

کرتا ہے نا! تو دُعا کیا کر اُس کے لیے! جو کسی کو زلاتا ہے، ایک نہ ایک دن وہ آنسو چل کر اس کی آنکھ میں بھی چلے جاتے ہیں۔ اگر رونے والا معاف کر دے تو شاید چھوٹ جائے ورنہ بددعا نہ دو۔ مالک آہ کا درد بھی جان لیتا ہے۔ ضروری نہیں ٹھنڈے کمرے میں سونے والی کو نیند بھی میٹھی آتی ہو۔ منیر! کسی بھی چیز کا مان کبھی راس نہیں آیا، کسی کو، تو اُسے کیا راس آئے گا۔ بڑے چاند چہرے ڈوبتے دیکھے ہیں۔ اس کا قصور معاف کر دے۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ چلی گئی، تو چلی گئی۔“ چاچے نے منیر سے کہا۔
کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں چاچا کہتا تو ٹھیک ہے۔ پر میرا نقصان بڑا کر گئی۔“
”نہ کیا نقصان کر گئی تیرا؟ رنج (بھینس) کھول کر لے گئی تیری؟“ چاچے کو ایک دم غصہ آیا۔
”رنج کھول کر لے جانی یا گھر بار لٹا دیتی، میں سی نہ کرتا۔ لیکن وہ جو نقصان کر گئی نا، وہ ساری حیاتی پورا ہونے والا نہیں۔“

”ایسا کیا نقصان کر دیا تیرا اُس نے کا کا؟“ چاچا حیران ہوا۔

”اعتبار توڑ گئی میرا! اب تو سگی ماں بھی سر پر ہاتھ رکھے تو اعتبار نہیں آتا پیار کا، لگتا ہے کہیں جھوٹ ہی نہ ہو۔ رب بھی تو یہ کہتا ہے نا چاچا، وعدہ کر دو تو سچا کرو اور دل نہ توڑو کسی کا۔ اب تو ہی بتاؤ ٹوٹے دل والے بندے کیسے جیتیں؟“

چاچے کو نظر پُرانی پڑی۔ منیر سے کی بھینگی آنکھیں اس سے دیکھی نہ گئیں۔

موتنی اور نیک فطرت ہے۔ ہر بات پر ہاں جی کہتی کیا بھاگ لگایا ہے اللہ نے مجھے۔ بے وفائی کا جو مجھے ڈھس لگاتا ہے نا، وہ اُسے نہ دے۔“
”رانو وڑے میں بیٹھی ہوتی، چاندنی رات میں تو ابھی ماند لگتا تھا۔“ منیر کی آنکھ میں جانے کون سے جاگ اُٹھے۔

”اُدبے غیرتا، ۴۰ سال وہ تیری بیوی رہی۔ آنکھ بن کر اُسے دیکھتا رہا لیکن وہ بڑی گاڑی اور کالی عینک کے پیچھے تجھے چھوڑ گئی اور تو روگ لگائے بیٹھا ہے۔“
”ہاں، کچھ غیرت کھا۔ پتا ہے مجھے تو کپڑے رنگا رنگا لاتا تھا اُس کے لیے! موسم کی ہر سوغات اس کی جھولی ڈالتا تھا مگر دنیا کے مال اور آسائش کے پیچھے وہ تیرا غاک کر گئی۔“ چاچے نے غصے سے سر جھٹکا۔

”پتا نہیں چاچا، یہ پیار کیا چیز ہے۔ بڑا چاہا میں نے اسے بھول جاؤں لیکن ناکام رہا۔ یہ خیال جان ہی نہیں چھوڑتا کہ اُس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“
”کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔“

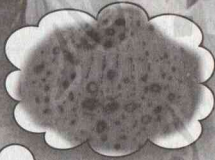
”اچھا کیسے جا یاد اُس سہنی کو، دیے جا ڈکھ بڑھے چاچے اور ماں کو!“
چاچا دل گرفتہ سا ہو گیا۔

”نا چاچا!“ منیر نے اپنا ہاتھ چاچے کے ہاتھ پر رکھا۔
”ایک تو ہی تو اپنا ہے۔ اب اپنا درد تجھ سے بھی نہ کہوں تو کس سے کہوں بتا؟“

”اُس سے اتنا پیار

”ضروری نہیں کہ
ٹھنڈے کمرے
میں سونے
والوں کو
نیند بھی
میٹھی آتی ہو“

آس پاس
کی کہانی



روٹی کا ٹکڑا

ایک بچے کا ماحبرا

جسے باتیں بہت آتی تھیں اور بھوک بہت لگتی تھی
کچھ سچائیاں اتنی کڑوی کیوں ہوتی ہیں؟

صداقت حسین ساجد

باری کا مسلح سہارے جاری تھا اور دو پہر تک جگہ جگہ سے درختوں اور مکانات سے شیلے اور دھواں اٹھتا رہا تھا۔ زیادہ تر مکان لمبے اور راہ کے ڈھیر میں بدل چکے تھے۔ یہ وزیرستان کا وہ علاقہ تھا، جو خشک اور بجز زمین رکھتا ہے۔ شہر سے باہر اس علاقے میں تیزی سے آباد کاری ہو رہی تھی، لوگ شہر چھوڑ رہے تھے۔ ہر طرف کیپ لگے ہوئے تھے، لیکن زیادہ تر لوگ مکمل آسمان تلے بے بار و مددگار پڑے تھے۔ بھوک اور بیماری نے مستقبل کے حوالے سے انھیں جس بنادیا تھا۔ کہنے کو تو حکومت کی طرف سے خوراک اور طبی امداد مہیا کی جارہی تھی، مگر وہ تعداد کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کل کا پورا دن گزرتا اور اب سورج کی پتلی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اب تک خوراک نہیں پہنچی تھی، جو تھوڑی بہت خشک خوراک موجود تھی، وہ قہر کر دی گئی تھی۔ میں پاکستانی فوج کے اس دستے میں شامل تھا، جس کا کام اس وادان بحال کرنا تھا۔ میری ذیونی خوراک تقسیم کرنے پر تھی۔ آج مجھے دوسرا ہفتہ ہوا تھا۔ مجھے سخت بے زاری ہو رہی تھی۔ لوگ مجھ سے بار بار خوراک کا پوچھتے اور میں انھیں ایک ہی جواب دے دے کر تنگ آ گیا تھا۔ اسی وقت جب میں سامنے زمین پر ایک چوٹی کو گوشت کا سڑا ٹکڑا جانے کی کوشش میں مصروف دیکھ رہا تھا کہ میرے آگے ۱۲ برہنہ پاؤں بھرے گئے، مجھے بغیر اوپر دیکھنے چلا گیا کہ یہ شے پاؤں کس کے ہیں۔

”وہی خان!“ میرا الجھن ختم تھا۔
 ”فوجی لالہ! وہ..... وہ میں.....“

”میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے لالہ نہ کہا کرو۔“ میرا الجھ مزید سخت ہو گیا۔ مجھے پٹھانوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اس واقعے میں ایک فوجی کو سب فوجی لالہ کہتے تھے، مگر وہ بہت ظالم انسان تھا۔

”مگر میں تمہیں فوجی لالہ ہی بولوں گا۔“ اس نے

فیصلہ کر لیا۔
 ”وہ کیوں؟“ میرا الجھ سرد ہو گیا۔
 ”تمہاری شخصیت ہی ایسی ہے۔ مجھے یہی تاثر ملتا ہے کہ تمہارا نام فوجی لالہ ہونا چاہیے۔ شاید مجھ سے اپنی بات کی وضاحت اچھی طرح سے نہیں ہو رہی۔“

”کس لیے آئے ہو؟“ تنگ آ کر میں نے موضوع بدلا۔ حالانکہ مجھے اس کے آنے کا مقصد اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ ۱۲ برس کا سرخ و سفید لڑکا تھا۔ اس کے جسم پر لباس نام کی صرف شلوار تھی۔ پالخت اور کھر دے تھے۔ اس کی حالت سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ بارہ تیرہ برس کا فوجی لڑکا ہے۔ حالات کی تفتیش نے اسے وقت سے پہلے ہی سخت بنا دیا تھا۔ بھوک اور غربت کے باوجود مجھے کبھی اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں التجا نہیں دکھائی دی۔ حالانکہ وہ بچہ تھا اور اسے سب سے بڑی فکر کھانے کی ہونا چاہیے تھی، مگر ایسا لگتا جیسے اسے کھیلنے کھیلنے کھانا یاد آ جاتا تھا اور وہ یہاں چلا آتا۔ جواب میں انکار سن کر وہ اپنی بھوک کو بھول کر دو بارہ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔

”مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ اس نے جیسے اعلان کیا۔
 ”مگر کھانا ابھی تک نہیں آیا۔“ میں نے وہی رٹا دیا۔
 جواب دہرا، جسے بار بار دہرا کر میں اس حد تک تنگ آ چکا تھا کہ اسے دہراتے ہوئے میرے پیٹ میں مل پڑ جاتے تھے۔
 ”مگر مجھے بہت بھوک لگی ہے، میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔“

”جوں ہی کھانا آئے گا، میں سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گا۔“ شاباش! اب جا کر کیلو۔“

”میرا کھیل میں جی نہیں لگتا۔“ اس نے جواب دیا۔
 میں کچھ دیر اس کا بھوک زدہ چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سر کھچا کر کہا۔
 ”اچھا! جاؤ اور کچھ دیر سو جاؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بچپن کی رات نہیں سوئے۔“

”میری امی کہتی تھیں کہ بھوکا سوئے نہ آدی تیار ہو

جاتا ہے۔“ اس نے ایک اور دلیل دی۔
 میں نے ایک گہرا سانس لیا اور بے چینی سے ادھر ادھر گھٹنے لگا۔ میرے پاس اسے اطمینان دلانے کے لیے کوئی کارکردگی نہیں تھی۔ وہ مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس بار اسے جھوٹا دلاسا دے کر ٹالنا نہیں جاسکتا، لیکن پھر بھی اپنی طرف سے میں نے کوشش کرنا چاہی۔ میں نے اپنے مضبوط ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے اور یقین دلانے والے لہجے میں کہا:
 ”دیکھو! اس وقت کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگر میرے اپنے جیسے کا کھانا موجود ہوتا، تو وہ میں تمہیں دے دیتا۔ آخر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا!!“

”مگر تم میرا سرے سے کھانا نہیں کھانا۔“ اس نے میرے ہاتھ جھٹکے۔ ”مجھے اپنے جیسے کا کھانا چاہیے۔ تمہیں میرے لیے بھوکا رہنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“

میں نے اس کی بات پر فطریہ قہقہہ لگایا تھا، مگر یہ جان کر میں بہت حیران ہوا کہ میری آنکھوں میں دھندلا پن اور گلے میں آنسوؤں کی نمکینی سی پھیل گئی ہے۔ اچانک مجھے اس معصوم بچے پر ترس آنے لگا اور خود سے سخن سی آنے لگی۔ آج رنج ناشتے میں، میں نے جی بھرنے کے بعد بھی بہت کچھ کھا لیا تھا، جس کی وجہ سے مجھے ہضم کرنے کے لیے بڑی دیر تک چہل قدمی کرنا پڑی تھی۔

”اگر تم صبح آ جاتے، تو.....“ میں نے پہلی کی طرح مضبوط لہجے میں کہنا چاہا، مگر میرا الجھ اور الفاظ ایک دوسرے سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔

”میں رات کو دیر سے سو رہا تھا، اس لیے صبح دیر تک سو رہا۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔
 ”کیا تمہیں بہت زیادہ بھوک لگی ہے؟“

”یہ سن کر اس کی آنکھیں پھٹیں۔“
 ”ہاں! ہاں! میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔“

اس کے سینے کی ہڈیاں آسانی سے گئی جانتی تھیں۔ پیٹ بھوک کی وجہ سے کمرے لگ گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا،

سوکھی روٹی

حضرت شیخاں کرمانی کی ایک تہی تھی جس کا رشتہ ایک بادشاہ نے مانگا مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ پھر ایک عرب نیک بخت لوگ کو اچھی طرح نماز پڑھتے دیکھ کر اس سے نکاح کر دیا۔ صاحبزادی رخصت ہو کر شوہر کے گھر آئیں تو ایک سوکھی روٹی رکھی دیکھ کر پوچھا ”یہ کیا ہے؟“

لوگ نے کہا ”رات کی“

”یہ کن روٹہ لایاؤں پیچھے نہیں۔ لڑکا بولا ”میں پہلے ہی جانتا تھا شاہ شیخاں کی بیٹی میری غریبی پر کیوں کر راضی ہوگی۔“

وہ بولیں ”شاہ شیخاں کی بیٹی غریبی پر ناراض نہیں بلکہ ناراض ہے کہ تمہیں خدا پر دوسرا نہیں ہے کر دیتی، بچا کر رکھ لی۔ مجھے اپنے والد پر توجہ ہے کہ مجھ سے تمہارے متعلق یہ کہا کر تو ایک اور پارسا نوجوان ہے بھلا جس کو خدا پر بھر دے وہ وہ نیک اور پارسا کیسے ہوسکتا ہے۔“

نوجوان عذر کرنے لگا تو کہنے لگیں ”عذر تو میں جانتی نہیں گھر میں رہوں گی یا یہ روٹی رہے گی۔“

نوجوان نے وہ روٹی فوراً خیرات کر دی جب وہ بچپن سے گھر نہیں لے۔

(عظمیٰ خرم، لاہور)

مجھے اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے، مگر میں کیا کرتا، کیوں کہ خوراک ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

”کچھ بھی مل جائے۔“ اس نے بات جاری رکھی۔

”کچھ بھی..... بسکٹ کا ایک آدھ ٹکڑا..... ایک بھجور کا دانہ..... کوئی بھی چیز.....“

جانے کیوں مجھے معدے میں اینٹھن سی آشتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی طرف پیچھے کی اور جھک کر تسے ہانڈھنے کے بہانے آنسو صاف کرنے لگا۔

”میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے

یہ ایک فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

”یقیناً یقین ہے کہ میرے لیے کچھ نہ کچھ مل جائے گا!“ اس کی آنکھیں امید کی کرن سے جھلک رہی تھیں۔
مجھے پتا تھا کہ اس کی امید بہت کم تھی، مگر میں اسے نفی میں جواب دے کر اس کے تپنے سے دل کو تڑپانا نہیں چاہتا تھا۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ پھر شاید مجھ میں انکار کرنے کی ہمت نہ تھی۔

”ہاں! مجھے یقین ہے۔“ میں نے اس کے روئی کی طرح نرم رخساروں کو چھوٹایا۔ ”تم دکراؤ۔“
اس نے اثبات میں سر ہلایا جیسے کھانا حاصل کرنے میں اس صے کی کوشش صرف دعا تک ہے اور وہ اپنے صے کا کام اچھی طرح سے پورا کرے گا۔

”آؤ۔۔۔۔۔ چلیں! ہم اپنی تلاش کا آغاز راتیں ڈپو سے کرتے ہیں۔“

میرے دونوں اگستے ہی راتیں ڈپو کی طرف چل دیے۔ میری اگلی اس کے صے سے نرم ہاتھ تھی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے بڑا سونے محسوس ہو رہا تھا۔
”تم بہت اچھے ہو۔“ وہ بہت باتوں تھا۔ وہ چپ ہوتا ہی نہیں تھا۔ ”تم سے پہلے جو فوجی لالہ تھا، وہ بہت سخت تھا۔ مجھے اس کے پاس جاتے ہوئے بڑا خوف آتا تھا۔ پتا ہے۔ اس کے غصے کی سب سے بڑی نشانی کیا تھی؟“
”کیا تھی؟“

”وہ اپنی ہی ٹانگ پر بڑے زور زور سے بید مارتا تھا جانتے کیوں؟؟؟ کیا اسے درد نہیں ہوتا تھا؟“
”کیا پتا۔۔۔۔۔ نہ ہوتا ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ ہوتا ہوگا۔ میں نے ایک دن اپنی چھڑی اپنی ٹانگ پر ماری تھی، تو مجھے بہت درد ہوا تھا۔۔۔۔۔ حالانکہ میں نے اتنے زور سے بھی نہیں ماری تھی۔“ پھر وہ پر خیال انداز میں خود ہی نتیجہ نکالنے لگا۔ ”مگر یوں بھی تو ممکن ہے کہ میری ٹانگ کسی گتھی میں اور اس کی ٹانگ پر سونے کیڑے کی دیر کی گتھی کی طرح کی تھادی ہے۔“
وہ میری وردی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

”لو! راتیں ڈپو آگیا۔“ میں نے اسے بتایا۔
”تم دیکھ لو! ایک میں ادھر ہی دروازے پر کھڑا ہوں گا۔“
میں اندر داخل ہو گیا۔ وہاں خالی ڈپوں کا ڈھیر موجود تھا۔ میں بڑی دیر تک کھانا کھا رہا، مگر مجھے کچھ نہ ملا۔
میں جب باہر نکلا تو میرا سر جھکا ہوا تھا۔

”ولی خان! مجھے فسوس ہے کہ۔۔۔۔۔“
”کوئی بات نہیں فوجی لالہ! مگر ہمیں اپنی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔
تم نہیں کی طرف چل پڑے۔ یہاں کھانا ملنے کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہمارا کھانا وقت پر آ جاتا تھا اور جو بچہ جاتا، اسے جو سے لوگوں میں بانٹ دیا جاتا۔ مگر میں اس مہم امید پر جا رہا تھا کہ شاید کچھ مل جائے۔ ایک آدھ روٹی کا ٹکڑا۔ ایک بسکٹ۔۔۔۔۔ کوئی بھی چیز۔
”تم کہاں سے آئے ہو؟“ چند لمحوں بعد اس نے چلے جلتے خاموشی کو توڑا۔
”چٹا بے۔“

”کیا وہاں جنگ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ کیا وہاں بھی لوگ بھوکے سوتے ہیں۔۔۔۔۔ کیا وہاں بھی بچوں کے امی ابو بارود میں جل کر رہا جاتے ہیں۔“

”یہ کن کمرے گئے میں کانٹے سے چھپنے لگے۔“

”تمہارے امی ابو کہاں ہیں؟“
”گزشتہ مہینے جو ہمساری ہوئی تھی نا۔۔۔۔۔ اس میں سے ایک ہم ہمارے گھر پر گرا تھا۔ امی ابو دونوں ہی مر گئے۔ ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ گئے۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ”مگر مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ ہر وقت مجھے دکھائی دینے والے امی ابو اب مجھے بھی دکھائی نہیں دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ مصنوعی سا لگتا ہے اور کبھی کبھی تکلیف دہ بھی۔ کبھی کبھی مجھے بڑی شمت سے ان کی طلب ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ان کی گودی۔۔۔۔۔ ان کے پیاری۔ میرے پاس بہت سی باتیں تھیں جو بچائی ہیں، مگر اب میں انہیں پسلی کی طرح سانپیں سماتا تو میرا سینہ چھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں یہ ساری باتیں پوی سے کر لیتا تھا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ ہمارے درمیان خاموشی کا ایک لمبا وقفہ در آیا۔ صرف ہمارے قدموں کی چاپ ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ پوی کون ہے، مگر مجھے خوف تھا کہ اگر میں بولا، تو وہ رونے لگے گا۔

اسی دوران ہم میں پہنچ گئے۔ میرا دل رورور کر اٹھا کر رہا تھا کہ کھانے کو کچھ مل جائے۔ اس وقت بھری کا نانا مجھے بڑی فضول اور بے رنگ سی لگ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اب میری زندگی کا مقصد کھانا حاصل کرنا ہے، جو اس تپنے سے پیٹ میں لگی بھوک کی آگ کو بجھا دے۔

میں گیسٹ کے پاس جا کر وہ چمچ گیا اور ساتھ فقرہ دہرایا۔ ”تم جاؤ! میں یہاں ٹھہر کر تمہارا انتظار کروں گا۔“
میں نے سر ہلایا اور اندر جانے لگا، تو اس نے مجھے پھر آواز دی۔
”فوجی لالہ!“

میں نے مڑ کر اس کی طرف کن آنکھیں سے جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

”میں دعا کروں گا۔“ اس نے اپنے چھوٹے سے ہاتھ دعا کے لیے اٹھالے۔
”ضرور بیٹا! کبھی کبھی سارے مسئلے ایک دعا سے ہی حل ہو جاتے ہیں۔“ میں نے ہونٹ ہنسی کر کہا۔
”اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے؟“ اچانک اس کا لہجہ بڑگانے لگا۔

میں اندر داخل ہو گیا۔ میں سناتا تھا۔ میں اخبار کا کونڑے کے پیچھے کرسی پر سو رہا تھا۔ میں نے میں کا کونا کونا چھان مارا، مگر مجھے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ مجھے مایوسی کی حالت میں بڑا غصہ آنے لگا۔
”یا اللہ! اب مجھ سے سارا کچھ چین لے، مگر مجھے روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دے۔“
مجھ میں دلی خان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں میں سے باہر آنے کے بجائے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

توکل

ایک دن حضرت حاتم اصمؓ نے اپنی بیوی سے فرمایا، ”میں جہاد پر جاتا ہوں ۱۴ مہینے کے لیے، کس قدر خوش درکار ہوگا؟“
بیوی نے کہا، ”جس قدر میری زندگی ہے۔“

حضرت حاتم اصمؓ نے فرمایا:
”تمہاری زندگی میرے ہاتھ میں نہیں۔“
بیوی نے کہا، ”پھر میرا رزق بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں۔“
آپ نے آبدیدہ ہو کر کہا، ”توچ کہتی ہے۔“
اور جہاد کے لیے روانہ ہو گئے۔
(محمد آصف قریشی، ملتان)

میں نے کاؤنٹر چھوٹایا، تو میں اخبار نے ہولکا کر آنکھیں کھولیں، مگر مجھے دیکھنے ہی اس کے چہرے پر برقی کے تاثرات آ گئے۔ شاید اسے میری دخل اندازی بری لگی تھی۔

”کیا بات ہے؟“
”کچھ مل جائے گا؟“

میرا لہجہ ایسا بے بس اور انتہائی آمیز تھا کہ جیسے میں صدیوں سے بھوکا ہوں۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے دوبارہ آنکھیں پتھ لیں۔
”تم دیکھو، تو سہی۔“ میں کاؤنٹر پر جھکا۔ ”شاید کچھ مل جائے۔“ صبح کا بیجا بھیا۔

”تمہارا دماغ تو درست ہے۔“ اس کا لہجہ تند ہو گیا۔ ”جب ایک بار بتا دو ہے کہ کچھ بھی نہیں، تو بار بار پوچھنے کی وجہ۔“

”شاید کچھ۔۔۔۔۔ روٹی کا ایک آدھ ٹکڑا۔۔۔۔۔ ایک بسکٹ۔۔۔۔۔“ میرا لہجہ بھرا گیا۔

”دیکھو صاحب!۔“ وہ سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”یہ ڈراما بند کرو اور جاؤ۔ زیادہ بھوک لگی ہے، تو خوشی کرو، میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں۔“
اس کے لٹیکے بھرے لہجے نے مجھے غصہ ناک کر دیا۔

دیا۔ اچانک میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور کاؤنٹر کے اوپر سے گھٹینا ہوا باہر لے آیا۔ شاید وہ ابھی تک غنودگی کے عالم میں تھا۔ میں نے الٹا ہاتھ اس کے منہ پر سرید کیا تو وہ اچھل کر پیچھے جا کر۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ سے یوں لگتا تھا، جیسے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔

”کیوں نہیں ہے کچھ..... راشن ڈپو میں کچھ نہیں ہے، میں خالی ہے، تو پھر کہاں گیا کھانا؟“ ہمارے پیٹ میں.....؟“ میں ہسٹریا والے مریض کی طرح حلق کے بل چیخا۔

”ارے..... ارے آفسیر! ہوش میں آؤ! کیا کر رہے ہو؟“ کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ہتھجھڑا۔

میں نے چونک کر اپنے آس پاس دیکھا۔ میں کا سارا عملہ ہمارے گرد اٹکھا ہو چکا تھا۔ مجھے ہوش دلانے والا میرے ہی رینک کا فوجی تھا جس کی ڈیوٹی بھی کبھی میرے ساتھ راشن ڈپو میں لگتی تھی۔

”میں کیا کروں آفسیر! وہ بھوکا ہے۔“ میں نے اس کے شانے سے اپنی پیشانی لگا کر سسکی لی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لپیٹا لیا۔

”کون بھوکا ہے دوست!“ اس کے سرخ و سفید چہرے پر حیرت اُٹھ آئی۔

”دوست! مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا چاہے تھا، مگر جانے کیسے ہو گیا؟“

”دوست! خود کو سنبھالو۔“ اس نے میرے کندھوں کو چھپایا۔

میں بڑی مشکل سے پاؤں گھٹینا ہوا باہر نکلتا آیا۔ میرے چہرہ دیکھ کر وہ اصل بات کی تہ تک ہنچ گیا۔ اس نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ خاموشی سے میری آنکھ تھائی اور بغیر سوچے ہم ایک طرف چل پڑے۔

”جیسے معلوم ہے کہ پوری کون تھا؟“ اس نے اپنی ناکمل بات آگے بڑھائی۔ مجھ سے بولا نہ کیا۔ میں نے

منکھولا، مگر مجھے یوں لگا کہ جیسے میں بیچ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دوں گا، اس لیے میں نے جلدی سے اپنے ہونٹ ہتھجھک لیے۔

”وہ میرا اچھوٹا سا سفید بکرا تھا..... روٹی کی طرح نرم و ملائم۔“ وہ دوبارہ بولنے لگا، ”۳۳ مارچ پہلے وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ جلد ہی میرا دوست بن گیا۔ اسی ایلو کے بعد وہ میرا بہت اچھا ساتھی تھا۔ جب جنگ شروع ہوئی، تو ایک بیج جب میں جا گا، تو وہ غائب تھا۔ میں نے اسے پاگوں کی طرح قید و خانہ کوٹا کھانا چھوڑ دیا۔“

وہ سسک کر خاموش ہو گیا، مگر صاف لگ رہا تھا کہ اس کے پاس کہنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے، مگر اتنا تلخ ہے کہ اس کی بہت نہیں ہو رہی، لیکن وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے دوبارہ بولا۔

”مجھے ایک جگہ بکری کے ایک ٹی سی ٹانگ ملی۔ وہ ٹانگ پوری سے ٹی جلتی تھی۔ شاید وہی ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی اور ہے۔ پوری کھیلنے کے لیے کہیں گیا ہوگا اور راستہ بھول گیا ہوگا۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔“ وہ خیالوں میں گم ہو گیا۔ ”فوجی لالہ! جب وہ لوٹے گا، تو میں اسے بہت ڈانٹوں گا۔ کسی سے وہ نہیں ڈرتا، صرف مجھ سے ڈرتا تھا۔ میں تھوڑی دیر یوں کا بھی نہیں۔“ اس کے کہوں کا جب مجھے تیری ضرورت تھی، تو تو مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا..... دوست! کیسے ہوتے ہیں کی؟“

میں نے مڑ کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑا کرب تھا۔ پھر میری آنکھوں میں امنڈنے والی نمی نے اس کا کرب زیادہ چہرہ دھندلا دیا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی راستہ بھول گیا ہو۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی جملے میں مر گیا ہوگا۔

”ہاں! اچھے کیوں یقین ہے کہ وہ مر سکتا ہے نہ مجھے اس حال میں چھوڑ سکتا ہے۔“

میرے جھوٹے دلاسنے اس کا غم آدھا کر دیا۔ میں اسے اور تسلی دینا چاہتا تھا، مگر مجھ میں اب اور بولنے کی

طاقت نہیں رہی تھی۔

”مگر وہ بہت بھوکا ہو گا۔“ مجھے خاموش دیکھ کر وہ خود ہی کچھ سوچ کر بولا۔ ”وہ صرف میرے ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا۔ شاید وہ مجھ سے زیادہ بھوکا ہو، ہم کچھ کھانا اس کے لیے بجا کر رکھیں گے۔ وہ کبھی وقت آسکتا ہے۔“

میرا دل چاہا کہ اکیلا کسی کوٹنے میں چھپ کر کھٹکوں میں سر دے کر چلا چلا کر روؤں۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں خشک ہو جائیں۔

ہمارا باقی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ ہم بے خیالی میں جہاں پہنچتے تھے۔ وہاں قطاروں میں ٹرک کھڑے تھے۔ میری آنکھیں امید سے چمک پڑیں کہ ہو سکتا ہے کہ نہیں یہاں سے کچھ نہ کچھ مل جائے۔ شاید ان میں کچھ رہ گیا ہو۔ شاید کسی ڈرائیور سے بات کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے ممکن ہے کسی نے کچھ بچا کر رکھا ہو۔

میں نے ایک ٹرک میں ڈرائیور والے گیٹ کی طرف سے جھانکا۔ اندازاً ٹرک ڈرائیور سو رہا تھا۔ میں نے اسے چگانا مناسب نہ جانا اور پچھلے حصے میں داخل ہو گیا، مگر وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کی تلاشی لی، مگر بے سود۔

مجھے چند ڈرائیور جاتے ہوئے ملے۔ وہ تھکا کھیل رہے تھے۔ میں نے ان سے بات کی، مگر انھوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

میں وہاں سے بھی مایوس لوٹ آیا۔ میں جب ان سے کچھ دور ہوا، تو انھوں نے بڑے زور کا قہقہہ لگا دیا تھا۔ یہاں بھوک سے مرتے لوگوں کو دیکھ کر ان کا احساس پتھر ہو گیا تھا۔ انھیں حیرت ہو رہی تھی کہ ایک لاوارث بچے کے لیے میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر مارا مارا پھر رہا ہوں۔

علاقے کے لوگوں پر ۳۳ مئی میں ایک ساتھ نازل ہوئی تھیں۔ افغانوں نے بچے لوگوں کو اپنا کد کار بنایا۔ ان کی مدد کے لیے ان ممالک نے اپنے ایجنٹ بھیجے جنھوں نے سادہ لوح لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔ پھر ان لوگوں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر ڈالا۔ خواتین کی عزتیں

محفوظ نہ رہیں۔ لوگوں کو پکڑ کر جانوروں کی طرح ذبح کیا گیا، جو بھی ان کے آڑے آیا، وہ پتھر زندہ نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہوتا رہا، وہی دین جو اس کا دین ہے۔ اس کا کوئی مرضی کے مطابق مسیح کر کے اوردو زموڑ کر پیش کیا گیا۔

حکومت پہلے تو اپنے مفادات کی وجہ سے ان سے غفلت برتی ہی، جب معاملات حد سے بڑھ گئے، تو انھیں ہوش آیا، لیکن اس وقت پانی سرے بلند ہو چکا تھا۔ انھیں اتنا وقت مل چکا تھا کہ وہ اپنی جڑیں پورے ملک میں پھیلان۔ وہ اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ انھوں نے حکومت کو چیلنج کر دیا۔ ارباب اختیار نے مذاکرات سے ان حالات کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکامی ہوئی، تو پاک فوج نے تھوڑے ہی عرصے میں اس علاقے کو ایسے غلغلہ صفت اور شرسندوں سے خالی کر لیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ عالمی امن کا سب سے بڑا دعوے دار امریکا وہاں کے معصوم لوگوں پر ڈرون حملے کر لگا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا ابھی ٹرکوں سے باہر نکلا تھا کہ اسی لمحے آسمان پر ایک قرمز رنگ کا شعلہ چمکا۔ میں نے ایک طرف جھلک کر لگا کر دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیے اور اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ اسی وقت ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ فضا مکمل دھماکوں سے لرز اٹھی۔ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹنے ہوئے محسوس ہوئے۔ مجھ پر پتھروں اور مٹی کی بارش ہوئی رہی۔ آخر سکوت چھا گیا۔ میں نے کبھی ہونٹ لگا ہوں سے سر اٹھا کر آسمان پر ایک ڈرون جہاز کو واپس جاتے دیکھا۔ پھر مڑ کر ٹرکوں کی قطار کو دیکھا۔ یہی ٹرک تباہ ہو چکے اور کچھ جل رہے تھے کہ اچانک میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ ٹرکوں کی نینکیاں کسی بھی لمحے آگ پکڑ کر پھٹ سکتی تھیں۔ نتیجے میں لوہے کے گرم گرم ٹکڑے ادھر بھی آسکتے تھے۔

اچانک مجھے ولی خان کا خیال آیا، جسے میں ٹرکوں سے کچھ فاصلے پر چھوڑ آیا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں

دلیوانہ دار محبت کرنے والی
ایک لڑکی کا افسانہ

داڑے

وہ ہر حد پہلا ننگے کی
خواہش مند تھی
ایسی خوب صورت کہانیاں
تادیر یاد دہنتی ہیں

آسانی حسن فی مستعان مومن مستدازی
بشکریہ: جلیلا احمد مصطفیٰ

”فوجی لالہ! اس کا لہجہ کزور پڑنے لگا۔
”تم کچھ کہنا چاہتے ہو نا؟“ میں نے اس کی پیشانی
چوم کر پوچھا۔
”ہاں..... آں..... ہاں.....“ اس نے سر کو ہلکی سی
حرکت دی۔

”فوجی لالہ! یہ ہم نے امریکی لوگوں کا کیا لڑا ہے۔
یہ ہم کو بمبوں سے کیوں مارتے ہیں؟ ہم تو پیپل ان کی وجہ
سے بمبوں کے مر رہے ہیں۔“ دلی خان! میرے پیچے!
”تم بہت نہ بارو۔“
”تم دنیا کو بتا دینا کہ..... گلک کہ.....“ اس سے بولا
نہیں جا رہا تھا۔

”دلی خان! میں سن رہا ہوں..... بولو۔ شاباش!“
”گلک..... گلک کہ..... سمجھو..... سمجھو بمبوں.....“
اس کی بات اور اجھوری رہ گئی اور گردن ایک طرف کو
ڈھلک گئی۔ میرے چہرے کو کتنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے
ساکت ہو گئیں۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔
وہ مر چکا تھا۔
”دلی خان.....! بولو دلی خان.....!“ میں نے اسے
سینے سے چٹایا۔

میں اس کے سینے پر سر رکھ کر بڑی دیر تک بلک بلک
کرتا رہا۔ میرے ساتھیوں نے آکر مجھے اٹھایا۔ جو ٹرک
ڈرائیور بچ گئے تھے، وہ ہمارے گرد کھڑے تھے۔ اب کسی
کی آنکھوں میں تھینک نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی سے دلی خان
کے ساتھ میری جذباتی وابستگی سے آگاہ تھے اور ممکن ہے
اب اپنے اس فراق پر غم مند ہوں۔

میرے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالیا۔
دوسرے نے دلی خان کو اٹھا کر سڑک پر لٹا کر اس کے اوپر
سفید چادر ڈال دی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک روٹی کا
ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اب بھی مجھے لگتا تھا
کہ یہ ایک بھوک زدہ چہرہ ہے۔

اس طرف لڑکا۔ وہاں اڑتی خاک اور لپے لپے جلدی
سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بھاگنے کے دوران مجھے چوٹ بھی لگی،
مگر مجھے اس کا کوئی احساس نہیں تھا، کیونکہ میرے حواس پر
دلی خان سوار تھا۔ میرے اندیشے کانٹوں کی طرح چبھ
رہے تھے۔ اس تپ اور بھوکے بچے کے بچ جانے کی امید
بہت کم تھی۔

میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ جلد ہی وہ مجھے ایک
دروازے کے نیچے مل گیا۔ اس وقت وہ دروازہ جل رہا تھا
اور بہت گرم تھا، مگر میں نے پکڑ کر پوری قوت سے ایک
طرف پھینک دیا۔ میرے ہاتھ جل گئے، مگر مجھے ایسا لگ
رہا تھا جیسے میرے اندر درد کی حس ہی مر گئی ہو۔ اس کی
ایک ٹانگ گیت کے پھل سے کٹ گئی تھی۔ وہاں سے
اب خون پرنالے کی طرح بہ رہا تھا، وہ زندہ تھا۔ میں نے
اسے جلدی سے اٹھایا اور اندھا دھند ٹرکوں سے دور بھاگنے
لگا۔ نشیب میں اتر کر میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بچکیاں
لے رہا تھا۔ اس کے متغیر چہرے کا رنگ تیزی سے زرد
ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں روٹی کا ایک سوکھا ہوا
چھوٹا سا ٹکڑا تھا، جو جانے کہاں سے اسے مل گیا تھا۔
”جنگ خود ایک مسئلہ ہے، یہ مسائل کو حل کیا کرے
گی۔“

وہ اُنک اُنک کر بولنے لگا، پھر خاموش ہو گیا۔ میں
نے اپنی قمیض اتاری اور اس کی ٹانگ تختی سے باندھ دی۔
اس وقت میں خود کو بہت مجبور سمجھ رہا تھا۔ اس کی ٹانگ
سے بہتے خون میں کوئی کن نہ آئی۔ میری خامی قمیض جلد ہی
سرخ ہو گئی اور اب ہوکے قطرے باہر دس رہے تھے۔

”فوجی لالہ!“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تم..... تم.....
میرے لیے رو رہے ہو؟“

”ہاں!“ میں نے بے اختیار ہنسی لی۔
”کیوں؟“ اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا۔
”اس لیے..... اس لیے کہ میرے بچے! میں تمہیں
بہت چاہتا ہوں۔“ میرے آنسو اس کے چہرے پر گرنے
لگے۔

ان دنوں کی بات ہے جب میں جوان اور میری بیوی کی عمر ۲۳ سال تھی۔ جوانی میں بالعموم میاں بیوی ایک دوسرے کے تقریباً دیوانے ہوتے ہیں، مگر اسے میری بدقسمتی بھی کہہ لیجئے کہ میری ازدواجی زندگی میں مسرت و خوشی کا ایک بھی پھول نہ نکلا۔ شادی ماں باپ کی مرضی سے ہوئی تھی، لڑکی کا انتخاب بھی انہوں نے کیا تھا۔ ان کے تجربہ بات کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ دوسرے نو جوانوں کی طرح شادی کے بعد میرے گھر میں بھی بہار آجائے گی۔ میں بھی محنت کے نغمات میں گویا رہوں گا۔ یہ تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شادی کے بعد خزاں کی کوئی پرچھاں بھی ہمارے گھر میں پڑے گی۔ مگر ہوا بھئی کہ بہار کے بجائے خزاں میرا مقوم ہوگئی۔ میری شریک حیات نہ صرف شکل و صورت کے اعتبار سے میرے معیار سے قطعی مختلف بلکہ اس کی مزاجی کیفیت بھی میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس کے ہونٹوں پر میں نے بھی ہنسنے کی پریوں کو قفس کر دے نہ دیکھا۔ اس کے لبوں نے بھی میرے کان میں شہد نہیں گھولا۔ اس کے بجائے اس کی تیوی ہمیشہ پڑھی دیتی۔ اس کے تلخ جملوں میں مجھے زہری تلخی محسوس ہوتی، یہ سب باتیں میرے لیے انتہائی روح فرسا ہیں، مگر شاید میں اس کا خوگر ہو جاتا لیکن مصیبت یہ کہ پڑی کہ شادی کے بعد وہ شدید بیمار ہوئی اور ایسی بیمار کہ کبھی دو ہر اسے ہسپتال میں داخل کر پڑا۔

ڈاکٹروں نے پہلے ہی دن مہینے کے بعد بتا دیا کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گی۔ میں سبک دل نہیں ہوں کہ کسی کی تکلیف سے متاثر نہ ہوں لیکن اس کی خضرناک بیماری سے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں بچے گی، میں ذرا محنتاثر نہ تھا۔ چنانچہ میں اس کی عیادت کے لیے ہسپتال بھی نہیں گیا۔ اخلاقاً چلا جاتا تھا۔ اس نے میری اس سہمہری کا اس نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ وہ کبھی کسی طرف شکایت کا زبان پر نہیں لائی بلکہ ایک دن جب میں کسی دن کے بعد ہسپتال گیا تو اس نے رخصت ہوتے وقت مسکرا کر کہا:

اب تمہیں زیادہ دن زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔ پابندی کی یہ زنجیر جو تمہارے پاؤں میں پڑی ہے، بہت جلد ٹوٹ جائے گی

میں کو ایک تہیہ لڑی مگر اس کے چہرے پر تہیوں کی آواز ہے کسی نہیں پرستی تھی۔ وہ سبک مرے سے اٹھا ہوا حسین بُت تھی۔ تمام فکروں سے آزاد، سکول تے جاتے میں نے کئی بار اسے دزدیدہ دکھایا تو وہ اٹھا اور میرے دل نے بے پرواہی کی کہ لادان مرغیام کی حسین رہا بھی کی شکلِ تعمیر ہے۔ مگر اس سرگوشی کے اندر میں نے بھی سن چکا تھا کہ بعض بڑے بڑے لوگ اس پرستی ہیں کہ یہ پھول ان کے حصے میں آئے۔

لادان کے گھر والوں سے ہمارے اچھے تعلقات تھے، اب بھی ہماری گھر آتی بھی تھی۔ ایک روز میں نے کہا کہ اگر میں اس طرح وقت نکوتا رہا اور لادان میرے گھر سے نکلی کی تو پھر کیا ہوگا؟ اگر یہ بھی میں مان لوں کہ لادان سے بہتر لڑی بھی نظر آسکتی ہے۔ پھر بھی یہ اور ی تو نہیں کہ وہ مجھے کوئی بھی کرے۔ یہ سوچ کر میں صحت سے مایوس ہو چکے تھے اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ اس عورت کے ساتھ میری ازدواجی زندگی بھی مسرتوں سے مستحکم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں اس کے صحت یاب ہونے اور انتظار کروں اور شاید اسی جذبہ کا رول تھا کہ انہوں نے انتہائی تیزی کے ساتھ کوئی ایسی شریف اور خوبصورت لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی جو میرے معیار کے مطابق اسے میری خزاں رسیدہ زندگی کو بہار کے مقہوم سے آہستہ کر سکے۔ لیکن میں نے سمجھ ارادہ کیا تھا کہ اس مرتبہ با والدین کو شادی کا اختیار نہیں دوں گا۔ اب سعادتمندی کا اظہار کر کے میں اپنی زندگی تباہ کر چکا تھا۔ اب میں دوبارہ اس کا اعادہ کرنے کے لیے اپنے کو کسی طرح آمادہ نہیں کر پاتا تھا۔

اس پروگرام کے مطابق اب بار میں نے خود اپنے گرد نظر ڈالی، اپنے لئے والوں، دوستوں سے کہا اور خاندان کی لڑکیوں کا جائزہ لیا۔

اس جائزے میں مجھے لادان کی شکل میں ایک متہنہ کلی نظر آئی۔ لادان ایک ۲۰ سالہ اور سکول کی طالبہ تھی۔

گھر کا وہ بچہ جتنی اتنی اور پھر اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اور مجھے قہر آلود دکھایا تو میں نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے اور غصے سے اس کا بدن کا پ رہا تھا۔

”تم..... اور..... میں.....“ غصے کی وجہ سے وہ اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر سکی۔

لادان کی یہ کیفیت دیکھ کر میں چند لمحوں کے لیے تو بُری طرح گھبرا گیا۔ مگر میں نے جلد ہی اپنے آپ کو قابو پایا اور اسے بڑی نرمی سے مخاطب کیا:

”لادان میں نے کوئی بُری بات تو نہیں کہی ہے، بجائے بگڑنے کے تم کو جتنا چاہتی ہو صفائی سے کہو۔“

اس نے میری بات ان ہی کرتے ہوئے کہا۔

”عجب بات ہے، مجھے جانے دو۔“ اور یہ کہہ کر وہ تیری طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

مجھے مشتق و محبت کا اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے سنسن کو اس طرح برہم ہوتے ہوئے بھی سنی نہ دیکھا تھا۔ میں اپنے اس اقدام پر کئی دن متغیر رہا مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس افعال کے باوجود میں لادان کو نہ بھلا سکا۔ اس کی تصویر میرے دل پر منکس ہوئی تھی۔

اس کے بعد پھر مجھے لادان سے ملنے کا اتفاق ہوا، مگر والدہ کی موجودگی میں اس لیے زبانی تو میں اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ میری نظر میں اس نے بہت کچھ کہہ دیا۔ اس کے بعد کئی بار اسکول آتے جاتے میں اس کا سامنا کرتا ہوں اس کا تبادلہ ہوتا رہا اور میں نے دیکھا کہ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس چمک کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی گلیاں چمکنے لگیں۔ ہم دونوں بہت قریب ہو گئے۔ میں نے اس سے وہ تمام محبت بھرے جملے کہہ دیے جن کو ادا کرنے کے لیے میں مدت سے ترس رہا تھا۔

لادان کی ماں باپ تھی کہ وہ جلد از جلد اس کے بوجھ سے سکدھوش ہو جائے۔ اس کے اقتصادی حالات اب جوان لڑکی کو زیادہ عرصے تک گھر میں بٹھائے رکھنے کی

اجازت نہیں دیتے تھے۔ مجھے لادان کی والدہ کی اس خواہش کا علم تھا اور اسی کے پیش نظر میں نے لادان سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنی بیوی کے مرنے سے پہلے اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اس معصوم وہ شیراز کو میری مجبوری کا صحیح اندازہ تھا مگر وہ اپنے تھریلو حالات کی بنا پر مجبوری کہ اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرے۔ لیکن میری محبت کے جو پھول اس کے دل میں کھلے ہوئے تھے، ان کی بنا پر میرے علاوہ کسی دوسرے مرد کا تصور بھی اسے گوارہ نہ تھا۔

ہم دونوں روز بروز قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ میری محبت میں تقریباً دنیا کی ہر چیز کو فراموش کر چکی اور اس درجہ جذباتی ہو چکی تھی کہ بغیر کسی دینی و دنیاوی رسم کے میری زندگی میں شریک ہونے کے لیے تے تاب تھی۔ جوانی کے تھانے اخلاقی تقاضوں سے مخفی ہوئے جا رہے تھے اور یہ ایک ایسا نازک مرحلہ تھا جب کہ ایک نوجوان اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ قریب تھا کہ میں بھی اس ہیجان کا شکار ہو جاتا کہ اچانک میرے دل نے مجھے متنبہ کیا اور میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میرے منہ سے لگا، ”تم پرانی امانت ہو۔“

لادان پردی کا جو انداز لے کر آگے بڑھی تھی، اس سے انکار کر کے میں نے سُن کر برہم کر دیا۔ یہ بہت بڑی خطا تھی، چنانچہ لادان میں سے خفا ہوئے۔ اس نے نفرت سے منہ سکیڑ لیا۔ اس کے چہرے پر جلال برسنے لگا اور وہ یہ کہہ کر غصہ سے پاؤں پکاتی ہوئی چلی گئی۔

”بے قدرے انسان! میرے دل میں اب تیرے لیے نفرت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔“

مجھے لادان کی خشکی سے شدید صدمہ ہوا لیکن اس صدمہ کے ساتھ میں نے ایک عجیب سی راحت محسوس کی، بہت ہی عجیب اور میرے دل نے کہا:

اگر تو سُن کے اس التفات بے پایاں

کوٹھکراتا تو عشق میں وفا کا لفظ ہمیشہ کے لیے بے معنی ہو جاتا

“

میری بیوی ابھی تک زندہ تھی۔ بظاہر وہ موت نزدیک تھی مگر معلوم ایسا ہوتا تھا کہ مجھے موت سے کبھل رہی ہے اور نہ معلوم موت کا یہ کھیل کب تک جا رہے۔ بیوی کی اس زندگی اور اپنی محبت کی خود ناکامی سے میں بے حد غمگین تھا۔ حراج میں شدت چڑچڑاپن پیدا ہو گیا تھا۔ کسی محفل میں دل نہیں لگتا تھا۔ چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر کسی دیرانے میں نکل جاؤں میرے دوستوں نے میری اس حالت کو محسوس کیا اور یہ بہلانے کے لیے قفس و دفتری محفلوں میں لے جانا شروع کیا۔ اس قسم کی ایک محفل میں پہلی مرتبہ میں نے سون قفس کرتے دیکھا۔ اس کے خدو خال بے حد دل آویز تھے۔ آنکھوں میں سمندر سی گہرائی، مسکراتے کا خاص انداز، اُسے دیکھ کر کسی مینے بعد پھر مجھ میں زندگی آ بیٹھا ہوا ہے، میں نے اس کے قفس میں خاص دل لی اور میری اس دلچسپی کے پیش نظر میرے ایک دوست نے مجھے سون سے باقاعدہ متعارف کرادیا۔

ہی ملاقات میں ہم بہت جلد مکمل مل گئے۔ باتیں کر میں اس کی زبان سے پھول جھڑتے تھے۔ وہ ایک جو اور صحت مند خوش اخلاق اور مہذب لڑکی تھی اور ایک ادا گھرانے کی تھی اور قفس و دفن سے اُسے کافی لگاؤ تھا۔ وہ لادان سے ہر اعتبار سے بہتر تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ مجھے وہ کبہ رہی ہے ”اگر میں تہوار قریب رہوں تو دنیا کا کوئی غم تہوار سے پاس نہیں آ سکتا۔“

لادان کی بے مہری و بے اعتنائی نے جو دُغم میرے دل میں ڈال دیا تھا سون کی عمر انگیز شخصیت نے بہت

لگاؤ کو بکھرا دیا۔

ہماری ملاقاتوں میں تسلسل پیدا ہو گیا اور ایک دن وہ میں اس سے کہنے ہی والا تھا کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے خود سکراتے اور شرماتے ہوئے کہا۔

”تم میرے ہوش و حواس پر چھا گئے ہو۔“

یہ میری زندگی کا ایک اہم ترین سرورکن لمحہ تھا۔ میں ایک لمبے کی صحیح کیفیت الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کر سکتا۔ اس اعترافِ محبت کے بعد ہم دونوں دنیا و مافیاسے الگ تیار ہو گئے۔ میری پوری شدت سے خواہش تھی میں سون سے جلد از جلد شادی کر لوں لیکن میری بدبخت بیوی بدستور زندہ تھی۔ موت و زندگی کا مشعر کہ رخصت ہونے جاری تھا۔

اس دوران کئی ایسے مواقع آئے جب ہم دونوں رہاوت میں سب کچھ فراموش کر دینے کو آمادہ ہو گئے لیکن موقع پر میری بیوی کی پیاری کے محبت ناک و بھیاک صورت نے مجھے بڑی تیزی سے روکا اور محبت کی نادانی کے ماحول کو دوسرے جھکانے کا موقع نہیں دیا۔

اس زمانے میں جبکہ میں اور سون محبت کی وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے، ایک دن اچانک میرے شمرنے کے بلا کر کہنا۔

”اشاک ہام میں ایک مشہور ڈاکٹر ہے جو اس مرض کا اسپیشلسٹ ہے جو تمہاری بیوی کو ہے۔ اس سے قطع نظر کہ تم اس بدبخت لڑکی کے شوہر ہو، انسانیت کا بھی یہ فاضل ہے کہ تم اس کو اس صحبت سے نجات دلانے کی کوشش کرو۔“

یہ کہہ کر میرے شمرنے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چمک میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ”یہ سوپڑا تو مان کا ہے۔ تم فوراً اپنی بیوی کو سوپڈا لے جاؤ۔ رقم کی اگر اور ضرورت پیش آئے تو مجھے لکھ دینا۔ میں بیچ دوں گا۔“

یہ حکم میرے لیے سوپان روح تھا۔ کئی روز تک فرض اور محبت میں جنگ ہوئی رہی اور آخر محبت پارٹی اور میں سون، لادان اور کبھی ہزاروں حسین یادوں کو کیچھے سے لگے ہوئے تہران سے روانہ ہو گیا۔ پتلے وقت میری

ہوائی عورت

فٹ ہاتھ پر وزن بتانے والی مشین رکھ کر کوئی محنت کش اپنی روزی کما رہا تھا۔ ایک موٹی عورت نے کہ جس کا وزن ۲۵۰ پونڈز تھا۔ ۲۵۰ پونڈز ضرور ہوگا، مشین کو دیکھا تو اپنا وزن کرنے کی سوچی۔

وہ رکی اور مشین پر چڑھ گئی۔ مشین ایسی ”موزوں“ ہستیاں کے لیے نہیں بنی تھی۔ چنانچہ ادھر سے مختصر اس پر چڑھیں اور آخر مشین ترک کر کے ٹوٹ گئی اور وزن بتانے والی سوئی صفر پر گر گئی۔

قریب سے بچے گزر رہے تھے۔ انھوں نے موٹی کی کو دیکھا اور پھر موٹی کو دیکھا جو وزن صفر بتا رہی تھی تو حیران کے حیران کھڑے رہ گئے۔ ان میں سے ایک بولا ”اے دیکھو تو..... اس موٹی میں صرف ہوا بھری ہوئی ہے، یہ تو ہوائی عورت بن گئی ہے۔“ (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰)

آنکھوں سے آنسو ہانک رہے تھے اور میں بار بار رول مال آنکھوں کے قریب لانے پر مجبور تھا۔

اشاک ہوم آئے مجھے ۱۵ دن گزر چکے تھے۔ بیوی ہسپتال میں داخل تھی۔ ڈاکٹر پوری توجہ سے اس کا علاج کر رہا تھا۔ علاج کے ۱۶ روز میں دن اس وقت مجھے انتہائی تھج ہوا جب میری قریب المرک بیوی نے آنکھیں کھولیں اور مجھے مسکراتے عجیب لگا ہوں سے دیکھا۔ نہ جانے ان آنکھوں میں کیا جاوہ تھا کہ میں بھی مسکراتے لگا اور بے ساختہ میں نے اس کے لاغر ہاتھ کو بڑی محبت سے دبایا۔

تقریباً ۱۶ ہسپتال میں گزر گئے۔ اس ۱۶ ماہ میں میرے لیے اس کے سوا اور کوئی کام نہ تھا کہ میں اپنی بیوی کے سر پرے بیٹھا رہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس عمل سے کیا کیا کر میرے اور میری بیوی کے درمیان اجنبیت اور بے لگائی کے جو پردے حائل تھے، وہ ایک ایک کر کے

رقابت

بیوی نے باورچی خانے سے شوہر کو پکارا:
”اُچی سنتے ہو..... میں روز بروز خوبصورت
ہوتی جا رہی ہوں۔“
شوہر نے حیرت سے پوچھا: ”وہ کیسے؟“
”اب تو روٹیاں بھی مجھ سے چلنے لگی ہیں۔“
بیوی نے اٹھاکر جواب دیا۔
(غالب ساجد، لاہور)

خود بخود ہٹ گئے۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی
انہایت اور اس کے لہجے میں خلوص کی کلک تھی۔ اس کے
بات کرنے کا انداز بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ اب میں اس
کے لیے دنیا کی سب سے قابل اعتماد شخصیت تھا اور آپ تعجب
کریں گے وہی بد مزاج عورت جس کی موت کا متحقی تھا، اب
مجھے اس قدر عزیز ہو گئی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔
جب وہ ہسپتال سے صحت یاب ہو کر نکلی تو بالکل بدلی
ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے غائب ہو چکے تھے
چہرے پر زردی کی جگہ سرخی تھی، وہ بات بات پر مسکراتی
تھی۔ آواز میں لوح اور نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ طالع نے اس کے ذہن، دل اور انداز فکر کو بالکل ہی
بدل دیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرا قصور ہے یا میری
آنکھوں کا کہ اب اس کے حسن کو دیکھ کر مجھے لا دن اور
سون اس کی کنیریں دکھائی دیتی تھیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت
کے مطابق ہم نے ایک سال تک یورپ کی سیاحت کی۔
اس سیاحت کے دوران مجھے خبر ہوا کہ وہ مجھے دیوانہ وار
چاہتی، میری چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی اور
میرے آرام و آسائش کی خاطر اپنے وجود کو بھلا دیتی ہے۔
ظاہر ہے اسی وفا شعار، خوش اخلاق بیوی کی موجودگی میں
سون اور لا دن کا قصور بھی میرے ذہن میں نہیں رہ سکتا
تھا۔ چنانچہ ہم دونوں ایک سال کی سیاحت کے بعد جب
تہران پہنچے تو ایک ایسا مثالی شوہر تھا کہ جس کے دل پر

صرف بیوی کی حکومت تھی اور میرا گھر میرے لیے جہنم
تھا۔ تہران کی کوئی دھڑکی، کوئی ہنگامہ، رقص و نغمہ کی
مختل اب میرے لیے باعث کشش نہ تھی۔ میں
گم شدہ جنت پاکر بہت کچھ کا قصا گھر کے اندر میرے
لیے بچہ تھا اور گھر کے باہر بچہ نہیں۔
ان واقعات کو گزرے ۲۵ سال ہو چکے ہیں
میرے ۳۲ سال کے امریکا اور انگلستان میں اور ۲۳ تہران میں
تعلیم پارے ہیں۔ دونوں لڑکیوں کی شادی اچھی چلے
چکی ہے اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مطمئن زندگی
گزار رہی ہیں۔

اس سال کے شروع میں جب میری بیوی میٹرونی
میں داخل تھی، مجھے ایک شادی میں شریک ہونا پڑا۔ وقت
گزر رہا تھا مگر ابھی تک رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی۔
ایک کونے میں خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بیوی کے بغیر اس
فحش کی تقریبات میں اگر آخر کیوں میں اپنے آپ کو تنہا کر
محسوس کر رہا ہوں کہ اتنے میں ایک خوش لباس عورت باقہ
انداز سے چلتی ہوئی میرے سامنے سے گزری۔ اس نے مجھے
دیکھا چند قدم چلی اور پھر مجھ پر ایک نظر ڈالی اور پھر ایک
میرے قریب آکر اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کو نہیں
پچپنا مگر اخلاقیاتی تہذیب سے سلام کا جواب دیا۔
وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی اور مسکرا کر پوچھا:
”کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟“

”جی نہیں، شاید آپ کو کسی اور کا مجھ پر دھوکا ہوا ہے۔“
”جی نہیں میں آپ کو پہچانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس
نے اپنی نوجوان لڑکی کو آواز دی، جو مجھ سے کچھ دور چلے
دوسری لڑکیوں نے باتوں میں شغول تھی، قبل اس کے کہ
لڑکی میرے قریب آئے، اس عورت نے مجھے بغور دیکھا
تاکہ میں اُسے پہچان لوں۔ مجھے خیال آیا کہ میں اس قسم
چہرہ پسند دیکھ چکا ہوں۔ مگر کہاں ہے مجھے یادیں آ رہا تھا۔
اتنے میں لڑکی قریب آگئی۔ اس عورت نے اسے ہم
سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔
”یہی ان سے ملو یہ ہیں وہ جن کا ذکر میں اکثر کرتی

ہوں۔ جنھوں نے مجھے نیک و بد کی تفریق کرنا سکھائی۔“
لڑکی نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا مگر میں چکرا
ہوا تھا کہ یہ عورت آخر ہے کون؟ اتنے میں وہ پھر بولی۔
”میں لا دن ہوں، لا دن، لا دن، اتنے میں میرے حسن سے تم نے
زندگی کا حسن اور کردار کی کیزگی عطا کی ہے۔ میں
لہاری عظمت کا اعتراف کرتی ہوں اور میری تمنا ہے کہ
میرے بچے اور شوہر تم جیسے مثالی انسان ثابت ہوں۔
اصل میری خوشگوار زندگی تمہاری مرہون منت ہے۔ سچ
کہتی ہوں میں اب بھی اکثر اس تصور سے خوفزدہ ہو جاتی
ہوں کہ اگر ان لحاظ میں جبکہ میں جوانی کے جوش میں
کچھ بھول گئی تھی اگر خدا نخواستہ تم بھی جذباتی ہو جاتے۔
میرا ایک شاہد ہوتا اور آج میں کیا ہوں۔ اے عظیم انسان!

یہ کہہ کر وہ عورت باقہ انداز سے لڑکی کا ہاتھ تمام کر
دوسری طرف چلی گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بچوں
کی مسکراہٹ تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ لا دن سے
لاقات کے ایک ہفتے بعد مجھے ایک تجارتی ضرورت سے
لادن جانا پڑا جہاں سون سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ
لادن میں اپنے لڑکوں کے پاس جو یہاں زیر تعلیم ہیں،
پیشانی گزارنے آئی ہوئی تھی۔

سون نے اپنے گھر پر میری پر تکلف دعوت کی اور
کھانے کے دوران اس نے کہا ”شادی کے بعد بھی کئی
سال تک تمہاری دشمن رہی تم کو بے وفا اور اسی قسم کے
ان گشت القاب سے نوازتی رہی لیکن اب جبکہ میں کئی
بچوں کی ماں ہوں تو مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ حقیقی محبت
اور انسانی عظمت کیا ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا ”چھوڑو ان گزشتہ باتوں کو۔“
میرا یہ جملہ سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور
انتہائی کرہناب لہجہ میں بولی ”یقین مانو! میں اس قسم سے اب
کبھی محبت کرتی ہوں، اب پایا محبت! لیکن یہ محبت اس
محبت سے مختلف ہے۔ مجھے تمہارے کردار اور تمہاری
عظمت سے پیار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم نے مجھے شوہر اور

دوسروں کو عفت مآبی
کے مفہوم سے آشنا
کرنے والے انسان
کبھی بد قسمت
نہیں ہو سکتے

کا وجود نہ ہوتا۔ جس میں میرے شوہر کی عمرانی ہے۔
جہاں نیک اور سعادت مند بچے ہیں جہاں مانتا کا اصل
روپ ہے۔“
پھر وہ خاموش ہو گئی۔ کھانے کے بعد جب میں چلنے
لگا تو اس نے دردناک لہجے میں کہا:
”میں نہیں جانتی کہ تم کس طرح زندگی گزار رہے ہو
لیکن مجھے یقین ہے کہ تم یقیناً خوش قسمت ہو گے کیونکہ ایسا
انسان بھی بد قسمت نہیں ہو سکتا جو دوسروں کو عفت مآبی
کے مفہوم سے آشنا کرے، جوانی کے جذبات بھی جس کے
کردار سے گمراہ کر پاش پاش ہو جائیں۔ سلام! اے بلند
انسان!“

میں چلا آیا، لیکن مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ لا دن
اور سون نے میری جتنی خوبی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے،
اس کا صحیح معنی میں نہیں بلکہ میری بیوی ہے۔ کیونکہ اس
دور میں جبکہ وہ انتہائی لڑاکا اور بد مزاج تھی۔ اگر میرے
ذہن پر مسلط نہ ہوتی تو نہ جانے میں کتنے زندگیاں کی تباہی
کا باعث بنتا اور جب کبھی میں یہ بات اپنی بیوی سے کہتا
ہوں تو وہ محبت پاش نگاہوں سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہتی
ہے ”دنیا میں کوئی انسان نہ ہوا، ماحول اور
زمانہ اُسے بُرا بناتا ہے۔“

سنسنی
خیز
کھانی

اس نے کمال مہارت سے اپنا عیار انہ منصوبہ بنایا تھا
جو کامیاب ہونے کو تھا کہ ایک چھتری درمیان میں آگئی

ایک چوڑی
فنکاری کا اجرا

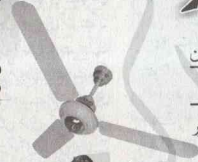
چھتری گئی گواہی

رونی فرماندس
ترجمہ: انجمت اروق ساعلی



UNITED
R.T.M. NO 71810

ہر دل چاہے



سلیم الیکٹرونکس انڈسٹری

کالڈس ہاؤس، قی دوہ، بھارت

فون: 3846836, 3857636, 3894638-055

یونائیٹڈ

واشنگٹن ڈرائیور مشین

روم انرکولر پنکھے

الیکٹرونک گیس گیزر



www.unitedwash.com
e-mail: info@unitedwash.com



حمید الیکٹرونکس انڈسٹری

نویا نول کریمینٹ ٹاروڈ ٹیکنیکی کی روڈ، کومر ٹاؤن، پاکستان
Ph: +92-55-3894636-7 Fax: +92-55-3894638
E-mail: info@unitedwash.com



الکوتھر

واشنگٹن ڈرائیور مشین، روم انرکولر، گیزر

بچپن

سے کچھ ایسے حالات رہے کہ مجھے اپنا پیٹ پالنے کے لیے کافی تنگ و دو کرنی پڑی۔ چنانچہ نامساعد حالات میں گھر کر چور بن گیا۔ مگر کام نہیں چھٹی بھر چڑانے والا چورا خاص طور پر میں زمر باجھ آنے کا کوئی موقع چھوڑنے کو تیار نہ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بنکاک جا رہا تھا..... بنکاک جہاں گرین منگی ایسبز بندر موجود تھا۔ اہل ہندو اپنے عقیدے کے مطابق ہنومان جی کو بندروں کا بادشاہ کہتے ہیں۔

تقریباً ۵۰۰ سال پہلے ایک ہندو فنکار نے زمر و کا ایک ہارنڈا کاٹ اور بڑی خوبصورتی سے تراش کر بزم بندر تخلیق کیا۔ وہ بہت تقریباً آدھ فٹ لمبا اور پانچ انچ چوڑا تھا۔ اسے سر سے پانک چھتی لباس پہنا ہوا سونے کے ایک ٹکونے تخت پر بٹھایا گیا۔ اس تخت کی اونچائی زمین سے ۱۲ فٹ تھی۔ زمر و سے بنا ہنومان کا بت اپنی طرز کا واحد بیش قیمت مجسمہ تھا۔ اب میں اسی کو پڑانے جا رہا تھا۔

میں چھتری، کیرا اور دیگر ضروری اشیاء لیے بنکاک پہنچا اور ایک ہول میں کرا کر اسے پر لے لیا۔ یہ ارض منصوبہ آسان تھا۔ میں اس کے متعلق کئی ماہ سے سوچ رہا تھا۔ حالات سامنے رکھتے ہوئے جو مجھے پیش آسکتے تھے، میں نے موزوں اس کی تیار کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے کیرے کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ ایک ایسے شہر میں جہاں کے راجہ کی مندر مندر کھڑی تھی کہ لیے بہترین سمجھتے تھے۔ ہوں، تو نوکر فراور اسے تیرے اتنے ہی عام سمجھتے کہ چپن میں لال بیگ۔ اسی طرح کوئی میری چھتری پر بھی اعتراض نہ کرتا۔ بارش کے موسم کا آغاز ہو چکا تھا اور بازاروں میں تقریباً ہر شخص کے ہاتھ میں چھتری لٹکی نظر آتی تھی۔

یہ ہفتے کی سہ چھتری اور میرا کام اوتار کو انجام پانا تھا۔ کیونکہ وہ عجائب گھر جہاں ہنومان کا بت رکھا تھا ہفتے میں صرف ایک دن، اوتار کو عوام اور سیاحوں کے لیے کھولا

جاتا تھا۔

اوتار کے دن میں دیر سے اٹھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کبھی لمبے بارش شروع ہو سکتی ہے۔ میں خود کو بہت تروتازہ اور پُر اعتماد محسوس کر رہا تھا۔ ہول میں بہترین ناشتا کرنے کے بعد میں لابی میں بیٹھ گیا جہاں تین خانی باشندے نو فرما تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزار کر میرے کمرے میں آیا، کیرے کا بیگ اور چھتری اٹھائی، پھر دھڑ دھڑکتے ہوئے عجائب گھر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک بڑے مندر کا حصہ تھا۔ عجائب گھر کے وسیع و عریض کمرے کو خوبصورتی اور نفاس سے سجایا گیا تھا۔ دروازے پر ۱۲ پیریدار موجود تھے۔ مزید ۶ خانی پیریدار باہر گرانی پر مامور تھے۔ وہ باہر بڑے پلیٹ خام پر مسدود تھے۔ ادھر ادھر گشت کرتے رہتے۔

مندری کھینچوں کی خوشگوار آوازیں بنکاک کی فضا میں گونج رہی تھیں لیکن میری آنکھیں اور کان دونوں ان سے لاپرواہ صرف اس طرف متوجہ تھے جس کی خاطر میں نے یہ دور دراز کا سفر کیا تھا۔ کمرے کی ہلکی روشنی میں ہنومان کا چمکتا ہوا میری نظروں کے سامنے آسن جمائے منہرے تخت پر رونق افروز تھا۔

مقامی باشندوں اور غیر ملکی سیاحوں کی کثیر تعداد دروازوں سے آ جا رہی تھی۔ اکثر لوگ اس امر سے بے خبر تھے کہ دروازے بند ہوئے ہیں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ دراصل دوپہر کو عجائب گھر کچھ دیر کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ میں بڑی لا پرواہی سے چلتے ہوئے سیاحوں کی ایک بڑی ٹولی میں شامل ہو گیا جو مندر کے اندر جا رہی تھی۔ کیرا ہاتھ میں تھا۔ کیس کندھے سے لٹک رہا تھا۔ بند چھتری داہنے ہاتھ میں دینی ہوئی تھی۔

سیاحوں کی جماعت منٹ کے سامنے کھڑی ہوئی اور دنیا کے اس عجوبے کو غور سے دیکھنے لگی۔ میں غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ گروہ سے الگ ہو کر طعانی تخت کی دوسری جانب چلا گیا۔ تخت پر ۱۲ چھوٹے ستونوں پر رکھا تھا۔ ستون تخت سے لے کر فرش تک جلی غلاف سے ڈھکے

ہوئے تھے جن پر سونے کا کام تھا۔ تخت کے پیچھے بھی چند لہر آہستہ تھے۔ میں نے کیرا غلاف تخت کے قریب قریب پر رکھا اور ہول کو دیکھنے لگا۔ جب میں نے دیکھا کہ کسی کی توجہ میری طرف نہیں، تو تیزی سے اپنا کیرا اور کیس وکیل کر غلاف کے اندر پھنچا دیا۔ غور و فکر کے بعد میں نے چھینے کے لیے بھی ایک جگہ کا انتخاب کر لیا۔ اب میری نظریں اپنی لگائی کھڑی پر جمی تھیں۔

کچھ دیر بعد ایک پیریدار نے آواز لگائی کہ چونکہ عجائب گھر بند ہونے کا وقت آ گیا ہے، اس لیے میری فرما کر جلد باہر نکلیں آئیے۔ میں منصوبے کے مطابق جلدی سے ایک منٹ کے عقب میں چھپ گیا۔ جلدی سیاح اور دوسرے لوگ ہال سے باہر چلے گئے۔ ٹھوڑی دیر بعد میں نے پلاس بت کی آڑ سے لگا، تخت کے عقبی حصے میں پلایا، دھلی غلاف کا گوشہ اٹھایا اور اپنی چھتری لیے پھرتی سے اندر گھس گیا۔ غلاف چھوڑ کر برابر کرتے ہوئے میں پھر منکرانے لگا۔

اب میں مکمل طور پر نظروں سے پوشیدہ تھا۔ چند سیکنڈ بعد دونوں پیریدار یہ دیکھنے اندر آئے کہ ہال میں کوئی شخص رہ تو نہیں گیا؟ انھوں نے سرسری نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور لوٹ گئے۔ ہال کے پتھر پیلے فرش پر ان کے جوتوں کی آواز گونج رہی تھی۔ پیریدار مطمئن ہو کر چلے گئے۔ مجھے خفا تھا کہ اگر کسی پیریدار نے باہر جاتے ہوئے لوگوں میں مجھے موجود نہ پایا تو میرے لیے مصیبت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اس کا امکان بہت کم تھا۔ وہاں اتنے بے شمار لوگ آتے تھے کہ پہرے داروں کے لیے کسی خاص فرقہ کو یاد رکھنا ناممکنات میں سے تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ سرسہ پہر کو جب عجائب گھر دوبارہ کھلا، تو سننے پیریدار کھڑے رہے۔ آج میں گئے۔ چنانچہ وہاں جاتے ہوئے بھی انھیں میرے متعلق کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

کچھ دیر بعد میں نے عجائب گھر کے ہماری دروازوں کو بند اور پھر منتقل ہوتے سنا۔ ساتھ ہی ہال میں جو بلیک روشنی ہو رہی تھی، وہ بھی بج گئی۔ پیریداروں نے وہاں

جائے ہوئے باہر سے بجلی کے میں بند کر دیئے تھے۔ اس کی منٹ تک انتظار کرتا رہا اور پھر غلاف سے باہر نکل آیا۔ اندر میرے میں ٹوٹے ہوئے میں نے کیرے کا کیس اٹھایا، اس میں موجود ایک چھوٹی نارنج لٹالی اور اسے روشن کر کے فرش پر رکھ دیا۔ پھر اپنی چھتری کے غلاف معمول بڑے اور کھولے دستے سے ایک چھوٹا ہماری سنلر نکالا۔

اس سنلر میں کاغذ کی طرح پتلے آئینہ کی ٹکلیاں تھیں۔ وہ درخت میں چھوٹے شخص جس طرح آپ نے انکر ریڈیو یا ٹرانسمیٹر کے ایئر لے یا فونو کیرا کے اسٹینڈ کی ٹکلیاں دیکھی ہوں گی۔ انھیں حسب ضرورت کھینچ کر چھوٹا یا بڑا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ایک اور خصوصیت رکھتی تھیں، یہ دہری ٹکلیاں تھیں۔ چنانچہ جب انھیں کھینچ کر باہر نکالا جاتا، تو ایک چھوٹی مگر نہایت مضبوط یا سیرجی وجود میں آ جاتی۔ یہ میں نے خود ہی ڈیزائن کی تھی۔

چھتری کا کھوکھلا رستہ بھی خود ہی بنایا جس کا طریقہ مجھے ایک کتاب میں لکھا ملا تھا۔ مجھے کچھ زیادہ فراس شے پر تھا جو آخر میں کیرے کے کیس سے برآمد ہوئی۔ وہی میرے منصوبے کی روح تھی۔ اس کے بغیر ہنومان کا بت چرانا ناممکن تھا۔ میں بت کے متعلق پوری معلومات حاصل کر چکا تھا۔ یوں مجھے اس کے قد و قامت کا پورا اندازہ تھا۔ میں نے لیفٹورن کی ایک گلاس ٹینڈی سے ہزبرگ کے شیشے کا ایک ایسا ٹھوس گلا خریا جس کی جسامت ہنو مان کے بت چھتری کی۔ میں نے پھر اس کے اوپر ہی حصے کو بڑی مہارت سے تراش اور ریگ مال سے گھس کر بندر کے چہرے کی شکل دے دی۔ کوشش تھی کہ اس کا چہرہ ہنومان کے چہرے سے مشابہ نظر آئے۔ میں اپنی کوشش میں خاطر خواہ کامیاب رہا۔

اب میں نے وہی شیشے کا بت کیس سے نکال کر بڑی احتیاط سے فرش پر رکھا۔ پھر اپنی ایجاد کردہ میری تخت کے سہارے لگا کر نارنج منہ میں دبائے اور پڑھا۔ پھر ہنومان کا بت تخت سے اٹھایا نیز آیا۔ خوش قسمتی سے وہ بت تخت میں بیوست نہیں تھا۔ نیچے اتر کر اسے پہنائی

ہونی پوشاک اپنے پیشے کے بت کو پہناتی اور ہنومان کے سر پر بنی تاج مانو پتی بھی اس کے سر پر رکھ دی۔ تاریخ کی روشنی میں دیکھا کہ میرا بت اب بڑی حد تک ہنومان کے مجسمے کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کا کھانا نہیں رہا۔ میں نے پھر جلدی جلدی بیش قیمت بت کیسرے کے کیس میں رکھا، میری اپنی جگہ رکھی اور پھر پہلی کی طرح بت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہوا گیا۔

ابھی غائب نظر کھلے میں دس منٹ باقی تھے کہ میں نے ہال کی چھت پر پانی گرنے کی آواز سنیں اور اندازہ لگایا کہ بارش شروع ہو چکی۔ تھوڑی دیر بعد ہال کے اندر روشنیوں دوبارہ جل اٹھیں۔ پھر فوراً ہی دروازے سے سپرہ وقت آنے والے سیاخوں اور دوسرے لوگوں کے لیے کھول دیے گئے۔

بارش ہونے کا بدو دو لوگوں کی خاصی تعداد ہال میں داخل ہوئی۔ موقع پر کمپنر قدامت مجھے کی آڑ سے نکلا اور کسی کو توجہ اپنی طرف مبذول کرانے بغیر جہوم میں شامل ہو گیا۔ میں ان کے ساتھ اس بات کو دیکھتا رہا جتنے آخر پر رکھا تھا۔ وہ لوگ بلاشبہ اسی کو ہنومان کا بت خیال کر رہے تھے۔ جب سیاخوں کی ایک ٹولی رخصت ہونے لگی تو میں بھی ان کے ساتھ ہی دل دل میں اپنی کامیابی پر نازاں ہال سے باہر نکل آیا۔

برآمدے میں کھڑے دیکھا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ دوسرے سیاخوں کی طرح میں نے بھی اپنی چھتری کھولی اور باہر قدم کھانے کو تیار ہو گیا۔ ہنومان کا مٹی بت میرے کیمبرے کے کیس میں قطعی محفوظ میری گردن میں لپک رہا تھا۔ کھلی چھتری کی وجہ سے وہ اور بھی آڑ میں ہو گیا۔

غائب ہونے کے پھریدار برساتیاں پہنے ادھر ادھر پہرہ دے رہے تھے۔ وہ رخصت ہونے والے سیاخوں کو بڑے غور سے دیکھتے انھیں میں نے دوپہر کے وقت نگرانی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ گویا یہ سنے تھے۔ سیاخوں کے پیچھے اپنی چھتری کھولے میں ان پھریداروں کے متعلق سوچے

بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ہر اوتار کو ہنومان کا مجسمہ دیکھا کرتے تھے۔ لیکن کیا انھیں بھی اس طرح قیمتی زمرہ کا بت دیکھنے کا موقع ملا جیسے میں نے اسے قیمتی پوشاک سے محروم دیکھا تھا؟ کیا انھیں بھی یہ بیش بہا خزانہ ہاتھوں سے چھڑنے کا موقع ملا؟ نہیں..... کبھی نہیں..... یہ بے جا رہ پھریدار محض اس کی گنجگاہی پر مامور تھے۔ ان کی قسمت میں وہ مبارک ساعت نہیں تھی جس سے میں لطف اندوز ہو چکا تھا۔

ٹھیک اسی لمحے جب میں موسلا دھار بارش میں قدم رکھنے کے لیے تیار ہو رہا تھا، آج ایک ایک پھریدار کی نظر مجھ پر پڑی۔ دیکھا کہ وہ میری چھتری کو غور کر رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے اس کی نظریں ذہن کی گہرائیوں میں جھانک کر میرے خیالات پڑھ رہی ہوں۔ پھر آج ایک اس کے چہرے پر اُنھیں کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ دوسرے مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دو دوسرے پھریداروں کو اشارہ کیا اور وہ میری طرف بڑھنے لگے۔

دیکھتی ہی دیکھتی میں ان تینوں پھریداروں کے نرنے میں کھڑا تھا۔ وہ تینوں بڑی عجیب نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک پھریدار نے پہلے مقامی زبان میں کچھ کہا، پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ میں بات نہیں سمجھ سکا، انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہوا: ”کیا آپ براہ مہربانی ہمارے ساتھ آنے کی زحمت کرا کر کریں گے؟“ وہ بولا۔

”کھر کیوں؟“ میں نے اس کی جانب گھورتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں بارش میں کھڑے ہو کر بات کرنا مشکل ہے۔“ اس نے سپاٹ لیے میں کہا۔ ”آپ براہ مہربانی ہمارے ساتھ کار میں چلیں۔“

”کیا میں نے جیپ تڑا سی ہے؟ کسی کو پتہ تو مل کی لوک پر اتوار کرنے کا مرتب ہوا یا کسی معزز خاتون کو زہرات سے محروم کرنے کی کوشش کی؟ مجھ سے آخر کیا جرم ہوا ہے؟“ میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

”بھیلے۔“ انھوں نے کہا اور مجھے تقریباً زبردستی اُس پولیس کار کی طرف لے چلے جو سڑک کے ایک جانب

کھڑی تھی۔

میرا دل ڈوبنے لگا۔ کیمبرے کا کیس جو میرے کندھے سے لٹک رہا تھا، دفعتاً اتنا بھاری محسوس ہونے لگا جیسے اس میں لاکھوں پاؤنڈ وزن رکھا ہو۔ پھریدار مجھے ہائیں بھینکوا کر لے گئے۔ انھوں نے وہاں ایک چھوٹے قد والے مجسمیت کو تھانی زبان میں تیزی سے بولتے ہوئے کچھ اشارہ کیا۔ وہ میری جانب بھی کچھ اشارے کر رہے تھے۔ پہلے میری جامد تلاقی کی کمی اور میرا باپ پورٹ ہاؤس گیا۔ میں مطمئن تھا کہ بت کو محفوظ بنانے میں میری چھتری اور گہرا کیس بھی تھین گیا گیا۔ کچھ دیر جانچ پڑتال کے بعد کیمبرے کیس کھلا، تو ہنومان کا بت بھی برآمد ہو گیا۔ میں نے کہا کہ محض ایک کھلونا ہے جو فروخت کرنے کی خاطر تیار کیا گیا لیکن چالاک افسر منکر ادا ہے۔

میں اب تک حیران تھا کہ گاؤں نے میری جانب صرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر فوراً مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ آخر کیوں.....؟ میرا منصوبہ بڑی کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچا تھا، اتنی کامیابی سے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی کہ میرا راز فاش ہو گیا اور میری گرفتاری عمل میں آئی۔ اگر یہ میری غلطی نہیں تھی تو یقیناً پھریدار کو دوسروں کے خیالات پڑھنے کی صلاحیت حاصل تھی یا پھر وہ ایسی نامعلوم طاقت کا مالک تھا کہ ایک نظر میں میرا راز جان گیا۔ میں نے سنا تھا کہ مشرق کے رہنے والے بعض لوگ پُر اسرار طاقتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ شاید پھریدار کو بھی کوئی ایسی طاقت حاصل تھی۔

اتفاق سے وہی پھریدار میرے پاس چلا آیا۔ اس نے ہاتھ میں ہنومان کا شیشے والا بت تھا ہوا تھا۔ جب اس نے مجھے مجسمہ دکھایا تو میں محض شانے اچکا کر رہ گیا۔ کوئی کی اتنی سلاخوں سے جھانکتے ہوئے میں نے پھر اس انگریزی جاننے والے پھریدار سے پوچھا: ”کیا تم مجھے بتا سکتے ہو، مجھ میں بات کس طرح معلوم ہوئی کہ میں نے ہنومان کا بت چرایا ہے؟“

پھریدار نے منکرانے سے میری طرف دیکھا۔

بے بسی

پطرس بخاری مرحوم گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے، وہاں ایک چوکیدار ان کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔ ایک پارسی استاد نے پطرس بخاری کو بتایا ”پطرس صاحب! فلاں چوکیدار آپ کے خلاف بہت کچھ بولتا اور کہتا ہے کہ پطرس بخاری میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

پطرس بخاری بولے ”وہ جھجک کرتا ہے۔ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کے پاس دولت ہے نہ عزت، شہرت ہے نہ عہدہ، میں اس کا کیا کیا کرؤں!“ (ڈاکٹر محمد یونس کی کتاب ”افغانی“ سے اقتباس)

”تم غائب نہیں ہیں اس کے بند ہونے کے دوران تنہا اندر رہے تھے۔“ وہ بولا ”اور یہی بات بڑی مشکوک تھی۔“

”بے شک مشکوک تھی لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں غائب گھر کے بند ہونے کے وقت اندر کیا تھا۔“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔ ”کیا صرف میری صورت دیکھ کر؟“

”نہیں۔“ اس نے کندھے اچکائے ”بلکہ اس کی وجہ بارش تھی۔“

”بارش!“ میں حیرت و استعجاب سے اچھل پڑا۔ ”بھلا بارش کا اس معاملے سے کیا تعلق؟“

”غائب گھر دوبارہ کھلنے سے پہلے بارش شروع ہو چکی تھی۔“ اس نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور اسی بات سے راز کھول دیو۔“ مجھے افسوس ہے، تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

یہ کہہ کر وہ آدھ بڑھ گیا۔ دفعتاً میرے ذہن میں بجلی سی کوئی اور میں بھی بات کی تک پہنچ گیا۔ دراصل جب میں نے دروازے سے باہر آ کر اپنی چھتری کھولی تو وہ بالکل خشک تھی۔ اگر میں باہر سے اندر گیا ہوتا تو اسے بھی دوسرے سیاخوں کی چھتریوں کی طرح بارش میں بیگم ہونا پڑتا تھا۔

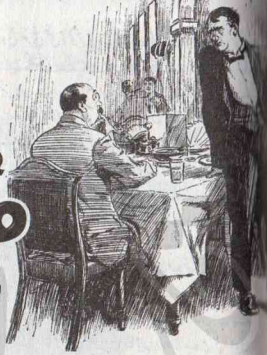
مختصر
کہانی

ایک ویٹر کے انتقال کا
دکھ بھرا ماجرا

مسکراہٹ

اسے پپ سے زیادہ بھنے گوشت کے بچے ہوئے رگلے کی خواہش تھی

انتخاب: نوید انور



علم ہو گیا کہ کوئی یا تیس ان بڑے آدمیوں کو پسند ہیں اور کوئی ہی نہیں۔ یہی اس کی ترقی کا راز تھا۔ ریسٹوران میں بیروں کو خاص تربیت دی جاتی تھی کہ گاہکوں سے کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے۔ مالک بدشکل تھا، اس لیے خوش شکل بیروں سے ملازم رکھتا۔ ایک اچھا چہرہ انسان کو بلاوجہ خود پر اعتماد کرنے پر اکساتا ہے اور اچھے چہرے پر اگر مسکراہٹ ہو تو دوسرا شخص پہلے ہی پر سکون ہو جاتا ہے۔ اس لیے بیروں کو حکم تھا کہ شکل سنوار کر آؤ اور مسکراہٹ کے ساتھ گاہک کا استقبال کرو۔ ساتھ میں تھوڑی سی خوشامد بھی بونی چاہیے۔ نہایت سلیقے سے کھانا پیش کرو اور گاہک پر جتنا کہ وہ بے حد اہم شخصیت ہے۔ کھانے کے دوران موزع دیکھ کر ایک دو مرتبہ گاہک کے قریب جا کر پوچھو کہ جناب کوئی اور چیز تو نہیں چاہیے؟ گاہک کے ایک اشارے کے منتظر رہو۔ کھانے کے بعد آرام سے برتن اٹھاؤ اور بل پیش کرو۔ اگر بخشش ملے تو پچھو لے نہ سناؤ تاکہ گاہک کو معلوم ہو، اس نے ایک چھوٹا نوٹ پیش خزانہ تمہیں بخش دیا۔ اس سارے منجھکے خیز ڈرامے کا نام تھا بہترین خدمات۔

صاحب لوگوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ یہ ہڈیاں

بجھا ہو تو چہرے پر مسکراہٹ سجانا کتنا مشکل ہوتا ہے! مسکر جب مصنوعی مسکراہٹ سے زندگی کا تسلسل بڑا ہو تو انسان چاروٹا چار اداکاری کر رہی لیتا ہے۔ شہر کے بے فکرے خوشحال لوگ جہاں نہیں بیٹھے اور جب عادت نت نئے فیشن، تازہ دھنوں اور تفریح گاہوں کا ذکر کرتے تو ایک ریسٹوران کا ذکر بھی آجاتا جس کی دو تین شاخیں شہر میں کھلی تھیں اور وہاں نہایت لذیذ کھانا ملتا تھا۔ اگرچہ نرخ کچھ زیادہ تھے مگر جہاں ایسا لذیذ کھانا ملتا ہو، وہاں قیمت کی پروا نہیں کی جاتی۔ جو لوگ ریسٹوران میں کھانا کھا چکے تھے، وہ دوسروں سے اس کی تعریف کرتے۔ یوں منہ در منہ اس کی اچھی شہرت پھیلنے لگی اور ریسٹوران بھرا رہنے لگا۔

ریستوران کا مالک ادھیڑ عمر اور کوران پڑھ آدمی تھا۔ مگر دماغ غصہ کا پایا تھا۔ شروع میں ایک تندور پر ملازم ہوا۔ رفتہ رفتہ کھانا لگانا سکھ گیا۔ پھر ترقی کرتا ہوا اوپر آ پہنچا۔ اسے بے پید معلوم تھا کہ جو اچھی پوشاک میں ملیں ہے، اس کی جیب عموماً گرم ہوتی ہے۔ وہ بڑے لوگوں کی ایک ایک حرکت اور چہرے کے تاثر کو سمجھنے لگا۔ آخر اسے

دل

بہترین پارچہ جات کا مرکز

جلال دین

دیدہ زیب، دلکش، دھنک رنگ، خوشنما

کاسٹن لان

گل احمد، اکرم، کلاسک، لاکھانی ملز، ستارہ سپنا، روبی اور فردوس، اس کے علاوہ کئی دیگر ملز کی لان

کاتازہ ترین اسٹاک

بے شمار ڈیزائنوں اور دلپذیر شیز میں آپ کے عمدہ ذوق کی تسکین اور پسند کے لیے ویسٹن تروائٹ می، مکی پلکی، نرم ملائم اور راحت بخش اس کے علاوہ بے شمار ایمپرائڈر لان

پُر سکون ماحول، ایئر کنڈیشنڈ فضا
ایم۔ جلال دین اینڈ برادرز
شاہراہ عرق، صدر کراچی

فون:- 35212758 - 35210350 - 35660444

Digest size

چوپال میں ہونے والے فیصلے کا قصہ دلگسیر

گیارہواں کئی

ایک فیصلے
باپ بیٹے دونوں کو
پیسر رکھ دیا تھا

نجمہ شائق



نہیں لوچتے، پلٹ میں کچھ نہ کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ روزانہ یہی سب کچھ کھاتے اور محض ماحول بدلنے رستوران آتے ہیں۔ اس لیے انہیں اتنی اشتباہ نہیں ہوتی۔ بیروں کی تنخواہیں چونکہ کم تھیں اور رستوران کے اسٹے گارک تھے کہ رات گئے کچھ نہ بچتا، اس لیے انہیں اجازت تھی کہ اپنے اپنے کاموں کی پلٹوں میں جو کچھ بھی بچے کھا سکتے ہیں۔

تھک سفید قمیص پہنوں میں اؤس کر نیل نے آئینے میں اپنے بال دیکھے اور رستوران آگیا۔ اگا کا ڈاکا اپنے آگے تھے اور دوسرے بیرے ان کی خدمت میں مصروف تھے۔ اس کی نظر دروازے پر پڑی، ایک جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے داخل ہوا۔ نیل نے بڑھ کر انہیں اپنی اچھی شکل اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا اور ایک مناسب سی نیم روشن میز تک لے آیا۔ دونوں میاں بیوی آئے سانسے بیٹھ گئے۔ نیل نے انہیں فہرست طعام پیش کی۔ عورت نے بے دلی سے فہرست کے صفحے پلٹے۔ اس کی آنکھیں ہماری اور تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”میں زیادہ نہیں کھاؤں گی۔ کل کی پارٹی سے ابھی تک میری طبیعت بوجھل ہے۔“

”بھئی مجھے تو بھوک ہے۔“ مرد نے کہا۔ پھر نیل سے مخاطب ہوا ”ایسا کرو ایک اچاری ہانڈی اور دو نان لے آؤ گھنٹی والے اور میڈم سے پوچھ لو کیا کھائیں گی۔“

اکیاتام لکھ کر نیل عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ایک بار فہرست اٹھ لی تھی۔ پھر اسی بے دلی سے بولی ”چکن سٹیک لے آؤ، بس ایک۔“

”ایک میرے لیے بھی۔“ مرد چیخ میں بول پڑا۔

نیل اسی خوش اخلاقی سے آرڈر نوٹ کرتا رہا۔ پھر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ میاں بیوی کھانے کے انتظار میں آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ ”آرڈر نمبر۔“ باورچی نے آواز لگائی۔ نیل اپنے خیالات سے چونکا اور لپک کر کھانے کی چیزیں اٹھا لیں۔ مٹی کی چھوٹی سی بھڑیا جس میں اچاری ڈالتے تھے بی

ہوئی مرغ تھی، نوکری میں ایک کپڑے میں لیے خوشبو دیتے کلوٹی لگے نان اور ایک لمبی سی رکابی میں اٹلی سبز یوں کے درمیان مرغ کے دو پارچے۔ ایک منٹ کے لیے تو وہ چکرا گیا اور ان کھانوں کی اشتباہ انگیز خوشبو اس کے حواس سے کھینچ لگی۔ تین دن سے گھر میں وال پاک رہی تھی اور آج مانے آلو بھون کر سامنے رکھ دیے۔ برسات میں آلو کون کھاتا ہے؟ دیکھ کر ہی اگانائی آنے لگتی ہے۔ اسی غصے میں وہ بھوکا ہی گھر سے نکل آیا اور جب میں چھوٹی کوڑی تک نہیں تھی کہ کوئی چل ہی لے کر کھا لیتا۔ اس نے سارا کھانا میز پر سجایا۔ مرد خوش خوشی بھڑیا پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ عورت تکلف سے گوشت کے ٹکڑے کاٹنے میں پردہ کمرہ میں رکھتی جاتی۔ نیل ان سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ کوئی اور گارک آئے تو اس کی خدمت میں لگ جائے۔ مگر کبھی بھی کن آنکھوں سے میاں بیوی کی رکابیوں کو بھی دیکھ لیتا۔ شہید بھوک سے اس پر خشکی طاری ہو گئی تھی۔ اب یہی امید تھی کہ گارک کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی سر ہوں گی اور ان کا جمہو اسے مل جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ جب وہ ان کے پاس بل لے کر پہنچا تو گوشت کا ایک ٹکڑا ویسا ہی پڑا تھا۔ بل ادا ہو گیا اور اسے کوئی بخشش نہیں ملی پھر بھی اس کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب وہ برتن اٹھانے لگا تو عورت نے نہایت نرم لہجے میں اس سے کہا ”سٹیک بیک کروادیں۔“ پھر اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ”نوٹی کو ڈال دیں گے۔ کل میں اسے ویسکی نیشن لگوانے ویسٹری ہسپتال لے گئی تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا، اسے بڈ یوں کے ساتھ ساتھ ابلایا ہوا گوشت بھی ڈالا کریں۔“

بھوک اور کمزوری سے کانپتے ہاتھوں سے نیل نے گوشت کا ٹکڑا ڈبے میں رکھا۔ اٹھیں دیا اور پھر دونوں میاں بیوی کا شکر یہ ادا کیا۔ دونوں دروازے سے نکلے تو ایک اور جوڑا داخل ہوا۔ نیل یوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے انہیں خوش آمدید کہنے آگے بڑھ گیا۔

وسط

پوس (پوہ) کی رات کا آخری کنارہ ٹوٹ رہا تھا جب مولوی حسن دین کی گلی کے مجبور والے سرے سے نمودار ہوئے۔ اس رات تاریکی حد سے بڑی ہوئی تھی اور سرد ہوا جسم کو رے کی طرح کاٹتی تھی۔ یہ ان کا معمول تھا۔ وہ فجر سے بہت پہلے مسجد آجاتے تھے۔ یہ نماز ادا کر کے بعد ذکر اذکار کرتے اور جب صبح پڑھنے والی چائیں میں رنگ برنگی دودھ بلیوں خمرے نکلتیں اور سوئی جاتی کیوں کے پامال سینوں پر بیلوں کے قدموں کی دھبک ان کے گلوں میں جتن ٹپوں سے ہم آہنگ ہوتے لگتیں تو مولوی حسن دین کی کو بیچلی اذان مسجد کے مناروں سے نکل کر فضا میں تیری پورے گاؤں پر تین سو تان لگتی۔

مولوی حسن دین کے والد مولوی چراغ دین کب اس گاؤں میں آئے تھے، اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا تو مشکل ہے۔ "اماں کالہ" چودھری عطاء محمد کی والدہ کے مطابق اس سال دریائے چناب میں زبردست "کاٹنگ" آئی تھی جس سے چناب کنارے کے "پٹیل"، "ترانی"، "گٹ" کے گاؤں اکھاڑ بچھاڑ کے دریا میں ڈال دیے تھے۔ تب مولوی چراغ دین اور ان کا خاندان اپنے جیسے لے پے لوگوں کے ساتھ چند گھنٹوں کے فاصلے پر چلیاں والہ سے باہر ٹھیک اس اوچے ٹکڑے پر آئے تھے جہاں تھاں اگھر زیہار اور سکھوں کے درمیان وہ تاریخی لڑائی ہوئی تھی جسے دیکھنے کے لیے چودھری عطاء محمد کے والد اور چچا ٹھوڑوں کی بچی بچھوں پر سوار ہو کے تھامے تھے جہاں انگریزوں نے وہ یادگاری منارے تعمیر کیے تھے جنہیں دیکھنے کے لیے آج بھی لیوٹرے چروں والے پیچھے انگریز اور موسکی کے دستوں جیسی کئی بنگالی ناگوں والی جمعیں آتی تھیں۔ خود مولوی حسن دین نے اپنے والد سے یہ سنا تھا کہ دریا پر بیلوں میں ان کا آبائی گھر اور اچھے مناروں والی وہ مسجد تھیں ان کے دادا مولوی الہ بخش نے آباد کیا تھا۔

جس کی دیواروں کے کچے گتھرے ہمیشہ سفید چوٹنے لے لیے رہتے تھے اور جس کے اکیلے کمرے کی کھر دریا چٹانیاں بھی جھڑوں سے خالی نہیں ہوئی تھیں۔ اس جھڑ سے قطع نظر یہ تھا کہ گاؤں کے مشرقی سرے پر درودر ٹھیک پھیلے مٹی کے اونچے نیچے ٹیلوں وسیع پھیلے ہوئے تھے، مٹی اور کپاس کی بری بھری ٹھلوں، ان کے اطراف میں وہاں بکھرے کسانوں، ادھر ادھر بندے اور پڑتے ڈھنگروں سے لے کر، چلت بھرت سے بھری رابوں، ان کے کنارے بیکری کی ٹڈ منڈ جھاڑیوں اور چودھری عطاء محمد کی حویلی کے وسط میں ۱۰۰ سالہ بوڑھے "برگد" کی گھنیری شاخوں تک سب ان کی اذانوں کے اس طرح عادی ہو گئے تھے کہ اگر انہیں منظر سے نکال دیا جائے تو سارے منظر یکبارگی بکھر جائیں۔

مولوی صاحب مسجد کے دروازے پر پہنچنے اندھیرے میں ٹٹول کر کنڈی گرائی اور لائٹن کو ہاتھ میں اونچا کرتے نمازگاہ میں داخل ہوئے۔ وضو دھو گھر سے کر کے آتے تھے اور ان کا ارادہ ۲ رکعت نفل ادا کرنے کا تھا۔ صلی کے جانب قدم بڑھاتے وہ بیدم ٹھٹھک گئے۔ نمازگاہ کے کونے میں مدغم ٹھٹھاٹے جالے کی چھائیاں میں ابھرتی دھوپ انسانی شہیدان کی نظر کا دھوکا بھرنے لگی تھی۔ ہوسکتا ہے کوئی مسافر ہو کر رات تک تو یہاں کئی نہ تھا۔ بڑی مدغم خودکامی کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر انھوں نے لائٹن کی لواروچی کی۔ سڑکی کی شدت اس کے شیشوں سے دھند کے بادل بن کر لپٹ رہی تھی۔

"السلام علیکم" وہ کہتے آگے بڑھے۔ "کون ہو تم؟" اور "بھائی" کا لفظ ان کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گیا۔ وہ اسے پہچان گئے تھے۔

وہ بانٹو تھی۔ چودھری عطاء محمد کی پوتی اور چودھری فتح محمد کے چچیرے بھائی غلام محمد کی نو نظر۔ انہیں لگا کہ زمین ہولے ہولے ان کے قدموں سے ٹکر رہی ہے اور ان کی بزرگی اور پارسانی کا وہ بھرم جسے قائم کرنے میں انھوں نے عمر کشیدہ کار ہر لمحہ صرف کیا تھا، ایک ہی بلے میں

دھک جائے کہے۔

"بانو! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" انھوں نے آواز کی لڑا لڑ کر پوچھا۔

"میں آپ کا انتظار کر رہی تھی مولوی صاحب۔" لڑکی کی آواز میں اتنا دکا چڑا اور بے باکی کی اٹھان تھی۔ "مگر کیوں؟" ادھر جیرانی سی جیرانی تھی۔ "تاکہ آج پچھنے سے پہلے آپ چودھری فیض محمد سے میرا نکاح کر دھواریں۔"

مولوی صاحب نے اٹکی سے اپنی خفگی ڈال دی تھی اور قدرے توقف کے بعد بولے "بانو بیٹی! یہ بات تو تمھارے والدین کے کہنے کی ہے۔"

بانو اپنی جگہ پر ذرا سا کسمائی اور بولی "آپ بھی بڑے بھولے ہیں مولوی صاحب! اگر ایسا ہو پاتا تو میرے رات کے اس پہر خانہ خدا میں اس کی نوبت کیوں آتی۔ اماں کی طور چاچی عظمت کے سامنے چھوٹی نہیں پڑے گی اور ابائی ناک کو چودھری فتح محمد کی ہنس ناک سے نیچا ہونا گوارا نہیں۔"

"مگر اس معاملے میں تمھارا کوئی واسطہ کہاں بنتا ہے بانو؟ یہ سب خالص تمھارے گھر کے مسئلے ہیں جنہیں وہیں حل ہونا چاہیے۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ اور فیض محمد کہاں ہے؟ جس کے لیے تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے؟" مولوی صاحب نے ٹوٹتی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ مبادا کسی کواڑ کے چھپے یا کسی دیوار کے سائے میں اس کی شہیدہ قہر قرار ہی ہو۔

"اے شہر سے آتا ہے۔ وہ فجر کے وقت پہنچ جائے گا، یہ اس کا وعدہ ہے۔" بانو کی آواز میں عین اٹھن کی گواہی تھی۔

"مگر یہ تو سوچو بیٹا!" مولوی صاحب نے اپنے تئیں لپٹے کو نرم بناتے ہوئے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں نمازی مسجد میں آنا شروع ہو جائیں گے اور وہیں مسجد یہاں دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ تمہیں میری اور اپنے باپ کی عزت کا خیال کرنا چاہیے۔"

انھوں نے کھڑی ہو جی اور مولوی صاحب کی آنکھوں میں اٹھتے ڈال کر بولی "جب انھیں میرا خیال نہیں تو میں ان کا خیال کیوں کروں۔ فیض مجھ کو پہنچ لینے دیں مولوی صاحب! مجھے تو اتنا بتا رہے کہ مجھے اپنے ارادے کے پورا ہونے تک یہیں ٹھہرنا ہے اور میں اپنی ہمت کی بہت کچی ہوں۔"

مولوی صاحب نے گھڑی پر نظر دوڑائی۔ تہجد کا وقت نکل رہا تھا۔ اذان میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے اور انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اذان ہوتے ہی نمازی ادھر کچل پڑیں گے۔ سڑی، ٹھہر اور دھند کی وجہ سے سارے نمازی نہ بھی آتے تو بابا شرف علی، غلام رسول گوجر اور اسلم کھمار نہیں ٹھہرے۔ خاص طور پر بابا شرف کا اگر بس چلتا تو صبح سے لے کر رات گئے تک مسجد میں گزار دیتا اور ۵ بجائے ۸ نمازیں پڑھتا۔ جوانی اس نے کبھی کھیلنے اور ادھر ادھر منہ ماری کرتے پتا نہ دئی اور اب بچی تو یہ کر کے بڑھا چا چلاں کر رہا تھا اور غلام رسول کو جڑ تو تھا ہی کیا نمازی۔ اس نے یہ مسجد میں تب آثار شروع کیا تھا جب اس کی مبین بھی نہ بھیگتی تھی اور اب اس کے گھمبیراں جیسے سفید بے پٹری کے نیچے سے بھاگتے تھے۔

گرمیوں کی چٹلائی دو پہروں میں جب سورج کا جھٹکا گولالین کسانوں کے سروں پر دہکتا، وہ زمین کے سینے کو بل سے چیرتے سینے سینے ہوجاتے اور جب زرد تھاں مغرب کی طرف پھٹنے لگتا اور انکی برابر بیلوں کو پٹکا کر سائے میں لاکھا کرتا اور کندھے پر رکھے صاف سے چہرے کا پینٹ پونچھتا مسجد کی طرف چل دیتا۔ اسلم کھمار ان دھوکوں سے بڑھ کے شیدائی تھا۔ وہ منہ اندر سے مسجد میں آتا، احاطے میں جھاڑو دیتا، سرویوں میں ڈگر ڈگر ہاتھ کا ناکا چلاتا اور جب خضرا بانی نیم نکلاں ہوجاتا تو لوٹے بھر بھر کر وضو کی جگہ پر رکھتا جاتا۔ گرمیوں میں اندر باہر خضندے پانی کا چھڑکاؤ کرتا اور محراب کی دروزں میں اترتی جلالتا اور جب بابا شرف خاص لے میں میاں محمد بخش کے کلام کی تان اٹھاتا تو اسلم کھمار بڑیوں کے بل بولوں گھوم

جاتا جیسے چاک پرٹی کا برتن گھومتا ہے۔

مولوی حسن دین کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آگیا تو وہ اسے بانو کی موجودگی کی کیا وضاحت دیں گے؟ ”مجھے پتا ہے مولوی صاحب!“ بانو مصلیٰ چھاندر کر دروازے کے پاس آٹھری ہوئی۔ ”آپ ڈر رہے ہیں۔ آپ میرے وجود سے خوف کرا رہے ہیں۔ میں زمینداروں کی لڑکی ہوں۔ مجھے علم ہے کہ جب بچی پکائی گلوں کی رسیاں فسلوں کو راتوں میں گھیز کر لوڑ اُجڑ جاتے ہیں۔ ان کی جڑوں پہ جو بے سبب لگاتے ہیں اور مٹی اور آلوؤں کے تیار کیتوں میں ”سبب“ پڑ جاتی ہے تو زمینداروں کے دل پہ کیا زرتی ہے۔ فصل کو دوبارہ اُگ آتی ہے۔ کیت پھر لہلہا لگتے ہیں لیکن بنی بنائی عزت پہ دن دھاڑے ڈاکا پڑ جاتے تو دوبارہ نہیں آتی۔ آپ اپنی عزت سے ڈرتے ہیں مولوی صاحب؟“

”بانو! تم بڑی سیانی باتیں کرتی ہو۔“ مولوی صاحب نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ دھر۔ ”پھر اپنی عزت کیوں داؤ پہ لگانے پہ ٹپکی ہو؟“ ”آپ نہیں سمجھیں گے مولوی صاحب۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔ اس کا انداز اس کی قدر قطعی تھا کہ مولوی صاحب کو خود پہ جاہل مطلق کا گمان ہوئے تھا کہ ”اگر فیض محمد“ سے ملنے نہ ہوتا تو شاید میں چلی جاتی مگر خیر۔ میں حجرے میں چلتی ہوں آپ نے فکر ہو جائیے۔“ وہ غراپ سے حجرے میں گم ہو گئی اور دروازہ بھیڑ لایا۔

اس روز مولوی حسن دین نے نماز پڑھائی، نماز کے بعد ہلکا ہلکا وعظ بھی کیا اور قرائت پاک کا درس لینے والے بچوں کو اکلا سبق بھی پڑھایا۔ درزیہہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے، وہ فیض محمد کی متوقع آمد سے متعلق چوکنہ بھی رہے اور حجرے میں مقیم بانو کے ساری کی طرح افشا ہو جانے کے ضرر سے بے چین بھی۔ حتیٰ کہ اہل بل کے رشتہ یاد کر نے والے بچوں کی تیسری قطار میں سلطان خان کی شکایت کرتے اسلم کمار کے لڑکے خورشید نے جب حجرے سے چھڑی نکال کر لانے کی پیش کش کی تو انھوں نے

احمد علی پسر سلطان خان کی شرارت کو بذات خود دیکھنے کے باوجود خورشید کو جھڑک دیا اور احمد علی کو پکھنچ بھی نہ کیا۔ لڑکوں نے پہلے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر یاروں میں منہ دے کے زور زور سے ہنسنے لگے۔ جب مولوی صاحب پھر بھی چپ رہے تو انھوں نے ایک دوسرے کو چٹکیاں کاٹیں اور آٹھ پچا کر ایک آدھ کو وصول دھپا بھی کیا۔ چاشت کے قریب بچے آگے پیچھے سمجھ سے نکلے تو بانو باہر آئی۔

”فیض محمد نہیں آیا مولوی صاحب؟“ اس کی آواز میں خندے اور خوف کی ریز کر لرز رہے تھے۔ انھوں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ چپ رہ گئی۔ پھر مٹی کو پاؤں کے انگوٹھے سے کریڈتے ہوئے کچھ بڑبڑائی پھر سیوھی چلتی باہر کو دروازہ پار کرتی۔ مولوی حسن دین نے سینے میں دہلی گہری سانس خارج کی اور عمر دین کا انتظار کرنے لگے کہ اس وقت بخاری شریف کا درس لینے آتا تھا۔

عمر دین مولوی صاحب کا بڑا بیٹا تھا۔ اس نے پانچ کوس پر قصبائی سکول سے میٹرک پاس کیا تو چودھریوں کے لڑکے فیض محمد کے ساتھ لاہور جانے کے پروگرام بنائے۔ لگا فیض محمد اس کا لکھنؤ آیا تھا۔ دہلوں نے اپنے بچپن کا زمانہ اٹھنے کا گلوں کی چھوٹی نہر میں جھلکنا دیکھا، چودھریوں نے بھی چوڑی راستی کے نئے گھر چوستے، آگ کے الاؤ پہ کپے کپے لڑکی ہاس ہو گئیں اور کمریوں کی شائیں کڈی کے داؤ ایک دوسرے پہ آزماتے لڑ گئیں

تھیں اور مولوی حسن دین اچھی طرح جانتے تھے کہ چھوٹے چودھری کا مراد میں، موچیوں اور کھاروں اور کم رقبے والے کسانوں کے لڑکوں کے ساتھ ٹھیل کود کرنا اور بات بے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اُن کے پہلو پہ پہلو ملی مدارج طے کرنا دوسری بات ہے۔

سال میں ایک بار گندم اور ایک بار موچی کی فصل اکٹھی کر کے انھوں نے ایسا کوئی تیرہ تارہا تھا کہ بیٹے کی تعلیم اور رہائش کے اخراجات پورے کر سکتے۔ دوسرے اُن کا ارادہ اُسے اپنے سالے کے پاس دیوبند بھیجے گا تھا

کہ حدیث کا عالم بن رہا تھا اور اس نے مولوی حسن دین سے وعدہ کر رکھا تھا کہ مناسب موقع ملے ہی وہ بھانجے کو لاوا بھیجے گا۔

عمر دین سمجھدار بیٹہ تھا۔ باپ کے کہنے پہ اس نے اپنی ضد واپس لے لی اور لاہور جانے کے بجائے مسجد میں باپ سے بخاری شریف کا درس لینے لگا۔ ان دنوں مولوی صاحب کو اندازہ ہوا کہ ان کا بیٹا کچھ مختلف سوچنے لگا ہے۔ اس کی نگاہوں میں باپ کا احترام جھلکتا ہے۔ وہ ان کی بزرگی اور شرافت کا مدافع ہے اور ان کی علمی فضیلت کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ مگر وہ ان جیسا نہیں بننا چاہتا۔ ”پتھر! امامت نہیں اور کیوں کا منصب رہا ہے۔“ مولوی صاحب اسے سمجھاتے۔

”لیکن اباجی! آپ نے اسے پیشہ بنادیا ہے۔“ ”چلو پیشہ ہی، بے باقی پٹیلوں سے بھلا ہے کہ نہیں؟ دیکھو یہ وہ عمل ہے جسے اللہ کے نبی نے ساری جاتی خود انجام دیا اور مرنے سے پہلے اپنے خلیفہ کو اس پہ مامور کر گئے اور خلیفہ نے اپنے سے اگلے خلیفہ کو اور اگلے نے اپنے سے اگلے خلیفہ کو۔“

”اباجی!“ عمر دین کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر تو گاؤں میں نماز پڑھانے کی ذمہ داری چودھری کی تھی مگر کو آٹھائی چاہیے اور صنعت کی سمجھ میں مصلحتی کمشرو کو اور صوابی دارالکومت میں گورنر صاحب کو اور۔۔۔۔۔“

عمر دین کی فہرست لمبی ہو گئی اور مولوی صاحب اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ذرا دیر کے بعد بولے تو ان کی آواز میں عجیب پابیت کا رنگ لگا ہوا تھا ”کہہ دو تو تم ٹھیک رہے ہو بڑا پرمادت زوری منصب داروں نے منصب کا حق سمجھا اور اسے ادا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ حکومت کو ہوں اور لوہے کے بندوں نے بانی لیا اور دین پیشہ بننے کے لیے چھوڑ دیا۔“

”تو فیکھ ہے میں بھی آپ کی میراث ضرور سنبھالوں گا مگر تب، جب منصب پہ حق دار فائز نہ ہوں لیکن گے جو اس کے اہل ہوں گے اور اس ذمہ داری کو نبھانا جانتے ہوں گے اور ہو سکتا ہے اباجی! تب میں بھی

سی علاقے کا چھوٹا موٹا صاحب چاہوں۔“ اس کے کچھ کی شرارت جان کر مولوی صاحب لاچار پڑھ کر رہ گئے اور انھوں نے دل میں پکارا ارادہ کر لیا کہ وہ اُسے جلد از جلد دیوبند بھجوا دیں گے۔

مولوی صاحب مسجد سے اٹھے تو چودھری فتح محمد کی حویلی کی راہ لی۔ وہ بانو اور فیض محمد کے معاملے کو جلد از جلد ان کے گوش گزار کر کے اپنی پتلی گردن کو کسی متوقع پھندے سے بچا لینا چاہتے تھے۔ چودھری صاحب حویلی کے احاطے میں اپنے مخصوص رنگین پاپون والے نوازی پٹنگ پہ نیم رہتے تھے۔ ان کے بھاری پتھر کا طرہ ہاگ دیتے مرنے کی کٹفی کی طرح سیدے رخ میں یوں اغشا ہوا تھا جیسے ابھی نیچے سے آواز آئے کی ٹنگو لوں کوں۔ پٹنگ کے طول و عرض پہ پھلے چودھری صاحب کے تن و تنش کو رمضان مصلیٰ اور جہان مرانی نے بیک وقت خوش مہارت سے قابو کر رکھا تھا اور بڑی مہارت سے اُسے دبار ہے تھے۔

”آؤ جی! مولوی صاحب! جی آیاں نوں۔“ انھوں نے مولوی صاحب کے سلام کا جواب دے کر موٹھ پر ہے بیٹنے کا اشارہ کیا اور مرانی کے ہاتھوں ٹانگ چھڑاتے ہوئے بولے ”جہاں! حق تازہ کر کے لا اپنے مولوی صاحب آئے ہیں۔“

”مہربانی چودھری صاحب! اس کی ضرورت نہیں ہے میں تو اس وقت آپ سے چند خاص باتیں کرنے آیا ہوں۔“ مولوی صاحب نے تمہید بانجی اور چودھری کا اشارہ پا کر دونوں کا مے دہاں سے ٹھک لے۔ مولوی صاحب صبح کا قصہ مختصر بیان کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”چودھری صاحب! چھوٹا منہ بڑی بات، بانو آپ کی سنجی ہے اور فیض محمد کی اولاد بہتر ہوتا تو آپ بھائی آئیں میں بیٹھ کر معاملہ طے کر لینے اور جی خاندان کی عزت کو نہ رو نہ۔“ بات یہ ہے مولوی جی! ”چودھری فتح محمد نے تہہ بند سمیٹا اور تھوڑی دیر ادھر ادھر ہاتھ مارنے کے بعد پٹنگ پر آتی پاتی مار کر بیٹنے میں کامیاب ہو گئے۔“ غلام محمد جھ

سے کی جیسے چھوٹا ہے، عمر بھی مجھ سے بھی نہیں تھی۔ اُسے ”نبرداری“ کے منصب پر پہنچنے میں ابھی وقت لگے گا۔ مگر وہ ایک ہی سنت میں آئے جا لینا چاہتا ہے۔ چوہری ابھی وہ اتنا سنا ہے کہ اگر کبھی چاہنی کرتے کی کا سے کو ٹانگ مار کے پرے گرا دے تو وہ ادھر ادھر ہوجانے کے بجائے ہاتھ جوڑتا، ناک رگڑتا دوبارہ اس کی جی حضوری کے لیے آہنچتا ہے۔ پڑکھوں کی دیشیں کس طرح بوجھاتے ہیں اور اپنے مربیع کس طرح چھوٹے زمینداروں کے رگوں تک پھیلاتے ہیں یہ وہ ابھی نہیں جانتا۔

یہاں تک پہنچ کر چوہری صاحب پاپنٹے لگے۔ انھوں نے اوپر کا زانو نیچے اور نیچے کا زانو اوپر رکھتے اور سانس بحال کرتے ہوئے بولے۔ ”اس کی بیوی بانو کا رشتہ اپنے بھائی کو دینا چاہتی ہے مگر ہم جیتے ہیں باپ دادا کے مربعوں پر غیروں کے بل چلنے نہیں دیں گے۔ فلہذا کوئی بات اس کے نہیں کرے بانو ہمارے ساتھ ہے۔ فیض محمد کو آئے میں سمجھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے وہ کچھ بدلتی تھی مگر اب مطمئن ہے۔ مولوی صاحب! وہ مسجد سے سیڑھی میری طرف آئی ہے۔ پہلے آجاتی تو اچھا تھا۔ مگر خیر..... اور اب وہ میری پناہ میں ہے۔“

”بات یہ ہے چوہری صاحب!“ مولوی حسن دین نے خشک ہوتے غلغلو کھوکھو سے تر کرتے ہوئے کہا ”آپ دونوں صاحبان ایک داد کی اولاد ہیں اور میرے لیے دونوں قابلِ قدر ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کم از کم مجھے ایسی کسی آزمائش میں نہ ڈالیں جسے آپ میں سے کوئی اپنے لیے ذلت جانے۔“

”اچھا اچھا تو آپ اس لیے آئے ہیں۔“ چوہری صاحب کا فلک شکاف قبچہہ ان کے گل چیموں سے ٹکرا کر کھڑکیا اور ان کا بڑے فطر والا پیرت پر تک تصل حاصل کرتا رہا۔ بڑی دیر بعد جب یہ طوفان تھا تو چوہری کی باپنچی آواز مولوی صاحب کی ساعت سے گرائی۔ ”آپ فکر ہو جائے مولوی صاحب! فیض محمد نے اس کا انتقام کر لیا ہے۔ آپ گھر جا کر اللہ اللہ کریں۔“

مولوی صاحب اٹھے تو جہاں اور رمضان یوں چوہری کے وجود پر لپکے جیسے کدو تازہ لاش پر چھپتی ہے۔

مولوی حسن دین کی گھر اس وقت دو چند ہوگئی جب ظہر کی نماز پڑھا کر وہ گھر آئے۔ بمس اللہ بڑھ کر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عمر دین حسن میں داخل ہوا۔ اس وقت اس کا چہرہ معمول سے زیادہ ہنستا تھا اور اس پہ اٹو کھا سا جوش اہریں مارتا دکھائی دیتا تھا۔

”ابائی!“ وہ ان کے قریب چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا ”میں آج ایک ایسا کام کر آیا ہوں جسے جان کر آپ شاید ناراض ہوں گے۔ مگر میں نے صرف بارے باری نبھائی ہے۔ آپ جانتے تھے ناں کہ میں آپ کی منہ سنبھال لوں تو میں امام مسجد بن کر فیض محمد کا بنو سے نکال پڑھا آیا ہوں۔“

یہ سن کر مولوی صاحب کا لقمہ حلق میں پھنس گیا۔ انھوں نے پانی کا پورا گلاس غلاف معمول ایک ہی سانس میں چڑھا یا اور بغیر کھائے برتن آگے بڑھا کر بولے۔ ”یہ تم نے کیا کردیا عمر دین۔ اب ہم غلام محمد کے قبر سے کیسے بچ جائیں گے۔ کیا تم جانتے نہ تھے کہ امام مسجد سارے گاؤں کا سماجی ہوتا ہے۔“

”جیسے موچی، مرائی، ماچھی اور جولا ہے سب کے سانچے ہیں؟ یہ ناں ابائی؟“ عمر دین کے کچھ میں جو طنز کی کاٹ تھی وہ مولوی صاحب سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔ مگر اس وقت وہ ایسے کی بحث مباحثہ کے حق میں نہیں تھے۔ انھیں صرف عمر دین کی حماقت پر افسوس ہو رہا تھا۔

”ابائی!“ عمر دین دوبارہ بولا تو اس کی آواز میں اطمینان چمک رہا تھا۔ ”آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ چوہری صاحب کا ہاتھ ہمارے اوپر ہے۔ وہ خود بانو کے ولی بن کر آئے تھے۔ پھر آپ کو معلوم تو ہے فیض محمد میرا دوست ہے۔ میں اس میں کیا کیسے ناں سکنا تھا۔“ مولوی صاحب نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ عمر دین کو لگا ان کے قدموں میں صدیوں کی تسکین دوڑ گئی ہے۔

کناج کی اطلاع آنا تھا یہاں سے وہاں ہوتی پورے گاؤں میں پھیل گئی اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے دونوں اطراف کے محل دسے میدان میں اتر آئے۔ گئے اور مکئی کے کھیتوں کی ادٹ میں مورچہ بندی ہوئی۔ بازو چڑھا کئے۔ انتظام کی فتیں کھاتے اور بڑھیں مار مار کر منہ سے نف آڑتے گئے اور کبھی ادھ بکی فصولوں کے آر پار بارہ پوری بندوبست اور آہنی انگلیں شعلے لگاتے گئے۔ ادھر سے ایک گولی چلی تو اُھر سے جواب میں چار آئیں۔ کوئی ایک فریق بھی پیچھے نہ بنا کر ورنے کو تیار نہ تھا۔ جانشینوں کی سپاہ تازہ ملک کے ساتھ موقع پر پہنچتی رہی اور رات کے جب کچھ ٹھہرا دیا تو معلوم ہوا کہ چوہری فتح محمد کی طرف سے ”خان“ مصلیٰ اور چوہری غلام محمد کی طرف سے مصلیوں کے ہی کڑیل جوان ”فیض خان“ مالکوں پر قربان ہو گئے۔ گولا باری وقتی طور پر بند کر دی گئی۔ لاشیں سینئیں گئیں اور اس رات مصلیوں کی گھنٹی میں متوالین کی وارث عورتوں نے اتنے دھشت ناک بین کیے کہ کلیوں کے کتے بھی بھونکنا چھوڑ کر دلیروں پر دیک گئے اور گاؤں سے باہر سانسوں کے ڈیرے کے پھوڑاؤں سے بیروں کے جھنڈ پر آکھینچتے رہے۔

دو چار دن یوہی و یوہی اور سکوت اڑے گزرے تو برادری کے بوڑھے حرکت میں آگئے۔ انھوں نے سوچا دونوں ایک داد کی اولاد، مینڈے سے مینڈے بھئی ہے اور پھوٹت سے پھوٹت، ایک دوسرے سے فرار ہو بھی تو کیسے ہو؟ دونوں فریق یوہی تھے رہے تو مزید خون خرابا ہوگا اور بارود دینے کو لے مصلیوں اور موچیوں کے سینوں کو چھلانگ کر اپنے لہو کو جانے لگیں گے۔ زمینیں اپنے خون سے سیراب ہونے لگیں گی اور چوہری عطا محمد کی ساری نسل کسی اندھی دشمنی کی سمیٹ چڑھ جائے گی۔ چوہری فتح محمد کے چڑکا کا اونچا طنز وہ سوگ کی علامت بن کر ان کے کندھے پر لٹکا رہ جائے گا اور غلام محمد کی رنگین ستونوں والی حویلی میں محض دھول اڑا کرے کی تو اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا خسارہ ہوگا؟

دلیل

کسی ملک کے صدر کو اس کے مشیر خاص نے مشورہ دیتے ہوئے کہا ”جناب والا! آپ بس اپنا فیصلہ سنا دیا کریں، فیصلے کے ضمن میں کوئی دھکیل نہ دیا کریں۔“

”وہ کیوں؟“ صدر نے پوچھا۔

مشیر نے کہا ”جناب بات دراصل یہ ہے کہ فیصلہ تو بہر حال آپ کا سب کو ماننا ہی پڑتا ہے، لیکن دلیل سن کر لوگ ہلکتے لگتے ہیں۔“

(خطبہ الدین، لاہور)

لہذا دونوں گھرانوں میں بزرگوں کی آمدورفت بڑھ گئی۔ ابتدائی چیموں پچاس کرنے، علامتی بازو چڑھانے اور مصنوی آڑفوں دکھانے کے بعد بالآخر دونوں اطراف کے مابین مذاکرات کا بالواسطہ سلسلہ شروع ہوا۔ چوپال میں پچایات مسلسل تین روز تک بھینتی رہی۔ بانو کے تنخیال دالوں کا خون گرم ہو کر ابلتا رہا۔ بات چیت کے دوران بار بار ہاتھ پھلوں میں اڑی بندھوں پہ پڑتے رہے۔ نو جوان اک دوسرے کے گریبان پکڑنے کو بلے تاب ہو اٹھتے اور بڑے انھیں ٹھنڈا کر کر کے بٹھاتے رہے۔

تیسرے دن شام ڈھلے خاندان کے سب سے عمر رسیدہ اور جہاندیدہ بزرگ ”نیک محمد“ نے مشیر کے اعلامیہ سنایا جس پہ سب کا اتفاق ہونا قرار پایا۔ اب ایک بات ہے کہ کچھ سر پھرے غیرت مند نو جوان دھتوں کے چیمے منہ دے کر بڑبڑ کر رہے تھے اور اپنی رانوں پہ ہاتھ مار مار کر علامتیہ بات دیتے تھے کہ اگر بزرگوں کی زبانون کا پاس نہ ہوتا اور اگر پڑکھوں کی قبریں ہاتھ نہ باندھ دیتیں تو آج چوپال سے کوئی زندہ نہ جانے پاتا۔

فیصلے کے مطابق قرار یہ پایا کہ بانو کے بدلے میں چوہری فتح محمد کی بیٹی کلثوم بانو کے کمرے بھائی سے بیاہ دی جائے گی جو اپنے ساتھ ایک مربع قابل کاشت زمین بطور جہیز لے کر جائے گی۔ چوپال میں اس وقت گاؤں

ایک ماں
اور باپ
کی کہانی

مقدر

انہوں نے ایک
ڈراؤنا سپنا دیکھ لیا تھا
وہ اپنے اُس بیٹے سے
بہت پیار کر بیٹھے تھے
جس کو اپنے بیٹے کا
مستقبل زیادہ عزیز تھا

غزالہ محمود

دلوں کے تعلق کو جیسی طرح جانتے ہیں۔
”مولوی جی!“ بابا نیک محمد بولا۔ ”آپ نے درست
فرمایا، غلطیاں بچوں سے ہی ہوتی ہیں مگر غلطیاں اپنی جگہ
اور اصول اپنی جگہ۔ آپ نے دیکھا نہیں فیض محمد سے غلطی
ہوئی اور اس کا تانا بان یہاں اس کا بابا بیٹھا بھر رہا ہے۔
عمر دین کو بھی اپنے کیے کی سزا ملگنا ہوئی۔“

چوپال میں سناٹا چھا گیا۔ صرف بزرگوں کی چارپائی
کے ارد گرد دھن دھن کھیاں بجھناتی رہیں۔ ”میں فیصلہ سنا
رہا ہوں۔“ بابا نیک محمد کچھ دیر کے بعد بولا ”عمر دین کو
بیس چوپال میں سب کے سامنے ۱۰ جوتے مارے
جائیں گے۔ جرم ماننے کی سزا اس لیے نہیں سنانی جا رہی کہ
وہ مولوی حسن دین کو ادا کرنا پڑے گا اور اس میں ان کا
کوئی قصور نہیں۔ پھر وہ چڑے کے بزرگ ہیں۔ ہمارے
دلوں میں ان کے لیے بڑی عزت اور احترام ہے اور

جب مولوی حسن دین اپنے صافنے کے کنارے سے اپنی
آنکھیں پونچھ رہے تھے اور عمر دین ضبط کی آخری حد پر کھڑا
تھا اور جہاں مصیٰ چودھری فتح محمد کا اشارہ یا کر اس سے
قریب ہوا تھا تو فیض محمد نے تڑپ کر چودھری فتح محمد کا تہند
پکڑ کر کہا تھا ”ابا جی! میرا باپ تو پھر اسے سزا دیں؟“

چودھری صاحب نے ایک جھٹکے سے اپنا تہند اس
کے ہاتھ سے چھڑایا اور چپک کر بولے ”تو اس کی جگہ تاج
کر کھڑے ہو جاؤ۔“ فیض محمد نظریں پڑا کر رہ گیا۔

”دیکھو فیض محمد!“ چودھری صاحب نے اپنی آواز کو
دھماکے کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے کیے کو میں نے قربانی
دے کر ڈھانک لیا ہے۔ اس سے بڑھ کر تم اور کیا چاہتے
ہو؟ تمہاری جان چلنے کی خاطر مجھے غلام محمد کے سامنے
سر جھکانا پڑا۔ ایک مربع زین سے ہاتھ دھونا پڑے۔
تمہارے کیے کی پادشاہی میں میرے وفادار مصیٰ کی جان
گئی ہے اور تو اپنے یار کی ذرا سی بے عزتی برداشت نہیں
کر سکتا۔ اوئے آخر مولوی حسن دین ہمارا گیا رکھوں گی
ہی تو ہے۔“

کر کردہ گلوں کے علاوہ ہستی کے چندہ پھر افرامی
موجود تھے جن میں مقتول مصلیوں کے رشتے دار مردوں
کے علاوہ کچھ کاٹے، پرائری سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب،
غلام رسول کوچر اور ان کے ذاتی طرف بیٹھے مولوی
حسن دین تھے جو اس صبح پر دل سے مسرت محسوس کر رہے
تھے اور ان کا بیٹا عمر دین جو فیض محمد کا لنگہ ڈیا رہا تھا اور اس
وقت بھی اس کے قریب چوڑے پاپوں والی چارپائی پر
بیٹھا اٹھ کر اس کے گلے ملنے اور اسے مبارکباد دینے کا
سوچ رہا تھا۔ جب دلوں چودھری صاحب ان اٹھ کر ایک
دوسرے کے گلے لگے اور مبارک سلامت کا شور مچوا کر
ہوا تو چودھری غلام محمد کے سالے کا لڑکا جو اس سے قبل
فیض محمد کا قریب تھا اور اب اس کا بہنوئی بننے کو تھا، نے
درزیدہ نظروں سے عمر دین کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ
سے اٹھ کر بابے نیک محمد کو مخاطب کر کے بولا:

”میاں جی! اللہ کے فضل سے اور بزرگوں کی
دعاؤں سے سارے فیصلے سیدھے ہو گئے پر یہ تو پتا چلے کہ
فیض محمد کا نکاح کس نے پڑھایا تھا؟ کیوں جی؟“ اس نے
مجمع کی طرف رخ پھیر کر کہا۔ ”آخر پتا تو چلنا چاہیے کہ
کون ایسا..... کا ختم ہے جس نے چودھری غلام محمد کے
گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور جس کا سر کو
مولوی حسن دین جیسے بزرگوں نے نہیں کیا اس نے اس کی
جی جرات کر لی۔“

”چال چالی!“ چودھری غلام محمد بولا۔ ”بچہ درست کہتا
ہے۔ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے اسے سزا ملنی چاہیے۔
آخر وہ کیوں چھوٹ جائے۔ آئندہ کوئی ایسا کرے گا تو سو
مرتہ سوچے گا۔“

اس وقت اگر کوئی عمر دین کے چہرے کی طرف دیکھتا
تو اُسے معلوم ہوتا کہ اس کے بدن کا سارا خون سمٹ کر
اس کے چہرے پر جمع ہو گیا ہے۔ ”چودھری صاحب!“
مولوی حسن دین ٹھکھار کر بولے۔ ”عمر دین بچہ ہے اور
بچوں سے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ پھر اس نے یہ
حرکت محض فیض محمد کی یاری میں کی ہے۔ آپ تو ان

کنیزو

درد زدہ مین پڑی کراہ رہی تھی۔ اُس کی نند صغیراں باہر اینٹوں کے بنے چنڈے پر دودھ گرم کر کے اُس میں تازہ کھن اور شکر ملا اُس کے لیے لے کر آ رہی تھی۔

بابا امیر وچلم میں تہا کو اور گوڑا ڈال کر اور چھنے سے دیکھتے انگارے جمار ہوا تھا۔ انگارے رکھنے سے گڑھنڈا سا پھسل گیا تھا اور تہا کو کو سونگی سونگی مہک آٹھ رہی تھی۔ کچے چھن میں ایک طرف تھان پر بکری بندھی تھی۔ ٹوٹی ہوئی اوداٹن والی دو تین چار پائیاں پڑی تھیں۔ تین چار کالی کوئی بچیاں ملے، ٹوٹے کناروں والے بیالوں میں چائے پانی رہی تھیں۔ ممبر کا مہینا تھا، بلا کی سر دی پڑی تھی۔ ٹھنڈی اور سرد ہوا میں جسم کے آ رہا ہو پانی جاتی تھیں۔

صغیر کی ماں بھا کو شاید بکری کے لیے چارہ لینے گئی تھی۔ تھان پر بندھی بکری بار بار مریا اٹھتی۔ اُس کے خالی تھن لٹک رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے بابا نے دو دھوہ کر چائے بنا کر خود بھی پی اور بچیوں کو بھی بیالوں میں ڈال کر دی تھی۔

پتروں کی اس ہستی میں وہ بچھلے اٹھارہ برس سے مقیم تھے۔ بھٹے کے مالگوں کا قرضہ بہت بڑھا گیا اور رات کی تاریکی میں سارا خاندان وہاں سے فرار ہوا تھا۔ ملکوں نے چوہدریوں کا قرضہ ادا کر کے اس خاندان کو پناہ دی تھی۔ اب امیر وکا سارا خاندان دن رات ملکوں کی خدمت پر مامور تھا۔ اکثر کنیز وکو بھی بڑی مالکانی بلا جھیتیں۔

کنیز و ساگ کاٹنے، روٹیاں پکانے، مسالہ پیینے، سر میں تیل مالش کرنے اور کئی ایسے چھوٹے چھوٹے کام انجام دیتی۔ اس طرح اُسے کپڑوں کی آڑن مل جاتی یا اکثر و بیشتر سان بھی مل جاتا۔ کھوسے سے روزانہ تازہ ہنری یوں بھی مفت مل جاتی تھی۔ بڑی بھولت سے گزارا ہوتا تھا۔ جب سے اس مرتبہ کنیز و کو پالت سے گزارا ہوا ہے تھے، وہ بچہ پاگل ی ہو گئی تھی۔ اکثر رات کو ریل گزرنے کی آواز سن کر بہتر میں اٹھ کر بیٹھ جاتی۔

”مغیرے، اب ہم اس گاؤں میں نہیں رہیں گے۔ اگر کا کا کھیلنے چھینے ریل کی پٹری پر چلا گیا تو پھر کیا ہوگا؟“

”دماغ پھر گیا ہے تیرا۔۔۔ کون سا کا کا؟“

کنیز و خاموشی سے بستر میں لیٹ جاتی۔ کبھی کبھی سوئے میں بڑ بڑاتی۔ ”میر تو آترا ہی مر جائے گا۔ تیری منجی کو کا ندھا کون دے گا؟“

”میر دوڑ کر جا۔۔۔ کا کا ریل کی پٹری پر چلا گیا ہے۔“

بچیاں سارا دن میلے کپڑے پہن کر آوارہ پھرتی رہتیں۔ کنیز و کی ذہنی حالت دن بدن بگڑ رہی تھی۔ بابا امیر و کہتا۔ ”اری بھاگو اسے ماں کے پاس چھوڑا، یہ تو پاگل دیوانی ہو گئی ہے۔“

”اب اس حال میں کہاں چھوڑ آؤں؟ شریک طعنے دیں گے۔ فارغ ہو جائے تو چھلہ ماں کے پاس کرے گی۔“

”میں نے لعل شاہ کے مزار پر حاضری کی منگ مانی ہے۔ اوارہ رہی چڑھاؤں گا۔“

پھاگو گئی۔ ”بس اللہ خیر ہی کرے۔“ فارغ ہو جائے تو کسی سیانے سے دم درو کر واؤں۔۔۔ بچیوں کا ساتھ ہے۔ پاگل ہو گئی تو کیا ہے گا؟“

”بیٹیوں کی رفتار دیکھ کر پھلکا جاتا ہے میرا۔ اللہ بیٹے کا مدد دکھائے۔“

بابا امیر و بڑے فکّر سے کہتا۔ ”بیٹا مل گیا تو کنیز و کا دماغ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ بیٹی کے خوف نے اُس کا دماغ مفلوج کر دیا ہے۔“

”بس ایک دن گھر ویران کر جائیں گی۔“

”ان کا کیا ہے باہر کا گڑا ہیں۔ نہیں پھینک دو۔۔۔ گھر تو بیٹوں سے بنتے ہیں میرے۔“ بابا امیر و کہتا۔

”بس کر بابا۔۔۔ نہ کیا کر ایسی باتیں۔۔۔ پتا نہیں ان نمائیوں کی قدر کی اللہ کو کتنی بُری لگتی ہوگی۔“

”اللہ سے بیٹھی خُراد مانگا کر میرے۔“ بھلا کبھی دھیان بھی پڑتی ہیں! بابا امیر و دیکھ ہو کر کہتا۔

”نہیں رموں گی یہاں۔ واسطہ خدا کا اس پٹری کو اکھیر کر کہیں زور پھینک دو۔۔۔“

”آؤ،“ کنیز و بلہا رہی تھی۔

”میں تو کہتا ہوں بابا سے نیچے جھکنا دے۔ وہاں اس کی ماں اسے نہال لے گی۔“

”ابھی تو دس دن رہ گئی ہے اس کی ماں پاس۔ ایک تو یہ بھی منجی میں زبان نہیں ڈالتی۔“

”میں جو کہتا ہوں وہ نہا ہے تو نے؟“

”چھوڑ آؤں گا بابا۔ خدا کا واسطہ تو چپ رہ۔“

امیر و نام ہو کر کھائے لگا۔

کنیز و اب کراہ رہی تھی۔

”ایک دفعہ یہ فارغ ہو جائے، میں اسے پکا اس کی ماں کے حوالے کر کے آؤں گا۔ یہ عورت اب مجھے پیینے نہیں دیتی۔“

صغیر کی بہن صغیراں گرم گرم دودھ میں کھن ڈال کر لاری تھی۔ بابا بھی اب چلنے پھرنے سے معذور تھا اور ادھر کنیز و لاچار تھی۔ بچیاں سارا دن میلے کپڑے پہنے آوارہ پھرتی رہتیں۔ صغیراں روٹی پکا کر دو چار والے کھلا دیتی ورنہ کنیز و کو تو اپنے حال کی خبر نہیں تھی۔ پٹری پر سے گاڑی گزرتی تو اس کی گر گر اہٹ کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہتی۔ کنیز و چونک کر اٹھ بیٹھتی اور تین کر کر روتے لگتی۔

”پتا نہیں اس کے دماغ کو کیا کسر ہو گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کا ساتھ ہے۔ میر میں تو کہتا ہوں کسی سیانے کے پاس لے جا لے۔“

”کہاں لے جاؤں اُتا؟ پاگل ہو گئی ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“

”میں نے تو ابھی پوترے کی کھٹائی بھی نہیں باقی صغیراں لعل شاہ کے مزار پر چادر بھی مانی ہے۔“

”بس اُتا۔۔۔ اللہ ڈاڈا ہے۔ اُسے منظور ہوگا تو بھ جو جائے گا۔“

نورُوحہ امیر و پوتیوں کو دیکھ کر سر پیٹنے لگتا۔ ”ان کو پٹری پر جانی تو کیا تھا۔۔۔ رب نے ایک پڑھی نہ دیا۔“

”ایسا نہ کہہ بابا۔ ان نمائیوں کا کیا مقدر ہے؟“

”اللہ ان نمائیوں کی ہی سن لے۔ ایک بھائی دے

دے نہیں۔“

بابا امیر و آسمان کی طرف دونوں ہاتھ بلند کر کے نظر میں آسمان پر گاڑ دیتا۔ گویا اللہ جیساں سے کوئی سوال کر رہا ہو۔ اس مرتبہ صغیراں اپنی بہن صغیراں کو لے گیا تھا۔ صغیراں اکثر بھائی کے گھر آتی جاتی رہتی۔ کنیز و کی ذہنی حالت جب سے بگڑی تھی، بچیوں کی دیکھ بھال بھی اُسی کے ذمے تھی۔ کنیز و کی لینی ڈاکٹر کے پاس وہی لے کر گئی تھی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اُسے بتایا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد کنیز و کی ذہنی حالت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ ایسا صرف خون اور چند ضروری دوائیں کی کمی سے ہوا ہے۔ صغیراں اپنے سرال میں تھی، صغیراں سرال میں اُسے لینے آ گیا تھا۔

”کنیز و تھکا ہے۔ جلدی چل۔“

دوسرے دن بُرخ آؤں، پیر میں میں سلپیر رہا، اُجھنی پٹی پھرتی پٹی گڈھنوں پر تیز تیز چلتی رہیوے لائن کی پٹری پارکر کے مغیرے کے ساتھ اُس کی ہستی میں آتر آئی تھی۔

درد تو ابھی کم تھے، کنیز و یونہی بستر میں منہ لینے رو رہی تھی۔ پچھلے چھ سات برسوں میں اُس کے ہاں کئے بعد دھیرے دھیرے بیٹیوں نے جنم لیا تھا۔ ہر مرتبہ خوشیوں کی آس بندھتی اور ٹٹ جاتی۔

کنیز و تکیے پر سر تھک کر روتی۔ دائی اپوی سے سر بلاتی باہر آتی۔

”بابا امیر و، تجھے بھوک جان کی نہارک ہو۔۔۔ بیٹی نے گھر ویران کیا ہے۔“

بابا کھٹے کا ٹکس لگا کر کہتا۔ ”ایک دن گھر ویران کر جائیں گی۔۔۔ یہ ٹکس گے تو آڑ جائیں گی۔“

”ارے باہر کا گڑا ہے۔ پتا نہیں کہاں جا کر پڑے گا۔۔۔“

”چپ کر بابا۔“ صغیراں کہتا۔ ”تیری اپنی بھی تو ۵۵ بیٹیاں ہیں۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں جھیل، ساری بھر کر کے اڑ گئیں۔ آج تیرے لیے بے پریشا ہوں ناں..... ذکا کر کوئی جتنی کوا نہ دھا ہے والا آجائے۔ جتنی تو زندہ جنازہ ہوتی ہے نمبر سے۔“

آج پھر وہی منظر تھا۔ کینز و درد میں پوری جان سے کانپ رہی تھی۔

منیر ادا کی کو لینے گیا تھا۔

”اللہ کرے تیرا لٹا ناگ جائے نمبر سے۔“

”رب تجھے اوتر اند کرے۔“ بار بار امیر و با آواز بلند کہہ اٹھتا۔

منیر کی ماں بھاگی بکری کے تھکے لے کر آتی تھی۔

بکری کے سامنے تجھے بکیر کہہ کر بولی ”خدا سے خیر نامک امیر و۔ تیری بھو کی جان پر جی ہے اور تو جینے کو رو رہا ہے۔“

”تو آرام سے بیٹھ..... ذکا دے رہا ہوں..... تجھے کیا تکلیف ہے۔“

بھاگی نے چولہے پر سو جی کا گرم گرم حلوہ بنایا۔ آلو کا سالن پکایا اور روٹیاں پکا کر پیچوں کو سر مشای ہی کھانا دے کر شلا دیا۔

کینز وہ صرف پتہ زے کی گرم گرم بخنی پی تھی۔ حلوہ سارا توڑا توڑی سے خوش لیا تھا۔ رات گئے جب بھر کے تمام افراد وہ تہائی نیند کا حوضہ پورا کر چکے تھے۔ اندر سے بچے کے رونے کی صدا بلند ہوئی۔

امیر و چونک کر اٹھ بیٹھا۔

”اٹھ بھاگی۔ بچے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اندر جا کر خبر لے۔ کیا ہوا ہے؟“

بھاگی بستر سے اٹھتے ہوئے یو یواری تھی۔

”لوکی ہوئی ہوگی۔ سارے آکار وہی تھے۔ شام سے بڑی اڑیاں لگڑ رہی تھی۔ لڑکا ہوتا تو اسے کڑے درد نہ لگتے۔“

اتنے میں منیر ادا بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ ”بابا مبارک ہو تیرا پوتا ہوا ہے۔“

”بابا اللہ تیرا شکر ہے تو نے میرے کھہ رکھ لیے۔“

بھاگی نے بھی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور چپک کر بولی۔ ”کینز وہی ہے؟“

”نیکم ہے لٹاں۔“

صغیر بولی۔

”ارے بیٹے کی ماں ہے۔ شیر کی ماں ہے۔ ٹھیک کیے نہیں ہوگی۔“

امیر و ہنس کر بولا۔ ”ذرا سو رہے ہو۔ دو۔ سارے گاؤں میں فقارہ بھجواؤں گا۔ حلوایں کو کھر بٹھا کر منضائی لگاؤں گا اپنے سامنے۔“

بابا امیر و پیش جذبات میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیوں پاگل ہو رہا ہے۔ اتنی بیٹیاں کے بعد اللہ نے جٹا دیا ہے۔ خوشی مت کر ورنہ لوگوں کی نظر لگ جائے گی۔“ بھاگی بولی۔

صغیر ادا سوچی اور گولے کر حلوہ بنانے باہر چولہے پر جا بیٹھی۔ اندر سے بچے کے رونے کی آواز رہ رہ کر بلند ہو رہی تھی۔ منیر ابھی اپنی کھڑکی سے اٹھ کر ماں باپ کے پاس آ بیٹھا تھا۔ ماں باپ اس کا ہاتھ چوم کر دعا میں دبے رہے تھے۔ بڑے انتظار کے بعد سونے آنگن میں بچوں کھلا تھا۔ اندھیری راتوں میں آجالا کرنے کے لیے چاند آنگن میں اتر آیا تھا۔

اس نے سوچا۔ بچے کی خوشی کیا کرنی ہے، انہی پیوں سے کینز کو بالیاں بناؤں گا۔ پھیاری نے چار بیٹیوں کے بعد بالآخر پھر اسی پل صراط سے گزر کر اس کی زندگی میں خوشیاں بھردی ہیں۔

آخری دنوں میں کتنی پہلی ہو رہی تھی وہ۔ ذرا سا کام کرتی تو پانی لگتی۔ لٹاں بھی تو بات بات پر اسے طعنے دیتی تھی۔ باڈی روٹی لٹاں کو کرنی پڑتی تو وہ جھلا کر کہتی۔

”اتنی جلد پھر یہ تراشا لگانے کی ضرورت کیا تھی؟ نہت میں سانس نہیں ہے، بیٹا پیدا کرنے کا بہت شوق ہے۔“

”پھر بیٹی جسے کی..... ذرا سامی تو فرق نہیں ہے طبعیت میں۔ میرے بیٹے کی تو قسمت یہی خراب ہے۔“

کینز و لٹاں کی باتیں سن کر آنکھوں میں آنسو بھر

لائی۔ مگر لٹاں کی زبان کون بند کر سکتا تھا۔

سوچنے بپ نے رنگ لگ دیے تھے۔ کینز و کا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو رہا تھا مگر وہ بستر پر ایک ملکہ کی شان سے لیٹی تھی۔ کثیف بستر میں اس کا دھو پھول کی طرح پکا ہاتھ تھا اور پھرے پر روشنی بھونٹ رہی تھیں۔ وہ بڑی رخصت سے آئے اور شکر کا حلوہ کھا رہی تھی۔

صبح ہوتے ہی سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ چھوٹا ملک اور بڑی ملکائی خود مبارکباد دینے نمبر سے کھر چلے آئے۔ منضائی کی نوکری اور بچے کے کپڑے چھوٹی ملکائی لے کر آئی۔ منیر کے کھر میں خوشیوں کی بارات اتر آتی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تیتھا رہا تھا۔

”تو نے آخری دنوں میں بڑے ملک جی کی بڑی خدمت کی تھی نمبر سے۔ تجھے بڑی دعائیں دیتے تھے وہ۔“

”بس جی اللہ ایمان دے بڑے ملک جی مجھے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے وہ۔“

”تیری کوئی میں آخری سانس لیے تھے انہوں نے۔“

بڑی ملکائی کہہ رہی تھیں۔

”جب امیر و اس گاؤں میں آیا تو میرے کی مسیں ابھی بھیک رہی تھیں۔ بیٹیاں سے اس کی برات چڑھی اور کینز و بیا کر آئی۔“

”بس جی۔ مجھے آج بھی وہ بھٹنے والے چودھری صاحب غلامے ہیں۔ پر میں اب وہاں جا کر کیا کروں گا جی..... انہی پھروں میں آخری نیند سلا دے اللہ۔“

امیر و کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

امیر و کھلا ملک صاحب کے احسانات کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ بھٹنے کے بالکل کو قرضہ ادا بڑھ گیا تھا کہ امیر و منضائی کی سات نسلیں بھی یہ قرضہ نہیں ادا کر سکتی تھیں۔

چودھری صاحب جانوروں کی طرح کام لینے اور سننے کی طرح ذلیل کرتے تھے۔ منیر شہر میں بڑی لگتا تھا۔ بیٹیاں اس کی ملکوں سے راہ ورم ہو گئی اور انہوں نے اسے

شیخ سعدی کے خوبصورت اقوال

شیخ سعدی کا اصل نام شرف الدین بن مسلم الدین عبداللہ تھا۔ آپ شیراز، ایران میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سال پیدائش ۱۱۸۳ء اور وفات ۱۲۹۱ء ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بہت سے ملکوں کا سفر کیا اور ایران بہت سی کتابیں بھی تحریر کیں۔ ان میں گلستان سعدی اور بوستان سعدی مشہور اور مقبول ہیں۔ آپ نے کسی نے بچوں کی تربیت کے متعلق سوال کیا۔ شیخ سعدی نے جو بیٹے کے وہ چاندی کے پانی سے سونے کی تختی کو پلکنے کے قابل ہیں۔ آپ نے فرمایا:

☆ جس بچے کی عمر ۱۰ سال سے زیادہ ہو جائے، اسے نامحروں اور امیروں، غیروں میں نہ بیٹھنے دو۔

☆ اگر تو چاہتا ہے کہ تیرا نام باقی رہے تو اولاد کو اچھے اخلاق کی تعلیم دے۔

☆ اگر تجھے بچے سے محبت ہے تو اس سے زیادہ لاڈ دینا نہ کر۔

☆ بچے کو استاد کا ادب سکھاؤ اور استاد کی سختی سے بے کی عادت ڈالو۔

☆ بچے کی تمام ضروریات خود پوری کرو اور اسے اسی عمدہ طریقے سے رکھو کہ وہ دوسروں کی طرف نہ دیکھے۔

☆ شروع شروع میں بڑھاتے وقت بچے کی تعریف اور شاباش سے اس کی حوصلہ افزائی کرو۔ جب وہ اس طرف راغب ہو جائے تو اسے اچھے اور برے کی تیز سکھانے کی کوشش کرو اور ضرورت پڑے تو توبی بھی کرو۔

☆ بچے کو دستکاری یعنی ہنر سکھاؤ۔ اگر وہ ہنرمند ہوگا تو برے دنوں میں بھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے گا جسے اسے ہنر سے کام لے گا۔

☆ بچوں پر کڑی نظر رکھو تا کہ وہ بڑوں کی صحبت میں نہ بیٹھیں۔ (خلی اعجاز لٹاری، لبنان)

اپنی زمینوں پر لا کر بٹھا دیا۔ چوہدریوں کا قرضہ ملک صاحب نے اپنی جیب سے ادا کر دیا۔ تب سے امیر و ملوک کے پاس تھا۔

ملک صاحب نے نئی کوٹھی بنائی تھی۔ پرانی آبائی حویلی کے نچلے احاطے میں امیر و اپنے خاندان سمیت بٹھا تھا۔ چچا پانچ لاکھ پڑیاں تھیں۔ کیا محنت تھا۔ احاطے میں سبزیاں اور بکریوں کے چارے کے لیے پتھوں کا انتظام آسانی ہو جاتا تھا۔ محنت میں بکریاں بندھی رہتیں۔ منیرا ملک صاحب کی بیٹیسیں سنبھالتی تھیں۔ دودھ دوہتا تھا اور تندو دھکانے کے لیے لکڑیاں کاٹ لاتا تھا۔ ملک صاحب نفقہ خواہ تو خیر و ابائی سی دیتے تھے۔ منیرے کو اور سو کپڑے تھیں۔ بکریوں کے بچے پال کر فروخت کرنا ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ اوپر کا سارا خرچ نکل آتا تھا۔ سال کے دانے اور روز کا ہمیشہ کا تازہ دودھ ملک صاحب کے گھر سے مل جاتا تھا۔ دوائی علاج کا خرچہ پڑ جاتا تو ملک صاحب فراخ دلی سے مدد کر دیا کرتے تھے۔ زندگی بڑی سہولت سے گزر رہی تھی۔ انکے بیٹے کی کمی تھی، وہ بھی اللہ نے پوری کر دی۔ منیرا خوشی سے چھوٹا نہیں سارا ہوا تھا۔ امیر و اور بھانجے کے بھائیوں بھرے چروں پر بھی مشغول سی تھر تھرا رہی تھیں۔

”اللہ نے منیرے کی لاج رکھ لی ملک جی۔“ بابا امیر و کی آواز خوشی سے گزر رہی تھی۔

نظر اور جلاؤ ٹوٹنے کے ڈر سے بابا امیر و نے گاؤں والوں سے کوئی مبارکبادیں وصول کر لیں لیکن کسی کو مٹھانی کی ذلی تک نہ ملائی اور نہ سی سے بچنے کے لیے کپڑے یا پیسے قبول کیے۔ بابا امیر و کی بیٹیاں بڑے چچا سے بچنے کے لیے اور بھانجے کے لیے کپڑے بنا کر لائی تھیں، انہیں پیسے دے کر رخصت کیا مگر کا کے کو کسی کے لئے ہونے پڑے تن سے نہیں لگائے دیے۔

بچہ بڑا خوبصورت اور صحت مند تھا۔ بچپن سے نکلا تو مزید گورا اور صحت مند ہو گیا۔ سارا دن امیر و اور بھانجے اُسے اٹھائے بکھرتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کا بکریں بھر جاکر ہو

گیا۔ مزید تین چار ماہ گزرے تو چلنے لگا۔

ماں باپ اور بہنوں کا تو لاڈ لڑا تھا ہی۔ بابا امیر و اور بھانجے کو اُسے دیکھ کر دیکھ کر جیتے تھے۔ چچا ملک، ملکائی اور بڑی بھانجی منیرے کے بیٹے کو بہت پیار کرتے تھے۔ منیرا وہی جب اب بڑی مزرور اور مطمئن سی رہنے لگتی تھی۔ منیرا جب بھی کام سے تھک باکر آتا، کا کے کو لپک کر اٹھا لیتا۔ اُس کی معصوم اور نونی چھوٹی باتیں اُس کی ساری محنتیں زور کر دیتیں۔

”بڑا ہو جائے گا تو میں بھی باپ کی طرح چار پائی پر بیٹھ کر چلم پیلا کروں گا۔ خود ہی ماں بہنوں کو سنبھالے گا۔“ وہ ہنس کر کہتا۔

”اں بھوں کو سنبھالے گا یا اپنی دوشنی کے ناز اٹھائے گا؟“ کینزو بڑے ناز سے کہتی۔

”بوشنی کی کوئی لا کر دینا میرے بیٹے کے لیے، اپنی جیسی کافی کوئی نہ لے آتا۔“ منیرا اچھیڑتا۔

”میرے جیسی نہیں ملے گی تیرے بیٹے کو، چراغ لے کر بھی دھونڈے گا تو نہیں ملے گی۔“ کینزو ہنستی۔

”ارے لوگ لوگ رُکروں میں ڈال کر رشتے لائیں گے میرے بیٹے کے لیے۔“ منیرا غرور سے کہتا۔ کتنے ہی بہت سے خواب تھے جو اُس نے بنے کے وجود سے وابستہ تھے۔ ایک شاندار نوکری، اچھا سا گھر، خوبصورت بیوی، آہنگ میں کھیتے ہوئے معصوم بچہ زندگی کی حقیقی خوشیاں تو یہی ہیں!

کینزو سوچتی۔ منیرے کی ساری عمر تو ایشیں تھوہنے میں گزرتی۔ مگر وہ اپنے بیٹے کی شہری جوانی کو یوں زلنے نہیں دے گی۔ منیرا کا گندمی رنگ دھوپ میں چمک رہا ہے کی طرح ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ دن رات کام کر کے آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑ گئے تھے۔ سکول میں پڑھے گا تو چلوچم کر اہم یاتو تو مزدوری کرنے سے بچ جائے گا۔ آرام سے دفتر میں بیٹھ کر کام کرے گا۔ دفتر کے باہر چچا سی ہو گا اور بابا ڈرامیوار کار لے کر کھڑا ہو گا۔ جوانی مزدوری میں غارت ہو گی۔

لوہا بے میں بیٹے کا عروج دیکھیں گے تو ہم بھی زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔

کینزو سوچ سوچ کر خودی مسکرائے جاتی۔ کھوہ پر پانی بھرنے جاتی تو عورتیں اُسے بھوکے دے دے کر پوچھتیں۔ ”بی کینزو تو دن بدن گھرتی آ رہی ہے۔“

کینزو ہنس دیتی۔ کا کا چلنے لگا تو کینزو کے پیچھے پھر بھاری ہو گئے۔

”اللہ بیٹوں کی جوڑی بنائے۔“ بھانجہ دعا میں دیتی۔

بابا امیر و کا کے کو کاندھے پر اٹھائے پھرتا۔

”کا کا تیرا بھائی آئے گا۔ بول تیری لتاں کے کوٹھے پر چڑیا بے یا کو!“

بانڈی بھونٹے بھونٹے کینزو شرماتی جاتی۔ بابا امیر و تو پوتے کے پیچھے پاگل ہو گیا ہے۔ بات کرنے کی عقل نہیں ہے۔ بہو کے سامنے کسی عیسیٰ باتیں کہہ جاتا ہے۔

”ارے مجھے حیر کی دعا ہے۔ سات پوتوں کا منہ حلاؤں گا۔“ بابا امیر و فخر پر کہتا۔

”اللہ اسی ایک کو نیک بنا دے۔ سات پوتوں جیسا ایک ہی بہت ہے۔“

بھانجی کو بات اُسے ٹوک دیتی۔ اُسے امیر و کی برہمیں مارنے کی غارت سے بہت خوف آتا تھا۔ انہی دنوں ملک صاحب نے اپنی بیٹی کی سالگرہ کی۔ سارے رشتے دار مدعو کیے گئے۔ کوٹھی پر چراغاں کیا گیا۔ بیٹی نے تالیوں اور گانوں کی گونج میں ایک کاٹا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ ایک کے ساتھ پڑی ہوئی میز پتھوں سے لد گئی۔ ہر طرف رنگوں اور روشنیوں کا طوفان سا آئندہ آیا تھا۔ کینزو کو ملکائی نے گھر میں کام کاج کے لیے بلایا تھا۔

سالگرہ کی روشنیوں بھری تقریب دیکھ کر کینزو کے دل میں آرزو کی کوئیل بھونکی۔ اُس نے پچھا ارادہ کر لیا کہ وہ کا کے کی دوسری سالگرہ اسی طرح دھوم دھام سے کرے گی۔ خواہ اُسے اس کے لیے قرضہ لینا پڑے یا اپنی سونے کی بابیاں بیچی پڑیں۔ آخر اس کا بیٹا چھوٹا تو اتلا ڈالا ہے۔

خدمت کا معاوضہ

ایک مرتبہ بغداد کے ایک مکان میں آگ لگ گئی اور ۲۰ بچے اندر چس کر رہ گئے۔ مالک مکان نے امداد کے لیے بڑا شور مچایا مگر ایک گھنٹہ کے بعد ۲۰ بچہ دینار انعام کا بھی اعلان کیا لیکن کسی شخص کو آگ میں کودنے کی ہمت نہ پڑی۔

اتفاقاً وہاں حضرت ابوالحسن نورانی آئے۔ اُس شخص کا اضطراب دیکھا تو آگ سے گزر کر اندر گئے اور بچوں کو صحیح و سالم باہر لے آئے۔ اُس شخص نے آپ کا شکر ادا کرنے کے بعد ۲۰ ہزار دینار پیش کیے تو آپ نے نہ لیے۔ اس نے پوچھا کہ کوئی اور ہوتا تو اس آگ میں ہم ہو جاتا لیکن آپ صحیح و سالم باہر آ گئے ہیں۔ یہ مقام آپ نے کیسے پایا؟

آپ نے فرمایا ”خدمت کا معاوضہ نہ لینے ہے۔“ (فرحان سلیم، لبنان)

اللہ نے اتنی منتوں مُرادوں کے بعد دیا ہے۔ یہ ارادہ کر کے اُس نے اپنے آپ کو مجھے تسلی دے لی اور مطمئن سی کام کرتی رہی۔ کا کا منیرے کے پاس تھا۔ وہ سالگرہ سے واپس آئی تو وہ منیرے کے ساتھ سویا پڑا تھا۔ اُس نے سونے ہوئے بچے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ بچے کے گال پر اُس کے دو آنسو ٹپکے۔ بچہ چند منٹ کسمایا اور چکر گھری نیند سو گیا۔

منیرا ابھی اتنی کھری نیند سو ہوا تھا کہ اب کبھی بیدار نہیں ہوگا۔ ساتھ والی کوٹھڑی سے بابا امیر و کے خراٹوں کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

امیر و خافشخاں کا مریض تھا۔ اُسے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اُس کا دل بڑھ گیا ہے۔ ذرا سولنے سے ہانپنے لگا۔ بھانجہ بھی دیکھنے میں تو صحت مند لگتی لیکن ساری سر دیاں اُسے دے دے کے ڈورے پڑتے تھے۔

منیرا سارا دن ملکوں کی بیٹھنوں کا کام کرتا، اُن کے

نقے دھرتا۔ ہوئی کے سو کام بناتا، تب کہیں سارے گھر کا پیٹ بھرتا تھا۔ اس کے باوجود ہر وقت ملکوں کا ڈنڈا اُن کے سر پر تھا۔ وقت بے وقت کینزو کو بھی خدمت کے لیے طلب کر لیتے۔

کینزو کو کھڑی میں بھی چارپائی پر ایک طرف لیٹ گئی۔ پونی خواب بٹتے بٹتے بجائے کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اب اُس کی زندگی کا محور کا کے کی دوسری سالگرہ تھی جو تیزی سے قریب آرہی تھی۔ اُس نے گاؤں کی عورتوں کے ساتھ بل کر کھیتی ڈال لی تھی۔ باتوں باتوں میں وہ چودھری صاحب کی بیوے سے لڑ چکی تھی۔ ہزار بارہ سو روپے کے خرچے سے کام چل جائے گا۔ بس کیا، سو سے اور مٹھائی ہی تو تھیں ہوگی۔ ہاں کا کے کے لیے ایک اچھا ساٹھ ہونا ضروری ہے جسے پانچ کروہ لیک کاٹے گا۔ ایک کاٹنے ہوئے تصویر بھی تو اتاری جائے گی۔ وہ خود بھی تو کوئی اچھا سا جوڑا بوائے کی، آخر بیٹے کی ماں ہے۔ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ منیر سے لے کے پونکی کا گرت اور لہروں کے بہاؤ پر بس کا بس چلتا ہے!

بیٹا اُس کی کائنات تھا۔ اُس کی خوشی کی خاطر تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی خواہشیں بھی تو پوری نہیں ہوتی تھیں۔

جب بھی بچے جمع کرتی، امیر و بھاگو بھار پڑ جاتے اُس کی اپنی زندگی کا خرچہ سر پر آن پڑتا اور پھر زندگی اُسی ذکر و براہیں آجاتی۔ امیر و سودا کا روٹی تھا۔ اب تو بھگو کو بھی اکثر رنگ برنگے مسئلے درپیش رہتے۔

اُس نے سوچا تھا کہ زندگی سے فارغ ہو کر وہ خاندانی منصوبہ بندی والوں کے دفتر چلی جائے گی۔ اب اور اولاد کیا کرنی تھی۔ یہاں کون سے مرتبے اور جائیدادیں تھیں جن کے لیے وارث چاہیے تھا۔ میٹھا میوہ اللہ نے دیے دیا تھا۔ امیر و بھگو کو دوسرے پوتے کی آس لگنے بیٹھے تھے مگر اللہ نے بیٹی دی تھی۔

کینزو دمر کر پڑی۔ کیس خاصا بڑھ گیا تھا۔ ہسپتال لے کر چارپانے بھلا ہو ملکوں کی بھوکا بھورا چھوٹے شلک جی

جائے پانی اور دوا دارو کا خرچہ چل جاتا تھا۔ بھاگو کے دو چار جوڑے بن جاتے۔ بڑھا بڑھی موم کرتے بلکہ گھر میں بھی کچھ نہ کچھ لا دیتے۔ اکثر امیر و پوتوں کے لیے مٹھائی یا بناٹھے لے آتا یا گھر میں خود سامان لا کر گوشت اور زردہ بکواتا۔

جب سے امیر و زیادہ بیمار بنے لگا تھا، اب نوکری کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ نہ صرف آمدن کا ذریعہ نہیں رہا تھا بلکہ دوا دارو کا خرچہ بھی بڑھ گیا۔ اور اب سب کچھ منیر سے کے سر پر تھا۔ امیر و نے تو ساری زندگی آنکھیں بچا کر نہیں رکھا تھا اور اب میل منیر سے کے سر پر تھا۔ امیر و کی بیٹیاں آئیں تو انہیں بھی کچھ نہ کچھ دینا دلانا پڑتا۔ ان حالات میں اُس کے خوابوں کی کے ٹکڑی۔ بس زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ دگر دلوں میں خواہشوں کی کوئیلں بھونے لگیں تو دل کا چنن خود بخود مچلنے لگتا ہے۔ بھلا خوشیہ اور چاندنی کو بھیلنے سے کون روک سکتا ہے۔ بھی کسی نے جتنے کو بچھونے سے بھی روک دیا اور لہروں کے بہاؤ پر بس کا بس چلتا ہے!

بیٹا اُس کی کائنات تھا۔ اُس کی خوشی کی خاطر تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی خواہشیں بھی تو پوری نہیں ہوتی تھیں۔

جب بھی بچے جمع کرتی، امیر و بھاگو بھار پڑ جاتے اُس کی اپنی زندگی کا خرچہ سر پر آن پڑتا اور پھر زندگی اُسی ذکر و براہیں آجاتی۔ امیر و سودا کا روٹی تھا۔ اب تو بھگو کو بھی اکثر رنگ برنگے مسئلے درپیش رہتے۔

اُس نے سوچا تھا کہ زندگی سے فارغ ہو کر وہ خاندانی منصوبہ بندی والوں کے دفتر چلی جائے گی۔ اب اور اولاد کیا کرنی تھی۔ یہاں کون سے مرتبے اور جائیدادیں تھیں جن کے لیے وارث چاہیے تھا۔ میٹھا میوہ اللہ نے دیے دیا تھا۔ امیر و بھگو کو دوسرے پوتے کی آس لگنے بیٹھے تھے مگر اللہ نے بیٹی دی تھی۔

کینزو دمر کر پڑی۔ کیس خاصا بڑھ گیا تھا۔ ہسپتال لے کر چارپانے بھلا ہو ملکوں کی بھوکا بھورا چھوٹے شلک جی

کہہ کر گاڑی لٹکائی اور اسے ہسپتال پہنچا دیا وہ یونہی اہل کار لڑکر مر جاتی۔

کینزو تو بچ کی عمر کیس کے دوران ایسا نقص پڑ گیا کہ اب کینزو مزید بچنے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کینزو تو بچ کے لے کر گھر آئی تو امیر و دھوپ میں کھاٹ والے بیٹھا تھا بی رہا تھا۔ آہ بھر کر با آواز بلند بولے۔ ”اللہ سے آس جی کہ جوڑی ملا دے گا۔ منیر! خود بھی ”اکھا“ تھا ”ہو“ بھی ”اکھا“ ہی رہ گیا۔

بھگو غصے سے بول اُٹھی۔

”چپ کر امیر و! شکر کر اللہ نے بیٹا تو دیا ہے۔ تیری لہان تو بھی بندھیں ہوگی۔“

اب کا کا پہلے سے بھی بڑھ کر لاؤ تھا۔ پھیلے تو بھی بھار و شرارتیں کرنے پر ذرا ت دیتی مگر اب وہ وہ اُس کی شرارتیں کرنے پر بھی ”ماں صدق“ کہہ اُٹھتی۔

منیر! جب رات کو کھٹک ہار کھاٹ پر لیٹتا، تو سونے سے پہلے جہان بھر کی باتیں کینزو سے کرتا۔ کینزو کے پاس روایتی کھونٹوں والی شکایتوں کے علاوہ اور کیا رکھا تھا! بھاگو آسے جینے نہیں دیتی تھی۔ اور بس نہ چلتا تو پتھروں سے بھانے بنا کر لڑتی اور ذرا سی بات پر ایسا فساد پھانچتی کہ جان بچانی مشکل ہو جاتی۔ منیر! ماں کی خصلتوں کو کو جانتا تھا مگر سب روایت الزام بیوی پر دھرتا اور ماں کو ہر الزام سے بری اللہ مقرر دیتا۔

ماں کی شکایت سن کر اُس کا مزاج جگڑ جاتا۔ کینزو بات بدل کر نورا کا کے کی فنی فنی باتوں کا ذکر چھیڑ دیتی۔

”بڑا ہوشیار ہے۔۔۔۔۔ بڑا ہو کر تحصیل دار بنے گا۔۔۔۔۔ ابھی سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔“

”رہنے دے تحصیل داری کو میں اپنے کا کے کو فوج میں بھجواؤں گا۔۔۔۔۔ اپنے ملک صاحب کا جوانی بڑا سوھتا جوان ہے۔ بھی کبھی وردی پنچن کر بیوی کو لینے آتا ہے۔ وردی بڑی شاندار لڑتی ہے اُس پر۔“

منیر! بڑے غرور سے کہتا۔ ”کا کے کا بڈ کاٹھ اچھا لگتا

عزت

ایک مرتبہ مرزا غالب سے کسی نے پوچھا:

”مرزا غالب! یہ بچھو سر دی کیوں نہیں

تکے؟“

مرزا غالب بولے:

”گر میوں میں ان کی خاک عزت ہوتی

ہے جو وہ سر دیوں میں بھی نکل آئیں۔“

(عبدالمسیح، لاہور)

ہے قد بھی اچھا ہوگا۔۔۔۔۔“

کینزو بھس کر کہتی۔ ”کا کے سے کہوں گی تجھے اپنا اردو بنالے۔ آئے گئے کیلوٹ مارا کرے گا۔۔۔۔۔“

کینزو خوشی سے ہنسی۔ ”پاگل ہے تو بھی۔ بھلا

افروں کے باپ بھی کبھی اردو جتنے ہیں۔ ارے اُن کے آگے تو چار چار ٹوکراؤں کے دروازے کھولتے ہیں۔“

”کا کے کو اپنی بیگم کو لے کر شہر میں رہنے دیں گے

منیر سے۔ ہم اپنی اوقات میں رہیں گے اپنے گاؤں میں

رہیں گے۔“ کینزو بڑی سمجھ داری سے کہتی۔

منیر! کہتا۔ ”کوئی ابھی سی لڑی ہو سکتا۔۔۔۔۔ اپنے

جیسی کالی کلونی۔۔۔۔۔ جھلکی سے نہ لے آتا۔ میرے بیٹے کے

لیے۔۔۔۔۔“

کینزو تھلا ”حق“۔ ”اُونہ میں کیا کالی کلونی ہوں۔

تجھ سے تو رنگ زیادہ گورا ہے میرا۔“

انہیں چھلوں اور خوشیوں میں نیند کی دیوی انہیں اپنی آغوش میں لے لی۔

اگلی شام منیر! بیٹوں کا دودھ دھو کر گھر لوٹا تو بڑے غصے میں تھا۔ کا کا بھی باپ کی انگلی پکڑ کر ساتھ کیا

تھا۔ کا کے کپڑوں پر مٹی لگی ہوئی تھی اور آنکھوں میں
 نرمہ پھیلا ہوا تھا۔
 ”کیا ہوا کسی نے مارا ہے؟“
 کینیزو نے فوراً بیٹے کو کھینچ کر گودی میں بٹھالیا اور اس
 کا منہ چونے لگی۔ ”میرا ہفتے سے بولا۔
 ”تجھے منع بھی کیا ہے، اسے جو بلی کی طرف نہ جانے
 دیا کر۔“ ملکوں کی پوتی بڑی شیطان ہے۔ کوئی اس کے
 گھلوں کو ہاتھ بھی لگا دے تو مارنے کو دوڑتی ہے۔“
 کینیزو برہم ہو گئی۔ ”لو بھلا میرے بیٹے کو گھلوں کی
 کیا بھوک ہے۔ ذرا بیٹنی نکل آئے میری ایسے ایسے بڑھیا
 مٹھو نے لاؤں گی شہر سے جو ملکوں کی پوتی نے بھی نہیں
 دیکھے ہوں گے۔“
 ”میرے خزا۔“ چھوٹے ملک جی دیکھ رہے تھے مگر بچی
 کو کسی نے ڈانٹا تک نہیں۔“
 کینیزو بولی۔ ”میں غور ہے تاکہ نوکر کا بچہ ہے، جو
 چاہے کہہ لیں۔“

”میرے کرج کر بولا۔“ کیا بک رہی ہے۔ نوکر میں
 ہوں۔ میرا بیٹا تو نوکر نہیں ہے نا۔! کسی کی کیا جرات
 اسے مارنے کی!“

امیرو ہفتے کی لٹے منہ سے پرے کرتے ہوئے
 بولا۔ ”مالکوں کی ہر بات نہیں چکڑتے میرے۔ ہم
 میں سال سے ان کا نمک کھا رہے ہیں۔“ بھا کو بولی۔
 ”تجھے سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں کینیزو۔ پھول
 کچڑ میں بھلا ہو یا سہرے میں گندھا ہو، پھول ہی ہوتا
 ہے۔“

ماں باپ کے سرزنش کرنے پر منیرا وقتی طور پر تو
 خاموش ہو گیا لیکن اس کے دل میں پھانسی سی جھنجھ
 تھی۔ بچہ بونٹی کیلئے کیلئے ملکوں کے گھر چلا جاتا اور ان
 کی پوتی کے کھیلے لٹا، اگر بھیجے تھے آپس میں لڑ پڑتے تو
 منیرا منہ جھکا لیتا۔ اس کی نظر ہر وقت اپنے بیٹے میں گئی
 رہتی۔ ملکوں کا سارا خاندان بچے سے بہت پیار کرتا تھا۔
 بچی بھی بڑا لاڈلا اور فقرا تھا، ذرا راسی بات پر چل اٹھتا،

زمین پر لیٹ جاتا، گھلوں کے لیے جندیں کرتا۔ اگر
 سب لوگ منیرے کے بیٹے کا بہت لحاظ کرتے تھے اور کوئی
 اسے روکتا تو اس کا تھپا، پھر بھی کسی کوئی شرارت کرنے
 بلکی سی سرزنش کر دیتا تو منیرا ہفتے سے تھلا اٹھتا۔ گھر
 کھٹھوں پر بیٹا رکتا۔
 ”بس اب یہاں گزارا نہیں ہوتا۔ برتن بھانڈا اٹھا
 ہی پڑے گا۔۔۔ کوئی غلام نہیں ہوں ملکوں کا! میرے
 بیٹے نے کیا ان کی نوکری کرنی ہے؟“ بابا امیرو کہتا۔
 ”ارے بیٹے جا کر کی کا کیا مہنا (طعنہ) ہے۔ تیرے
 باپ دادا نے نوکری کی۔ حلال کی روزی کھائی، تیرا بیٹا
 نوکری کرے گا تو کیا ظلم ہو جائے گا؟“
 کینیزو برہم ہو کر بھتی۔ ”بابا کیوں بد ذعا دیتا ہے
 میرے بیٹے کو۔ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر افسر بنے گا۔ ملکوں کی
 غلامی نہیں کرے گا۔“

بابا امیرو کہتا۔ ”اللہ تیری آس پوری کرے پر مقرر
 کس نے دیکھے ہیں۔ ایسے بڑے بول نہ بولا کر۔ ملک
 ہمارے ماں باپ ہیں۔ بڑے احسان ہیں ان کے
 ہمارے اور۔“
 کینیزو تھلا کر کہتی۔

”بابا تو اور منیرا زندگی بھر سے ان احسانوں کا بدلہ
 اتار رہے ہو۔۔۔ میرے بیٹے کی جان تو بخشو۔“
 بابا امیرو کہتا۔ ”اللہ میرے پوتے کو رنگ لگائے
 گڑھے۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ مالکوں کی
 عزت ہمارے اوپر قرض ہے۔“

منیرا آغزا۔ ”بہت عزت کر لی ہے بابا۔ اب مجھے
 اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ اگر
 وہ اس ماحول میں پلے گا تو کل وہ بھی ملکوں کی جینوں کو
 چارہ ڈالتا ڈالتا ڈھا ہوا جائے گا۔“

امیرو کہتا۔ ”نمک حرام مت بن منیر، چھوٹے ملک
 خود کہتے ہیں کہ منیرے کے بیٹے کو میں خود سکول میں
 پڑھاؤں گا۔ بڑی ملکائی کہہ رہی تھیں کہ اس بچے کی
 پڑھائی کا خرچہ ہم خود دیں گے۔“

منیرا تلخ لہجے میں کہتا۔ ”ارے بابا۔۔۔ یہ بڑے لوگ
 ہمارا خیال کرتے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہیں ہم بونٹی
 لال رہیں تاکہ وہ بونٹی سدا ہمیں اپنے بیٹوں سے چلتے
 رہیں۔“
 کینیزو ہزار گھٹی۔

”غریب چار حرف پڑھ جائیں گے تو ان کی جینوں
 چارہ وہ ڈالے گا۔۔۔!“
 بابا امیرو خنڈا سانس بھر کر کہتا۔ ”اللہ تعالیٰ نے ہر
 انسان کی روزی کے سلسلے خود بنائے ہیں بیٹا۔ ہماری
 روزی اگر ان کی جا کر کی میں لکھ دی گئی ہے تو یہ ہمارا مقدر
 ہے۔ ان بیٹاروں کا کیا تصور ہے!“

”منیرا کہتا۔ ”ہم پڑھ لکھ کر اپنا مقدر بدل دیں گے بابا۔“
 منیرا اعزم سے کہتا۔ ”مقرر صرف اللہ کے حکم سے
 ملے گا۔۔۔ اللہ سے بچنے کے لیے ذعا کیا کر۔۔۔ بس
 صرف اتنا ہی اختیار ہے تجھے۔“

کا کے کی دوسری سالگرہ قریب آرہی تھی۔ کافی پیسے
 جمع ہو گئے تھے۔ کینیزو اپنے سالگرہ کے منصوبے کو عملی جامہ
 پہنانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ جب بھی اس کے پاس
 پیسے جمع ہو جاتے، ضرور کوئی بیماری یا مصیبت نازل ہوتی۔
 چھوٹے ملک صاحب نے کہیں آؤٹی آؤٹی باتیں
 ان کی کہیں کسمیرا ان کے خلاف باتیں کرتا ہے اور نوکری
 پھوڑنے کی فکر میں ہے۔

انہوں نے پیش میں آکر کہا۔ ”مصلیٰ کے سر کو
 دیاں چڑھ گئی ہیں۔“

ان کا پڑا ملازم بابا امیرو کے پاس یہ پیغام لے کر
 آیا کہ اس سال بارش بروتھ ہو جانے سے فصل بہت
 اچھی ہوئی ہے اور ملک صاحب منیر کو وہ بوری کندم فالتو
 اسے دیں گے۔

لوگوں نے ادھر ادھر سے پوچھنا شروع کر دیا۔
 ”منیر شتا ہے تو گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہے؟“
 ”اگر مال ڈنگر بیٹا ہو تو سودا کر وادیں؟“
 ”منیر تیری بیوی کہہ رہی تھی۔۔۔ تم کوگ جلد چلے

مصیبت پر شرک

ابن عربی (۱۲۱۰ء) سے کسی نے پوچھا کہ
 مصیبت میں کیا کرنا چاہیے؟
 فرمایا ”جب مجھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو
 ۴ مرتبہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔“
 ”اول اس بات پر کہ مصیبت اس سے بڑی
 ہو سکتی تھی۔“

دوم برداشت کرنے کی ہمت دی۔
 سوم دعا و عبادت کا حقوق پڑھ گیا۔
 چہارم مصیبت جسمانی تھی دینی نہ تھی۔
 (امیر منصور، کراچی)

جاوے۔

منیر کوئی جواب نہ دیتا البتہ بابا امیرو لوگوں کے گلے
 پڑ جاتا۔ ”۱۸ سال بعد کیا ظلم ہو گیا جو ہم شی چھوڑ کر چلے
 جائیں۔ تم لوگوں کی آخر کیا صلاح ہے؟“

منیر سے کہتا۔ ”جگہ جگہ بیٹھ کر زبان نہ چلایا کر۔ اگر
 ملکوں سے ملنا پڑے تو کیا منہ لے کر برداری میں جانے گا۔“
 منیر اٹھلا کر کہتا۔ ”اچھا بیٹو میری راضی ہے۔۔۔ میں
 کب جا رہا ہوں بھلا!“

خوں جوں کا کے کی سالگرہ کے دن قریب آرہے
 تھے۔ اس کی طبیعت بے چین ہو رہی تھی اور خواس پر عجیب
 سی گھبراہٹ طاری تھی۔ جب بھی اس کی لمبھی نکلتی تھی، بابا
 امیرو یا بھانڈا پیار پڑ جاتے۔ ”اللہ خیر کرے!“ کچھ سوچ
 کر اس کا دل دھڑک اٹھتا۔

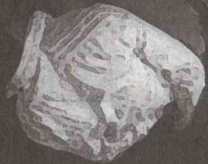
اس مرتبہ بھی اس کے منہ سے صحیح ثابت ہوئے۔ گھر
 پر بیماری کی مصیبت آن پڑی مگر اس مرتبہ وجوہ منیرا
 اس قہر کی لپیٹ میں آ گیا۔ منیر کی کمر میں درد تو کافی
 عرصے سے رہتا تھا مگر اب رفتہ رفتہ یہ درد اور بچھاؤ ناگوں
 کو متاثر کرنے لگا تھا۔ پہلے اسے ناگوں میں کمزوری محسوس
 ہوتی اور ہفتے دس دن میں یہ صورت حال ہوئی کہ سہارے

قانون کے ایک رکھوالے کا ماجرا

بہرہ

جو بینائی رکھتے ہوئے بھی
مجرم کو پہچاننے میں ناکام رہا

جیک بری
انجمن رفق و صالحی



کے بغیر اس سے دو قدم بھی چلائیں جاتا تھا۔
پہلے پہل کو ماش کا حربہ آزمایا گیا۔ امیرو خود حکیموں
کے پاس جا کر طرح طرح کے تیل لاتا اور اس کی مالش
کرتا۔ مگر چنداں فرق نہ پڑا، پھر بات تعویذ دھاگوں پر
پہنچ گئی۔ علاقے کے ہر حیر فقیر کے پاس امیرو خود
ہانتا کا ہنپا پہنچا، تعویذ گھول کر پلائے گئے۔ دم درد کیے
گئے، ہماڑ پھونکے۔ غرض ہر حربہ آزمایا مگر نمیر کی
ناگلیں برف کی سل کی طرح اور بے جان ہوئی تھیں۔
نوجوں دن گزرتے جا رہے تھے، نمیر کا چہرہ
مر جھاتا جا رہا تھا۔ کینزو بھی سمجھ کر رہ گئی تھی۔ جوان جہان
شوہر چار پانی سے لگ گیا تھا۔ گھر میں بیٹیوں کا کروتڑ
بوجھ تھا اور ان کو تینا انا محض تھا کہ ابھی صرف اس نے
قدم اٹھانے سکھتے تھے اور زندگی کی طویل سنان شاہراہ کی
لبی مسافت تھی۔ حقیقت نے اپنے منھوں سے ہر طرف
پھیلا دیے تھے اور اس کے سنہری خوابوں کو نکل لیا تھا۔
چھوٹے ملک صاحب علاج دارو دارو دارو میں بڑی
فراخدی سے ساتھ دیتے اور ہر بڑے ڈاکٹر کے پاس خود
لے لے جاتے۔
آج بھی وہ نمیر کو خود شہر کے بڑے سرجن کے پاس
لے کر گئے۔ امیرو بھی ساتھ تھا۔ چھوٹے ملک صاحب
امیرو اور نمیر سے کو ان کے گھر کے دروازے پر اتار کر
گئے۔ امیرو نے نمیر سے کو سہارا دے کر صحن میں بھیجی
چار پانی پر لیا دیا۔ نمیر سے کا چہرے زرد تھا۔ اس نے
آنکھیں نموندری کھیں اور ہونٹوں پر خشک چھڑیاں جمع ہوئی
تھیں۔ بھاگو اور کینزو بھی چلے گئے۔ اٹھ کر نمیر سے کے
براہر بھی چار پانی پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔ بھاگو نے عقد دہکا
کر امیرو کے پاس لاکر رکھ دیا۔ امیرو نے شے کی لئے منہ
میں دہائی اور ہلے بلکے لگائے لگا۔
بھاگو کے چہرے پر سناٹا طاری تھا اور کینزو کے
چہرے پر ہسٹیک سنجیدگی تھی۔ یوں جیسے ابھی موت کے
مقدمے کا فیصلہ سنایا جائے گا!
”کیا کہا وڈے ڈاکٹر نے؟“ بھاگو نے چپے

میں ہر طرف اندھیرے اور خاموشی کا راج تھا۔ اعصاب شکن اور لرزہ خیز خاموشی جو گھپ اندھیرے سے جڑ جڑ لیتی ہے۔ سیاہ بل کھاتی سڑک کی اطراف میں نصب کچھ ٹکٹت کا سینہ چرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ رات پوچھ اور انسانی قدموں سے محروم تھی۔

اجانک شب کا سرخٹا اور سانے میں کسی کے مضبوط قدموں کی کھٹ کھٹ گونجنے لگی۔ پیٹم کوتر کے ساتھ ایک دروازہ پھٹ کر کھٹکے ہوئے روتھ رہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ شخص بڑے چوکنے انداز سے ارد گرد کا جائزہ بھی لیتا۔ سڑک سناں ہونے کے باعث وہ دھڑپ میں چل رہا تھا۔ اچانک عقب میں کسی کار آئین کی آواز سنائی دی۔ وہ خطرہ محسوس کرتے ہی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے تیز رفتار کار قریب سے گزری۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ جی سلامت نہ بچتا۔

اس نے غصے سے دور جانی کار کی طرف دیکھا اور لا پرواہی سے سر جھٹک کر آگے بڑھا۔ ہوا لچرے لچرے ہو رہی تھی۔ سرما کی راتیں دیشے بھی طویل اور ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ خاص طور پر آن کے لیے جو آرام دہ صُروں سے دور کوچہ گردی پر مجبور ہوں۔ اس شخص کے قدموں کی آواز دور تک ٹھیل رہی تھی۔ اس کے ہر انداز سے پھرتی اور بے چینی جھٹک رہی تھی، جیسے وہ کچھ کر گزرنے کے لیے مضطرب ہو۔ جب وہ سڑک کے کنارے بنی نیم پینڈ عمارت کے قریب پہنچا، کوٹنے میں دیکھا سیاہ رنگت والا کسان بھونکنے ہوا اس کی طرف لپکا۔

وہ ٹھٹھک کر ایک لمبے کے لیے رکھا پھر گھمردی آواز میں اسے دھتکارا۔ کتا سم کر وہیں دیک گیا۔ بھی اسے عمارت میں باظر نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابرانے لگی۔ وہ تیزی سے بڑھا اور بار کا دروازہ کھول اندر داخل ہو گیا۔ پھر دستاں لے اٹارتا ہوا کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ بار میں صرف ایک آدمی نظر آیا۔ وہ کاؤنٹر کی دوسری طرف

کھسک بکس کھولے، شاید دن بھر کی آمدنی کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے نووارد کے قدموں کی چابھ سنی تو سیف بند کیا اور اسے کاؤنٹر کے نیچے کھکا دیا۔ ”فرمایے جناب!“ اس نے پوچھا۔

”ایک پیگ!“ نووارد نے مختصراً کہا۔ بار والا تیزاً سے ایک طرف بڑھ گیا۔ وہ آنے والے سے خائف لگا رہا تھا۔ اس نے کن آنکھوں سے اپنے کا کب کا جائزہ لیا اور جلدی سے ایک پیگ بنا سامنے رکھ دیا۔

”آج موسم کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔“ نووارد نے ایک اسٹول اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

”جی، جی ہاں!“ بار والا ہاتھ دھوئے ہوئے بولا، اس کی گھبراہٹ بدستور قائم تھی۔

”تمہارا بار آبادی سے ہٹ کر واقع ہے۔ تمہیں یہاں پریشانی تو نہیں ہوتی؟“ نووارد نے عام لہجے میں پوچھا۔

”پریشانی تو کوئی نہیں، البتہ ابھی دھند صبح طرح ہوا نہیں۔ خراب موسم ہو تو گا کب ادھر کا راستہ ہی بھول جاتے ہیں۔“ بار والے نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”دراصل یہاں سے گزرنے والے مسافر اور گاڑیوں کے ڈرائیور یہ آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ وہ سرد راتوں میں بہت کم آتے ہیں۔“

”پھر بھی دن بھر یہاں تانتا بندھا رہتا ہوگا۔“ نووارد نے اسے تیز نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”اب اس بھی نہیں، ہاں اکا ڈکا کالگ آتے رہتے ہیں۔“ اس نے مشکوک انداز سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور چماٹن اٹھا کر بلا وجہ کاؤنٹر صاف کرنے لگا۔

نووارد نے ایک چسکی لی پھر بولا ”میرے دوست! تمہاری آنکھوں سے خوف اور شبہ جھٹک رہا ہے۔ شاید تم مجھے کوئی برا لیتا سمجھ رہے ہو؟“

”جناب! حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں۔ پھر آنے والے دروازے بھی ہوتی رہتی ہیں۔“ بار والا جیسے اپنی صفائی میں بولا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں دراصل سرکاری

نرخ رساں ہوں، یہ رہا میرا شانتی کارڈ۔ میں ایک مفرور مجرم کی تلاش میں ہوں جو اطلاع کے مطابق روہری آیا ہے۔ لیکن میں اس کے محلے سے پوری طرح آگاہ نہیں۔“ نووارد نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

بار والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو نووارد نے خالی پیک اس کے سامنے سرکاتے ہوئے کہا۔ ”ایک آدھا پیک اردو۔ آج موسم کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ ہوا ہلکے کا کتی محسوس ہوتی ہے۔“

”ہاں موسم دن بدن خراب ہوتا جائے گا۔ خراب موسم میں سارے کاروبار چھپتے ہو جاتے ہیں۔“ بار والے نے اس بار طعنان بھرے لہجے میں کہا۔

”لیکن کچھ لوگوں کو خراب موسم میں بھی اپنا فرض انجام دینا پڑتا ہے۔ مثلاً سرکاری سرانگ رساں۔ اب تبھی سوچو، اگر تین سرانگ رساں نہ ہوتا تو بڑے سکون سے اپنے گرم اور آرام دہ بستریں دیکھ ہوتا۔ تم اپنا بار بند کر سکتے ہو لیکن میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔“ نووارد نے اظہار خیال کیا۔

”جی ہاں! فرض کی ادائی ہر شے پر مقدم ہے۔“ بار والے نے رسمی طور پر کہا۔

”ارے ہاں!“ نووارد نے چونک کر پوچھا۔

”تمہاری نظر کسی مشکوک شخص پر تو نہیں پڑی جو دوسرے گزرا ہو یا تمہاری بار میں آیا ہو؟“

”نہیں۔“ بار والے نے نفی میں سر ہلایا۔

نووارد نے جیب سے پرس نکال کر بل ادا کیا اور بار سے دروازے کے رخ کیا۔ دروازہ مقرر کر کے اس نے جاتے ہی بار والے سے طویل سانس لی اور تیز تیز قدموں سوچ بوری پر جن تلاش کر کے باہر چلے والی روشنیاں بند کر دیں اور دم لہجے میں بڑبڑایا۔ ”آف میرے خدا یا!“

وہ پھر کاؤنٹر پر آیا اور پچھوڑے پڑے اس شخص کو دیکھنے لگا جو ریسیوں سے جکڑا پڑا تھا۔ اس کے منہ پر بندھا کپڑا اٹھایا ہو گیا تھا۔ اس نے ریسیوں میں جکڑے شخص کو

شادی کی تاریخ

لڑکے کی ماں اصرار کر رہی تھی کہ شادی کی تاریخ جلد طے کر دی جائے، لیکن لڑکی والے ابھی راضی نہ تھے۔ جب لڑکے کی ماں نے تاریخ لینے کی خدشہ شروع کر دی تو ٹوٹک آکر لڑکی کے والد نے کہا۔

”بھیس بھین جی! ہماری بیٹی ابھی بڑھ رہی ہے، جو بھی اس کی پرہنجائی قسم ہوگی، ہم کو آپ تاریخ دے دیں گی۔“

”پرہنجائی بعد میں ہوتی رہے گی۔ میرا بیٹا کوئی بندر نہیں ہے جو آپ کی بیٹی کی کتائیں چھاؤ دے گا۔“ لڑکے کی ماں نے جواب دیا۔

(نیلج، فیہ، سادہ، انفرجہ)

ٹھوکر ماری اور بولا ”آٹو کے چٹھے، اگر وہ کم بخت سرانگ چند لے اور پھر جاتا تو شاید تو مجھے مروا ہی دیتا۔ وہ کم بخت کتنے مشکوک انداز سے مجھے دیکھ رہا تھا۔“

”اوں..... نوں.....“ ریسیوں میں جکڑے شخص کے حلق سے بہت مدھم آواز بلند ہوئی، شاید وہ پوری قوت لگا کر بولا تھا۔

”اے بند کر اپنی فون غاں۔“ اس نے ایک آلات اُسے رسید کر اور بڑھ کر مزید پکڑا منہ میں ٹھونس دیا۔ ”اب تم آرام سے پڑے رہو۔ ممکن ہے کوئی جمع یہاں آئے اور بار کا دروازہ کھلا دیکھ کر تم تک پہنچ جائے۔ صبح تک یقیناً تمہاری غلوٹا سانس کی اور میں اس وقت تک بہت دور نکل جاؤں گا۔“

اس نے پھر بڑھ کر سیف اپنی طرف گھمنا، کھول کر جلدی جلدی ساری رقم جیسوں میں ٹھونکی، آمدنی اور اخراجات کا رجسٹر ایک طرف اچھالا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ریسیوں میں جکڑا بار کا اصل مالک چالاک لہیرے کو بے بسی کے عالم میں دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھتا رہ گیا۔

انسانی ذہانت، محنت اور قابلیت کے شاہکار

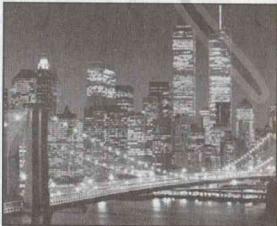
دنیا کے مشہور پل

خوب سے خوب ترکی تلاش میں ملے انسان نے جب پوری دنیا کو
دیکھنا چاہا تو راستے میں آنے والے دریاؤں، ندیوں اور سمندروں
کو پار کرنے کے لیے پل بنائے۔ جیسے جیسے ممالک بڑھ گئے،
گلی کی شہتیروں کی جگہ سڑکوں کے پلوں
نے لی اور آج پوری دنیا میں ایسے خوبصورت پل
موجود ہیں جو انسان کی ذہانت، مہارت
اور قابلیت کا منہ بولنا ثبوت ہیں

سب سے

بروکلین برج

(Brooklyn Bridge)



امریکا میں واقع اس پل کا شمار دنیا کے مشہور
ترین پلوں میں ہوتا ہے۔ یہ نیو یارک ہی نہیں دنیا
کے ۳ بڑے مالیاتی مراکز، ”بروکلین“ اور ”مین
ہٹن“ کو آپس میں ملاتا ہے۔ اس پل کی تعمیر
۱۸۶۹ء میں شروع اور ۱۸۸۳ء میں مکمل ہوئی۔
اس کی لمبائی ۵۹۸۹ فٹ، چوڑائی ۸۵ فٹ اور
وزن ۱۳۲۸۰ فٹ ہے۔ یہ شاہکار ماہر تعمیرات
جان آگسٹس روبلنگ (John Augustus
Robling) کا تخلیق کردہ ہے۔



۲۳ مارچ

قرارداد پاکستان

قوی اہمیت کے حامل اس دن پر مجھے اپنے ملک کے لوگوں کو یہ یقین دہانی کراتے ہوئے انتہائی فخر محسوس ہو رہا ہے کہ
پاک فضائیہ اکیسویں صدی کے جدید فضاؤں کے مطابق فعال اور ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے ہر دم تیار ہے۔
ہمیشہ چٹ آف دی انڈیا ناف میں پڑا ہوا رہوں کہ پاک فضائیہ کے تمام نوجوان اپنے مقدس مقصد کے حصول کے لئے
جذبہ قربانی سے سرشار ہو کر اپنے فرض نبایہ تہدی سے انجام دے رہے ہیں۔

ایئر چیف مارشل

طاہر ریاض بٹ

چیف آف دی ایئر اسٹاف، پاکستان ایئر فورس

پاکستان ایئر فورس

قوم کا سر مایہ افتخار

www.paf.gov.pk





سڈنی ہاربر برج

(Sydney Harbour Bridge)

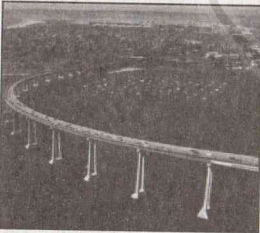
سڈنی، آسٹریلیا میں واقع یہ پل ”دی کورٹ ہانگر“ (The Court Hanger) بھی کہلاتا ہے۔ یہ ۸۰ سال کے عرصے میں ۱۲ ملین ڈالر کی لاگت سے تیار ہوا۔ اس کی لمبائی ۳۵۷۰ فٹ ہے۔ سیاحوں کی بڑی تعداد پل دیکھنے کے لیے سڈنی آتی ہے کیونکہ یہاں سے شہر کا نہایت دلربا منظر نظر آنے کے ساتھ ساتھ بندرگاہ، ساحل اور سڈنی اوپیرا ہاؤس کے دل کش نظارے بھی

بھی ہوتا ہے کیونکہ یہاں سے گزرنے کا ٹول ٹیکس تقریباً ۵۳ روپے (۳۶۲۳ روپے) فی کار وصول کیا جاتا ہے۔

کوروناڈو برج

(Coronado Bridge)

امریکی شہر سان ڈیاگو میں واقع یہ پل ۱۹۶۹ء میں تعمیر ہوا۔ اس کی لمبائی تقریباً ۱۱۲۸۸ فٹ ہے۔ اس کی تعمیر پر ۴۷ ملین ڈالر لاگت آئی۔ اس پل کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ خودکشی کرنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسی پل کا رخ کرتی ہے۔ اس لیے یہ ”سب سے مشہور خودکشی پل“ (Most Popular Suicide Bridge) بھی کہلاتا ہے۔



دکھائی دیتے ہیں۔ خصوصاً نئے سال کے موقع پر یہاں ہونے والی فٹ پاتھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پل کا شمار آن پلوں میں ہوتا ہے جن کی دنیا میں سب سے زیادہ تصویریں بنی ہیں۔

اورینڈ برج

(Oresund Bridge)

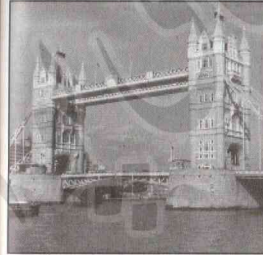
ڈنمارک اور سویڈن کو ملانے والا یہ پل ۸۰۰۰ فٹ ۲۸ رابر ڈالر کی لاگت سے تیار ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں اسے عام استعمال کے لیے کھولا گیا۔ اس کی لمبائی ۲۵۰۰۰ فٹ اور وزن تقریباً ۸۲۰۰۰ ٹن ہے۔ اس کا شمار مہنگے ترین پلوں میں

اس پل کا شمار دنیا کے قدیم ترین پلوں میں ہے۔ یہ پبل کوزی سے بنا تھا۔ مگر ۱۳۳۳ء میں آٹے والے سیلاب میں مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اٹلی کے شہر وینس میں واقع یہ پل سیاحوں کے لیے بے حد کشش کا باعث ہے کیونکہ صدیوں سے تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ پتھروں سے بنے اس پل پر گھر اور دکانیں بھی واقع ہیں جو اسے دوسرے تمام پلوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ سیاحوں کی بڑی تعداد کو اس پر بنے ہوٹلوں میں رہنا پسند ہے۔

ٹاور برج

(Tower Bridge)

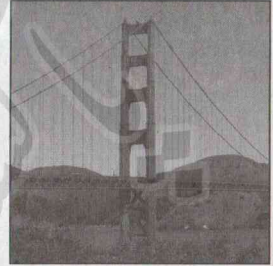
لندن میں واقع یہ مشہور پل تقریباً ۸۰۰ فٹ لمبا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۸۸۶ء میں شروع ہو کر ۱۸۹۳ء میں مکمل ہوئی۔ ٹاور آف لندن کے قریب اور مشہور دریائے ٹیز



گولڈن گیٹ برج

(Golden Gate Bridge)

اس پل کو امریکی ماہر تعمیر جوزف بی اسٹراس (Joseph B. Strauss) نے تخلیق کیا۔ یہ



سان فرانسسکو، کیلیفورنیا میں واقع اور سان فرانسسکو بجا کائل سے ملتا ہے۔ اسے دنیا کا لمبا ترین پل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۹۳۳ء میں شروع ہو کر ۱۹۳۷ء میں مکمل ہوئی۔ لمبائی ۸۹۲۱ فٹ ہے۔ اس پل پر سرخ اور نارنجی رنگ استعمال کیا گیا، اس لیے یہ کھر آلود اور دھندلے موسم میں بھی دور سے نظر آتا ہے۔

پونٹ وینیٹیو برج

(Ponte Viniocchio Bridge)



پر واقع یہ پل پارلیس جوز اور وولف ہیری (Horace Jones and Wolf Barry) نامی ماہرین کا تخلیق کردہ شاہکار ہے۔ اس کی لمبائی ۸۰۰ فٹ ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ درمیان سے ۳ حصوں میں تقسیم ہو کر اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس طرح بڑے بحری جہاز بھی باسانی پیچھے سے گزر سکتے ہیں۔

بیوسی فالس

بادی حسین



سیاہ اور سر غیر معمولی طور پر بڑا اور بیل کے سر سے مشابہ تھا۔ مزید برآں اُس کے سر پر سفید نشان تھا، شاید ایسے لیے اُس کو بیوسی فالس (Bucephalus) یا بیل کے سر والا گھوڑا کہا جاتا ہے۔

سکندر اور بیوسی فالس کا ساتھ مرتے دم تک قائم رہا۔ سکندر بیوسی فالس کو اپنے لیے خوش بختی کی علامت سمجھتا تھا کیونکہ اُس کے باپ پرس فلپ نے اُسے کہا تھا کہ جو شخص اس گھوڑے کی سواری کرے گا، وہ پوری دنیا فتح کرے گا۔ باپ کے مرنے کے بعد ۲۰ سال کی عمر میں

اعظم یا سکندریا
Alexander the Great
(Great) کے نام سے
کون واقف نہیں ہوگا۔

سکندر

اُس نے انتہائی قلیل مدت میں تاریخ پر ایسے اہم نقش چھوڑے جن کی نظیر نہیں ملتی۔ البتہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ سکندر کی فتوحات میں ایک اہم کردار ایک گھوڑے نے ادا کیا تھا۔

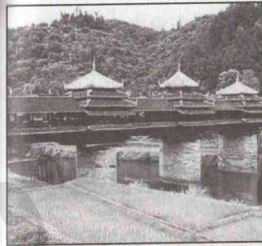
سکندر اعظم یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ میں ۳۵۶ ق م میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ پرس فلپ دوم اسی ریاست کا حکمران تھا۔ پرس فلپ نے بہت ابتدائی ایام سے ہی اپنے بیٹے سکندر اعظم کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اُس کی ذہنی اور جسمانی تربیت کے لیے ”ارسطو“ جیسا اتالیق مقرر کیا۔

سکندر جب ۱۳ برس کا ہوا تو گھوڑوں کا ایک یو پارٹی فیلونی کس (Philonicus) بادشاہ کے دربار میں ایک ایسا پیش قیمت گھوڑا لایا جو حیرت انگیز عادات و اطوار کا مالک تھا۔ گھوڑا جسمانی طور پر غیر معمولی قد و قامت کا حامل، انتہائی غصیل اور اتھرو مزاج تھا۔ دربار میں یہ گھوڑا لاکھ کوشش کے کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا، ایسے میں نوجوان سکندر آگے بڑھا اور پلک جھپکتے ہی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ درحقیقت گھوڑا اپنے سائے اور صل میں موجود درباریوں کے لیے چغما نما لباس کی بدولت ہلک جاتا تھا۔

نوجوان سکندر بڑی باریک بینی سے اس بات کا مشاہدہ کر رہا تھا، لہذا اُس نے اپنا درباری لباس اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے گھوڑے کو ایک خاص سمت میں گھورا کیا تاکہ اُسے اپنا سایہ نظر نہ آئے۔ اس کے بعد سکندر نے گھوڑے کو پیار سے چمکا کر اور بڑی نفاست سے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ تاریخ میں اس گھوڑے کو ”بیوسی فالس“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی بڑی دلچسپ ہے۔ بیوسی فالس کا رنگ

میلان وایاڈکٹ برج

(Millan Viaduct Bridge)

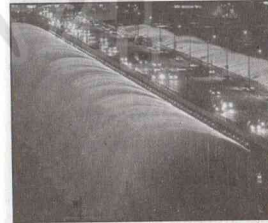


فرانس کی وادی تارن (Tarn Valley) میں واقع یہ پل ۳۰۰۴ میٹر طویل تھا۔ اس شاہکار کو تارن فاسٹر نے تخلیق کیا۔ اس پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو وادی کا دفریب منظر نظر آتا ہے۔ اس کا ہر ستون ۱۱۴۵ فٹ لمبا اور ۶۲ فٹ اونچا ہے۔ دیکھنے میں یہ بہت نازک لگتا اور ہوا میں اڑتا محسوس ہوتا ہے، اس لیے یہ ”اڑتا پل“ (Flying Bridge) بھی کہلاتا ہے۔ اسی لیے ٹارن سے

دی فاؤنٹین برج

(The Fountain Bridge)

سیدل، جنوبی کوریا میں واقع یہ پل ۱۰ ہزار سے زائد فوٹوں سے مزین ہے۔ یہ رنگ برنگے فوارے دریا سے فی منٹ ۱۹۰ ٹن پانی حاصل کرتے ہیں۔ خوبصورتی کے باعث سیاحوں کی ایک بڑی تعداد اسے دیکھنے آتی ہے۔ دریائے ہان (Han) پر پہلے یہ ایک سادہ پل تھا۔ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۸ء میں اس پر فوارے لگائے گئے۔ رات کے وقت مصنوعی روشنیوں اور فواروں کا جادو مزید مسحور کن ہو جاتا ہے۔ جو سیاح جنوبی کوریا جائے، یہ پل دیکھنے بغیر واپس نہیں آتا۔



بھی اُدنیا یہ پل انسان کی قابلیت اور ذہانت کی واضح مثال ہے۔ اس کی کل لمبائی ۱۰۷۱۰ فٹ ہے۔

شنگیانگ برج

(Chengyang Bridge)

چین میں دریائے لنگسی (Linxi) پر بنائے گئے اس پل کی لمبائی ۶۱۴۴ میٹر اور چوڑائی ۳۳ میٹر ہے۔ اسے ۱۹۱۸ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس پل کی خاص بات یہ ہے کہ کھڑی اور پتھروں کی مدد سے کیلوں کے بغیر بنایا گیا۔ یہ پل بھی انتہائی خوبصورت اور آمد رفت کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ سیاحوں کے لیے بھی باعث کشش ہے۔

ذرا غور کیجیے



لوڈ
شیڈنگ
گا توڑ

سکندر اعظم اپنے انتہائی پر لہجہ بڑھوڑے گھوڑے کی فاس کو لگا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ البتہ بعض تاریخ دان اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے بقول سکندر کا گھوڑا بیوی فاس بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی عمر ۳۰ برس تھی اور وہ مسلسل سفر اور جنگ کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکا اور پورس کے ساتھ اس خون ریز جنگ کے بعد زندگی کی بازی ہار گیا۔ سکندر اعظم کو بھی اپنے گھوڑے کی موت کا بہت غم تھا۔ اُس نے بیوی فاس کی پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین کا حکم دیا۔ مؤرخین کے مطابق گھوڑے کو موجودہ جہلم شہر کے نزدیک قصبہ جلال پور کے مقام پر دفن کیا گیا۔ سکندر نے اپنے اس پیارے گھوڑے کے نام سے ایک شہر بھی بسایا جو ایک روایت کے مطابق ضلع منڈی بہاؤ الدین کا قصبہ پچالیہ سے اور شاید بیوی فاس بھی نہیں دفن ہوا۔

ایک طرف مسلسل حالت جنگ اور وٹن سے دوری کی بدولت فوج کا مزید پیش قدمی سے انکار اور دوسری طرف اپنے عزیز گھوڑے کی موت کا غم۔ چند ایسی وجوہیں جن کی بدولت سکندر نے فوج کو بالآخر پسپائی کا حکم دیا۔ سکندر کو بیوی فاس سے بہت پیار تھا۔ بیوی فاس نے بھی بے شمار مواقع پر اپنے مالک کی جان بچائی تھی۔ وہ اپنے مالک کے اشاروں کو سمجھتا اور اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ سکندر اعظم خود بھی اپنے اس پیارے گھوڑے کے مرنے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ اور دفن واپسی کے سفر میں ہائل (قدیم عراق) کے مقام پر ایک موذی بخار میں مبتلا ہو کر صرف ۳۳ برس کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

سکندر کا گھوڑا بیوی فاس اب کا بھی ایک افسانوی کردار بن چکا ہے۔ اس سے منسوب بہت سی قدیم روایات اور کہانیاں مشہور ہیں جن کا ذکر مشہور تصنیف فنون لطیفہ میں بھی بیوی فاس کو بہت اہمیت دی گئی اور متعدد مجسمہ ساز اور مصوروں نے بیوی فاس کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔

سکندر اعظم اپنے انتہائی پر لہجہ بڑھوڑے گھوڑے کی فاس پر سوار ہو کر پوری دنیا کو فتح کرنے نکلا اور موجودہ مصر، عراق، ایران اور افغانستان کو زیرِ نگیں کرتا اور اپنی فتوحات کے پھر پھر لہراتا بالآخر درہ خیبر کے راستے شمالی ہندوستان (موجودہ پاکستان) میں داخل ہوا۔ ۳۲۶ قبل مسیح کے موسم گرما میں سکندر نے اپنی فوج کے ساتھ دریائے ہیداسپس (Hydaspes) (موجودہ دریائے جہلم) کے مغربی کنارے پر براؤ ڈالا۔ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر ایک مقامی ہندو ریاست پوروا (Purava) کا بادشاہ پورس (Porus) اپنے ۲۰۰۰ ساتھیوں اور ہزاروں کھڑسوار اور پیادہ دستوں کے ساتھ براہِ جان تھا۔ سکندر کی فوج نے بھی اس سے پہلے جنگ میں ہاتھیوں کا سامنا نہیں کیا تھا۔

چند روز کی جنگی منصوبہ بندی کے بعد بالآخر سکندر نے دریائے جہلم عبور کیا اور پورس کے مد مقابل ہوا۔ ابتدا میں سکندر کی فوج کے مخالف فوج میں ہاتھیوں کی موجودگی کے باعث پاؤں اکھڑنے لگے، لیکن جلد ہی سکندر نے اپنی ذہانت اور بہتر جنگی حکمت عملی کی بدولت اس پریشانی پر بھی قابو پایا۔ سکندر اعظم کے ایک انتہائی قابلِ اعتماد جرنیل کوئش (Coenus) نے پورس کے لشکر پر عقب سے بھر پور حملہ کیا۔ علاوہ ازیں سکندر اعظم کی فوج نے دشمن ہاتھیوں کی سونڈوں کو نشانہ بنایا جس کی بدولت یہ ہاتھی اپنی اپنی فوج کی صفوں کو الٹتے ہوئے پچھلے رخ بھاگ کھڑے ہوئے۔ نتیجتاً پورس کی فوج میں افراتفری اور بھگدڑ مچ گئی جو بالآخر شکست پر منتج ہوئی۔ ہاتھیوں کی ایسی بے وفائی کی بدولت اُردو کا ایک مشہور محاورہ ”پورس کے ہاتھی“ معرض وجود میں آیا۔ تاریخ میں اس جنگ کو جنگِ ہیداسپس (Battle of Hydaspes) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق یہ جنگ موجودہ جہلم شہر کے نزدیک قصبہ بھیرہ (Bhera) کے آس پاس لڑی گئی۔

سکندر اعظم سے آمناسامنا ہوا تو پورس نے ایک زہر

گرمیوں

کی آمد آمد ہے، بلکہ جب تک آپ یہ مضمون پڑھ رہے ہوں گے، تب تک گرمیاں آچکی ہوں گی۔ اس کے ساتھ ہی لوڈ شیڈنگ کا معریت منہ پھاڑے کھڑا ہوگا۔ مانا کہ گرمیوں میں بجلی کی کھپت بڑھنے سے مانگ پوری نہیں ہوتی، اس لیے لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے، مگر سردیوں میں اس کا کیا جواز ہے، جبکہ کنوے سی اور بچے ملتے ہیں اور نہ ہی انڈسٹری جو کہ گیس کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے پہلے ہی بند ہے۔ گرمی کی شدت کم کرنے کے لیے بہت سے ترقی یافتہ ممالک نے ایسی ایجادات کر رکھی ہیں جن کے لیے بجلی کی ضرورت نہیں یا کم از کم گڑ کی بجلی دکار نہیں بلکہ چھوٹے پیمانے پر بجلی گھر میں ہی پیدا کی جاتی ہے۔

گزشتہ چند برس سے وطن عزیز میں لوڈ شیڈنگ کا توڑ پوڑی ایس (UPS) کی صورت میں نکالا گیا ہے مگر جب بجلی اکثر غائب رہے تو پوڑی ایس بیٹری کیسے چارج کرے گا؟ اس لیے اکثر گھرانے پوڑی ایس ہونے کے باوجود اندھیرے میں اور بغیر بجلی کے بیٹھے ہوتے ہیں۔

کیا آپ کو علم ہے کہ خانوں میں گرمی اس قدر محسوس نہیں ہوتی، چینی زمین کے اوپر بنے مکروں میں۔ اس لیے اگر آپ نیا مکان بنانے کا سوچ رہے ہوں، تو اس میں یہ خانہ ضرور رکھیے۔ قدرت کا قانون ہے کہ اگر آپ زمین سے ۱۳ فٹ نیچے کرنا بنائیں، یعنی نہ خانے کا فرش زمین کی سطح سے ۱۳ فٹ نیچے ہو، تو اس کو سرے کا درجہ حرارت ۲۸ درجے سینٹی گریڈ ہوگا اور یہ درجہ حرارت آرام دہ ہے۔ اس میں اگر بجلی کی سہولت بھی ہو تو پھر اسے ہی کی ضرورت بھی نہیں۔

آج کل ششی توانائی (سولر انرجی) کا بہت شہرہ ہے

مگر یہ عینا قانونی بہت مہنگی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ صرف پہلی بار خریدنے پر کافی خرچ آگھٹتا ہے، اس کے بعد سوائے بیٹری کے دیگر تمام آلات مثلاً سولر پینل، چارج کنٹرولر اور انورٹر یکس، تیس سال تک چلتے ہیں۔ سولر سسٹم کے لیے اگر ڈیپ سائیکل بیٹری استعمال کی جائے، تو یہ عام بیٹری کی نسبت پانچ سے سات سال تک چلتی مگر یہ مہنگی ملتی ہے۔ میں اپنی ۱۲ وولٹ اور ۱۵۵ اریئمپر کھٹے (Ah) والی بیٹری ایک ۸۰ وولٹ سولر پینل سے چارج کرتا ہوں۔ گویا مجھے بیٹری چارج کرنے کے لیے واٹر کی بجلی کا تھانچ نہیں ہوتا پڑتا اور پھر بیٹری پر انورٹر لگا کر گرمیوں میں ۱۲ بجے اور ۳ بجے ازبجی سیور بلب استعمال کرتا ہوں۔ میں نے یہ چیزیں مسلسل ۳۰ گھنٹے بھی چلائی ہیں۔ جن گھروں میں پوڑی ایس ہیں، اُن سے گزارش ہے کہ وہ اس سے بچت کے بجائے اور نیوٹ لائن نہ چلائیں بلکہ اس کے لیے یو آر پر لگانے والی بجلی (بریک فیمن) اور ازبجی سیور بلب استعمال کریں۔ پینکھوں کو پوری رفتار سے چلائیں ورنہ رقم رفتار اور بار بار رفتار بدلنے پر بجلی خراب ہو جاتی ہے۔ میں نے جو سٹم بنایا وہ کچھ یوں ہے۔ ایک ۸۰ وولٹ کا سولر پینل، ایک ۳۰ اریئمپر کا چارج کنٹرولر (یہ برا اس لیے لیا ہے تاکہ مستقبل میں مزید پینل لگا سکوں) ایک ۱۲ وولٹ ۱۵۰ اریئمپر کھٹے والی بیٹری اور ایک ۵۰۰ وولٹ کا انورٹر۔ سولر پینل بچت پر مصروف رکھا جاتا ہے جو کہ سورج کی روشنی کو ڈی سی یعنی ڈائریکٹ کرنٹ بجلی میں تبدیل کرتا ہے۔ اس کے منفی اور مثبت تاریں چارج کنٹرولر میں لگتی ہیں، جس کا کام بیٹری کو زیادہ چارج (اور چارج) ہونے سے بچانا ہوتا ہے۔ پھر اس سے مثبت اور منفی تار بیٹری میں لگتے ہیں اور بیٹری میں ہی انورٹر کی تاریں یا کاپلنگ لگتی

پاکستان میں بائیو گیس کا سلسلہ ختم ہوا
تو بھارت میں عروج پا گیا

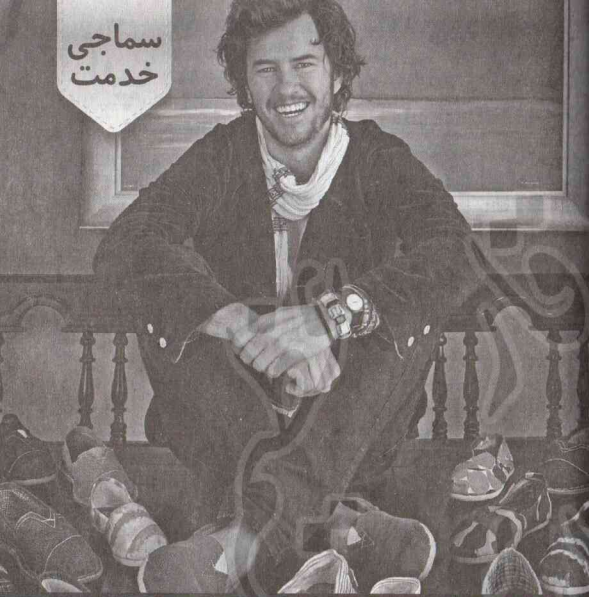
ہیں۔ انورٹر کا کام بیٹری کی ڈی سی کو اے سی یعنی آئرنریٹ کرنٹ میں تبدیل کرنا ہوتا ہے تاکہ گھریلو اشیاء چلا سکے، لائٹیں وغیرہ چل سکیں۔

اب آئیے کہیں کوئی یعنی مٹی کے تیل سے چلنے والے بجلی کی طرف۔ جی نہیں مجھے دماغی امراض کے ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ عینا لوہجی کم از کم ۲۰۰ سال پرانی ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ سٹرلنگ کے نام پر یہ عینا ناہو بیٹری عینا ناہو بیٹری کہلاتی ہے، جو اُس نے ۱۸۱۶ء میں ایجاد کی تھی۔ ایک معمولی شعلے کے ذریعے ہوا گرم کی جاتی ہے، جس سے بجلی کا پمپن اور دیگر بڑے حرکت میں آجاتے ہیں۔ یہ شعلہ موم بتی یا دیے کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے آتی ہوا ملتی ہے کہ انسان آرام سے گرمی کی شدت برداشت کر سکتا ہے۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ آج سے اسی نوے سال پہلے ہندوستان میں یہ بجلی عام تھی۔ اب دوبارہ انہوں نے بنانے شروع کر دیے ہیں۔ اب جو بچہ آپ کو سنانے لگا ہوں، وہ آپ کے لیے نہ صرف حیرت اور خوشی کا بلکہ انفسوں کا باعث بھی ہوں۔ ۱۹۹۶ء تک یہ بجلی پوری دنیا میں صرف پاکستان میں بنتے تھے۔ کراچی کے جو صاحب انہیں بنایا کرتے تھے انہیں نوکرشانے نے اتنا تنگ کیا کہ انہوں نے یہ سلسلہ موقوف کر دیا حالانکہ اس سے دنیا میں پاکستان کا نام جانا جاتا تھا۔ ایک امریکی کچھ سال پہلے اُن سے منت سماجت کر کے درجن بھر بجلی گھر بنوا کر لے گیا تھا جو دنیا بھر کے شوقین لوگوں نے اس سے ایک، ایک لاکھ روپے سے زائد قیمت پر خریدے۔ بھارت میں بہت سی کمپنیاں انہیں بنا رہی ہیں اور یہ وہاں ۱۲ ہزار روپے تک میں مل جاتا ہے۔ میری گجرات اور گوجرانوالہ کے پچھلا ساز اداروں سے درخواست ہے کہ غدار..... اس طرف بھی دھیان دیں اور اس عینا ناہو بیٹری کو دوبارہ زندہ کریں۔ وقت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اب آکر پاکستان کے اُن خوش قسمت علاقوں میں رہتے ہیں، جہاں اکثر ہوا چلتی رہتی ہے، تو پھر آپ ہوا

۱۹۹۶ء تک مٹی کے تیل سے بننے والے بجلی صرف پاکستان میں بنتے تھے۔
جب یہاں بند ہوئے تو ایک امریکی بنوا کر لے گیا اور اس نے ایک ایک لاکھ روپے میں بیچے

سے بجلی پیدا کر سکتے یعنی بیٹری چارج کر سکتے ہیں۔ یہ ونڈ (Wind) جزیئر گھر کی ضرورت کے مطابق ہر سائز میں مل جاتے ہیں۔ یہ ذرا سی بھی ہوا سے گھومنے لگتے ہیں۔ دوسرے لفٹوں میں بجلی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ چاہے آپ کسی توانائی استعمال کریں یا ہوائی توانائی، بیٹری بھر حال آپ کو کوئی پڑے گی۔ یعنی ان دونوں ذرائع سے بیٹری چارج ہوتی ہے، جسے آپ انورٹر (Inverter) کے ذریعے اے سی میں تبدیل کر کے گھریلو استعمال میں لاتے ہیں۔ گوکہ آپ ڈی سی سے بھی روشنی اور بجلی چلا سکتے ہیں، مگر ڈی سی بلب اور بجلی کے شکل سے اور مہنگے ملتے ہیں۔ بجلی کے ساتھ ساتھ آج کل وطن عزیز میں گیس کی لوڈ شیڈنگ بھی ہو رہی ہے جس سے انڈسٹری اور ایس ایس جی ٹیشن کو تو بے ایک طرف، گھروں کے چولہے، کیزر، ہیٹر اور گیس کی روشنیات تک نہیں مل رہی۔ ہر گھر میں صبح کے وقت چولہا جلانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ناشتہ تیار کر کے بچوں اور بڑوں کو سکول، کالج اور کام پر بھیج سکیں۔



ایک کے بدلے ایک

اس باہمت شخص کی داستان، جس نے اپنی منسر کمپنی کے ذریعے
برنس، لوگوں سے ہمدردی اور ہمسائیگی کے جذبہ اکٹھا کر لیا

عاطف مسررا

جاتے ہیں اور پائپ کو ایک پریشر پمپ کے ساتھ جوڑ کر
آگے گھریلو پانی کی سپلائی کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا
ہے۔ پریشر پمپ چلنے پر پانی کا دباؤ پچاس ساٹھ سے
لے کر ایک ہزار پانی ایس آئی (PSI) (پائپ کی مربع
انچ) تک ہو سکتا ہے جس سے پائپ کے نیچے جیٹ سے
پھوار نکلتی اور پائپ کی ہوا اسے آگے پیچھلتی ہے۔ اب یہ
جیٹ یا نوزل کے سوراخوں پر منحصر ہے کہ وہ کتنے باریک
ہیں۔ سوراخ جتنے باریک اور پانی کا دباؤ جتنا زیادہ ہوگا
پھوار اتنی ہی مہین ہوگی اور پائپ کے آگے پیچھے والا پائپ
نہیں اور اسے خشک کا احساس ہوتا ہے۔

ان پائپوں کی دوسری شکل کچھ ایسی ہوتی ہے کہ پائپ
کے ساتھ چند پریشر پانی کی ٹینگی لگا دی جاتی ہے، جہاں سے
پچھلا پانی لے کر جیٹ کے ذریعے پھوار سانسے پھینکتا ہے۔
ایسے پائپ کو Mist Fan کہلاتے ہیں۔ اسی طرح اس
سسٹم کو آپ برآمدے کی لمبائی میں ایک لڑی کی شکل میں
بھی لگا سکتے ہیں اور ہر ۲ فٹ کے فاصلے پر یہ نوزل لگا کر
ان کے پائپ اسی طرح پریشر پمپ اور پانی کی سپلائی
کے جوڑ کر پورے برآمدے کے آگے پھوار کا پردہ سا تان
دیتے ہیں، جس سے باہر اور اندر کے درجہ حرارت میں
۱۰ سے ۲۰ درجہ فرق پڑ جاتا ہے۔

ہمارے ہاں اقل تو یہ چیزیں دستیاب نہیں اور اگر
ملیں گی بھی تو بہت مہنگی۔ پانی کی موٹریں بنانے والے
حضرات چھوٹے پریشر پمپ بنانے پر بھی غور کریں اور
قیمت مقرر کرتے وقت ہاتھ ڈرا "ہول" کریں تاکہ غریب
اور متوسط طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے۔

آخر میں ہمارے سائنس دان اور انجینئرز حضرات اس
طرف بھی دھیان دیں کہ گرمی کی شدت کم کرنے کے لیے
کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ عوام کو گرمیوں میں رس اور چائین
پینے کے لیے نہ کہیں بلکہ ایسی ایجادات کریں جنہیں عام
آدی خرید اور اپنا سکے اور گرمی کے عذاب کو کسی حد تک
قابل برداشت بنا سکے کیوں کہ لوڈ شیڈنگ فی الحال
ہمارے اعمال کی طرح ہمارے ساتھ رہے گی۔

بہت سال پہلے پاکستان میں بائیسکس کا بہت چرچا
تھا۔ مگر دیگر چیزوں کی طرح یہ سلسلہ بھی آہستہ آہستہ ختم
ہو گیا جبکہ بھارت میں یہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ ہمارے
دیہات کے جن گھروں میں ایک یا دو گائے بچھیں بھی
ہوں، تو وہاں بہت آسانی اور کم خرچ سے بائیسکس کے
چھوٹے چھوٹے پلانٹ لگائے جاسکتے ہیں، جن سے وہ اپنا
چولہا اور رات کو روشنی کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔ اس
سے نہ صرف دیہات میں صاف ستھرا انداز ملے گا، بلکہ
ماحول بھی صاف رکھنے میں مدد ملے گی۔

اگر آپ کو پائپ کی بجلی چھٹی عیاشی ٹیسر ہو تو پھوار، کبر
کی خشک (Mist Cooling) سسٹم بھی بے شمار گرم
ممالک بشمول بھارت میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی
آسان ترین شکل زینتی پکھا یعنی پیڈل فن ہے۔ پائپ کی
جالی پر سامنے کی طرف ایک سے لے کر چھ تک ایک
باریک پائپ کے ساتھ گولائی میں پانی کے جیٹ لگا دیے

پائپ لگا کر
سٹ کولنگ سسٹم
سے پورا گھر ٹھنڈا
کیا جاسکتا ہے

آپ

دنیا میں جو تبدیلی دیکھنا چاہتے ہیں، اس کا آغاز خود اپنی ذات سے کرویں۔ امریکی ریاست کیل فورنیا میں رہنے والا بلیک مائی کوئکی (Blake Mycoskie) اسی سوچ پر یقین رکھتے

والا باہمت شخص ہے۔

۳۳ سالہ مائی کوئکی ۲۰۰۶ء میں چمپیاں گزارنے ارچنائن گیا۔ وہاں اس نے مقامی قس سیکھا، شیشی رانی اور پولو سے لطف بھی اٹھایا۔ لیکن دیہات میں پائی جانے والی غربت نے اسے بہت پریشان کیا۔ اس نے دیکھا کہ بچوں کے پاس پہننے کے لیے جو تھک نہیں تھے۔ اس کی ملاقات ایسے دردمند لوگوں سے بھی ہوئی جو بچوں کو جو تھ فراہم کرنے کے لیے کام کر رہے تھے تاکہ ان کے پاؤں زخموں اور بیماریوں سے محفوظ رہیں۔

مائی کوئکی نے امریکا میں جو تھ بنانے والی کمپنی شروع کرنے کا فیصلہ کیا جو اپنے ہر فروخت ہونے والے جو تھ کے بدلے میں دنیا کے کسی غریب بچے کو جو تھ کا جوڑا فراہم کرے گی۔ وہ جو تھ بنانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگلے ۱۲ ماہ اس نے اسی علاقے میں

گزارے اور جو تھ بنانے والے مختلف افراد سے اس علم سے متعلق معلومات اکٹھی کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس علاقے کے روایتی کینوں کے جو تھ جو یہاں کے کسان سیکڑوں سالوں سے پہن رہے تھے، اسی طرز پر جدید جو تھ بنائے جاسکتے ہیں۔

روایتی قسم کا چرتی کا ادارہ بنانے کے بجائے لوگوں کی بھلائی کے لیے برنس شروع کرنے کا منصوبہ کامیاب ہوا۔ پہلے ہی سال جو تھوں کے ۱۰ ہزار جوڑے فروخت ہوئے۔ مائی کوئکی سال کے اختتام پر اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ اس علاقے میں واپس آیا اور مستحق بچوں میں اپنے کاروبار کے اصول کے مطابق ۱۰ ہزار جوڑے تقسیم کیے۔

مائی کوئکی کے لیے وہ لمبے یادگار بن گئے جب اس علاقے کے ۱۰ ہزار کے جو تھ ملنے پر خوش ہوئے۔ وہ اسے پہن کر فٹ بال کھیلنے کے میدان میں گئے۔ کوئکی کو یہ دیکھ کر مزید خوش ہوئی کہ جو تھوں کی وجہ سے وہ آسانی اور زیادہ رفتار کے ساتھ فٹ بال کھیل رہے تھے۔ اب ان کے پاؤں میدان میں بھرے ہوئے شیشے اور پتھر کے نوکیلے ٹکڑوں سے محفوظ تھے۔



تیزی سے ترقی کرنے والی یہ کمپنی جنوبی افریقہ، ارچنائن، اتھوپیا، امریکا اور دیگر علاقوں کے غریب بچوں میں جو تھوں کے ۱۰ لاکھ سے زائد جوڑے تقسیم کر چکی ہے۔ یہ کمپنی اتھوپیا میں بچوں کو جو تھ فراہم کر کے آتش فشانی مٹی پر نئے پاؤں چلنے سے پیدا ہونے والی بیماری کو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

مائی کوئکی کا خیال تھا کہ وہ اپنی زندگی کا پہلا نصف حصہ دولت کمانے میں اور زندگی کے دوسرے نصف حصے میں ضرورت مند لوگوں کی مدد کر کے گاہنیں اس منفرد کمپنی کے ذریعے اس نے برنس، لوگوں کی ہمدردی اور بھلائی کے جذبے کو اکٹھا کر لیا تھا۔

نامز کمپنی کے جو تھ خریدنے والے صرف خریداری نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کی مدد کرنے والی تحریک کا حصہ بھی بنتے ہیں۔ اس کمپنی کو ایسے خریداری بھی ملتے ہیں جو زبردست طریقے سے اس کمپنی کی مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ جب کوئی ان سے جو تھوں کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ انہیں اس کمپنی سے وابستہ پوری کہانی سناتے ہیں۔

مائی کوئکی کو اب مختلف تقریبات میں مدعو بھی کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی متاثر کن داستان دوسروں کو سنا سکے۔ وہ ہمیشہ اپنا یہ پیغام لوگوں تک پہنچاتا ہے کہ کاروبار اور روزمرہ کے فیصلوں میں غریب اور وسائل سے محروم لوگوں کی مدد کا جذبہ بھی شامل رکھیں۔ اب یہ کمپنی دھوپ کے شیشے میں بنا رہی ہے۔ اس کام کا اصول بھی یہی ہے کہ ایک شیشے کے فروخت ہونے پر کمپنی ایک غریب بچے کی

ہیبتانی محفوظ رکھنے کے لیے طبی مدد، سرجری یا عینک کی فراہمی جیسا کوئی قدم اٹھائے گی۔

اسے اچھی کتابیں پڑھنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ اس کی ایک پندرہ کتاب فراہم کرے جو تھ گڈون نے لکھی ہے۔ مائی کوئکی اپنے ہر ملازم کو اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیتا ہے۔

پوری کمپنی کا کلچر اسی کتاب کے بنیادی پیغام کے گرد گھومتا ہے کہ کمپنی کے لوگ ایک خاندان کی طرح رہیں اور خود کو ایک بڑے مقصد سے جڑا محسوس کریں۔

مائی کوئکی کی سوچ اور کوششوں کو مل کلنٹن اور بل گیس جیسے موثر لوگوں نے بھی سراہا اور اسے وائٹ ہاؤس میں بھی اپنے خیالات سنانے کا موقع مل چکا ہے۔

مائی کوئکی رضا کاروں کے ساتھ غریب علاقوں میں خود جاتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے بچوں کو جو تھ پہنانے میں سرت محسوس کرتا ہے۔ وہ اس تحریک کا بھی حصہ ہے جو لوگوں کو دعوت دیتی ہے کہ ایک دن جو تھوں کے بغیر گزاریں تاکہ جو تھوں سے محروم غریب بچوں کی تکالیف محسوس کریں۔

نامز کمپنی ترقی کر رہی ہے۔ اب مائی کوئکی معاملات اپنی نیم کے حوالے کر کے زیادہ سے زیادہ وقت اپنی مرضی کے مطابق اپنی رفقاء سرگرمیوں میں گزار سکتا ہے۔ مائی کوئکی کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر بچہ اٹھنے کے بعد کچھ وقت ذاتی اور روحانی زندگی کے بارے میں غور و فکر اور لکھنے کے لیے نکالا جائے۔ اس طرح وہ زندگی کے معاملات کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

TOMS
Shoes for Tomorrow

صرف ایک فیصد
لوگوں کے لیے
پوری قوم کو
انگریزی پڑھنے کی
کیا مجبوری ہے؟

پروفیسر ارشد جاوید

عربی زبان میں اس لیے نازل کیا گیا تھا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ جائیں اور غور و فکر کریں۔ حقائق بھی یہی بتاتے ہیں کہ آج تک دنیا میں کسی قوم نے اپنی زبان کے بغیر ترقی نہیں کی۔ فرانس، جرمنی، روس، جاپان، چین وغیرہ نے انگریزی نہیں بلکہ اپنی اپنی زبان میں ترقی کی۔ یہ فیصلہ پنجاب کو برسوں پیچھے لے جائے گا۔ خصوصاً سرکاری سکولوں کے اساتذہ کو انگریزی نہیں آتی۔ آپ کی سرکاری مضامین سکول میں چلے جائیں اور اساتذہ کا امتحان لیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ کوئی استاد ایک ترقی پزیر دراستہ انگریزی نہیں سکھا۔ انگریزوں نے بھی انگریزوں کو چھٹی شجاعت سے لڑایا کیا تھا۔ بہتر یہ ہے کہ انگریزوں کو ازبغ تعلیم آروہ اور انگریزی کی بطور اضافی زبان کے پڑھائی جائے۔ انگریز پڑھانے کے لیے ایک یورپی دیں جسے دی جاتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے

یہ عجیب بات ہے کہ قفر یا ہر کوہِ کلمت ایسے کام کرنے کے جس میں پیسا خرچ ہو۔ بد قسمتی سے شہزاد شریف بھی ویسا ہی کر رہے ہیں۔ عمومی فلاح و بہبود کے لیے منجلی اکیسویں کی ضرورت نہیں۔ بہت سے ایسے کام ہیں جن پر اخراجات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مثلاً ہسپتالوں، پولیس اور دفتری نظام کو بہتر کرنے اور کرپشن ختم کرنے کے لیے لے پے پورے بجٹ کی ضرورت نہیں، صرف ویرن، محنت، لگن اور ایمانداری کی ضرورت ہے۔

شہری اب بھی سرکاری دفاتروں میں پہلے کی طرح
بیل و خوار ہوتے ہیں۔ ایل ڈی اے کا دفتر ہو یا کوئی
مراشتہ کے بغیر کا نہیں ہوتا۔ اب تو کوئی بھی
کریٹ نامزد مہنگی نہیں کر سکتا کرتا ہے۔ رشتہ اور
اہلیت کو کم کیا جا سکتا ہے سر حکومت اس میں مخلص ہو تو یہ
کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ میاں صاحب دراصل
سارے کام خود کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر زیادہ کام
کرنے کی وجہ سے بیمار ہو جاتے ہیں۔ کامیاب لیڈر اچھے
اور ماہر لوگ تلاش کر کے انھیں تربیت دیتے ہیں۔ پھر
تقریباً سارے کام اس کے پس پردہ کر دیا جاتا ہے کرتے
ہیں۔ (لیک) لیگ میں پس پردہ افراد بھی ایسے ہیں جو
ان کے معاون ہو سکیں؟ کیا میاں صاحب انفرادی شراعتی
ہو بھی؟ اور ایسا ایسا ہمارا مختاری اور تلاش نہیں کر سکتے
جو ان کے کام آسان کر سکیں؟

میں صاحب صرف ۲۲ کام کر لیں۔ لوٹ آپ کو جھوٹا بھی چاہیں تو تھول نہ پائیں گے۔ وٹن تو کام سے ہی ظاہر اور عادت ہوتا ہے۔ آپ کے دماغ میں نہ جانے یہ بات کس نے ڈال دی کہ پاکستان انگریزی امتحان کر لے، تو رتی کرے گا۔ چنانچہ پنجاب میں انگریزی کو دیرِ تعلیم بنادیا گیا، یہ احقانہ فیصلہ ہے۔ جدید نفسیات کہتی ہے کہ افراد اور قومیں ہمیشہ اپنی زبان میں بہتر طور پر بات سمجھتی، سمجھتی اور رتی کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر آپ کریم عربوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ قرآن ان پر

پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے تو وہ ان کا مقابلہ زیادہ آسانی سے کر سکتا ہے۔

ہمیں بھی سوچنا چاہیے کہ ہماری تعلیم، ہمارے
کاروبار یا کام میں کوئی اعلیٰ مقصد شامل ہے یا نہیں۔ تعلیم
محض اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے نہ ہو۔ اسی
طرح کاروبار محض دولت کمانے کے لیے نہ ہو بلکہ اس سے
دوسروں کی بہتری بھی مقصود ہو۔

ہمارے ہاں روایتی قسم کے رفاہی ادارے کھولے
درخان سے جہاں متعین عطیات کے منتظر رہتے ہیں۔
اس باہت شخص نے چیرٹی کا کیا تصور دیا، جہاں کاروبار
اس لیے شروع کیا جاتا ہے کہ اس سے نفع حاصل ہو اور اس
نفع کو لوگوں میں آسانیاں تقسیم کرنے کے لیے استعمال
کیا جائے۔

چلی میں سفر کرتے ہوئے ایک
 اک پر لگے پڑانے رنگ آلودہ
 نے اسے رکھنے پر مجبور کر دیا۔ بورڈ پر
 لکھا تھا "اپنی رفتار آہستہ کیجیے۔" مانی
 کو کسی نے اس بورڈ کی تصویر بھیج لی۔
 بعد میں اس کی ۵۰۰ کاپیاں کروا کر
 اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو
 بھیجیں۔ مانی کو کسی چاہتا تھا کہ یہ
 تصویر انہیں بتائے:

”بعض اوقات زندگی کی رفتار آہستہ کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس سے لطف اندوز ہونا پادار ہے۔“



اپنی ڈائری میں وہ ان چیزوں کے بارے میں لکھتا ہے
جن کے متعلق وہ زیادہ پریشان ہو۔ یہ معمول اس کے لیے
بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ چند ہفتوں بعد جب وہ
ان چیزوں کے بارے میں دوبارہ پڑھتا ہے تو وہ اکثر اس
نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جن باتوں کے متعلق زیادہ پریشان تھا
وہ زیادہ اہم نہیں تھیں۔ جب مستقبل میں اس طرح کی

تیز ترین

انٹرنیٹ آگیا

عبد محمود

فائبر تاریں بچھنے سے رفتار سو گنا ہونے والی ہے

مقابلے میں امریکیوں کوست رفتار انٹرنیٹ میسر ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی کوریا کے شہریوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ فی سیکنڈ ۳۳ میگا بائیٹ ڈیٹا ڈاؤن لوڈ کر سکیں۔ اس کے بعد لیتھونیا (۳۲)، لٹویا (۲۷) اور سویڈن (۲۶) کا نمبر آتا ہے۔ (پاکستان میں پیشتر آبادی ایک تا تین میگا بائیٹ فی سیکنڈ رفتار والا نیٹ استعمال کرتی ہے مگر امریکا ۱۰۰ میگا بائیٹ فی سیکنڈ والی سہولت بھی حاصل ہے۔)

کنساس ٹی میں جسم لیتا انقلاب

کنساس ٹی میں مقیم عام شہریوں، کاروباروں، کاروباریوں اور تاجروں کا کہنا ہے کہ فائبر تاریں بچھنے سے شہری کاروباری و معاشرتی زندگی میں بڑی تبدیلیاں آئیں گی۔ عام لوگوں کو تو یہ سہولت ملے گی کہ وہ برق رفتاری سے کتابیں، فلمیں، گانے اور عام فلمیں ڈاؤن لوڈ کر سکیں۔ پھر یہ ممکن ہوگا کہ یوٹیوب پر وہ بفرنگ کی کوفت اٹھائے بغیر من پسند فلمیں دیکھ اور گانے سن سکیں۔ غرض تیز رفتار نیٹ شہریوں پر تفریح کے نئے در کھول دے گا۔

کاروباریوں کو یہ سہولت ملے گی کہ وہ اپنے

۲۰۱۰ء کی بات ہے، امریکی نیٹ کمپنی 'گوگل' نے فیصلہ کیا کہ کسی ایک شہر میں انٹرنیٹ کی انتہائی تیز (الٹرافاسٹ) فائبر تاریں بچھائی جائیں۔ واضح رہے، ان تاروں میں ڈیٹا والے الیکٹرون تانبے کے بجائے لیزر شعاعوں کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈیٹا بچھوانے یا ممکنہ کے رفتار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تیز فائبر آپٹک تاروں کے ذریعے تیز رفتار میں مواد (ڈیٹا) بچھوایا جاسکتا ہے۔

اس منصوبے کے لیے ۱۱۰۰ امریکی شہروں نے درخواست دیں۔ آخر فروری ۲۰۱۲ء میں گوگل کمپنی نے فیصلہ کیا کہ پہلی فائبر تاریں ۲۰ لاکھ آبادی والے امریکی شہر کنساس ٹی میں بچھی جائیں۔ تاریں بچھ جانے کے بعد ممکن ہوگا کہ ان کے ذریعے ایک گیگا بائیٹ (ایک ہزار میگا بائیٹ) ڈیٹا فی سیکنڈ بچھوایا جاسکے۔

یہ انٹرنیٹ کی حیران انگیز رفتار ہوگی۔ فی الوقت امریکا میں ۱۱۰۵ میگا بائیٹ ڈیٹا فی سیکنڈ بچھوانا ممکن ہے۔ گویا فائبر تاریں بچھنے کے بعد اس رفتار میں ۱۰۰ گنا اضافہ ہو جائے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گو انٹرنیٹ نے امریکی محکمہ دفاع میں جنم لیا مگر ترقی یافتہ ممالک کے

یہ

کے بجٹ کا کم از کم ۲۰ فیصد سرکاری لوگ کھاتا ہے ہیں۔ آپ سڑکیں بنانے والے ٹھیکیداروں پر قانونی طور پر ۲ سال تک ان کی دیکھ بھال اور مرمت لازم کر دیں۔ دیکھیے گا پھر کیسے معیار بہتر نہیں کرتے۔

نئے انتخابات تک میاں صاحب کی حکومت کی کل مدت تقریباً ۱۱/۱۲ سال ہو جائے گی۔ ترکی کے طیب اردگان نے ۱۵ سال میں استنبول کی قسمت بدل دی۔ میں سوچتا ہوں کہ ووٹ دیتے ہوئے مجھے کچھ باتیں تو ضرور سوچنی ہی ہوں گی؟

میاں صاحب! آپ ایماندار، محنتی اور اچھے منتظم ہیں۔ حکومت سنبھالتے ہی ہسپتالوں کا نظام بہتر کیا اور وہاں غربیوں کی نشوونما ہونے لگی۔ انیس مفت ادویہ ملنے لگیں۔ ڈاکٹروں کا رویہ بھی مریضوں سے کافی بہتر ہو گیا۔ فوٹنگی وائرس کے دوران وہ دن رات مصروف رہے اور مریضوں کو ہر ممکن مدد فراہم کی۔ پلٹس کے لیے فوری طور پر پیشینہ منگوا لیں۔ میجرک اور ایف اے کے امتحان میں ٹیس روکنے کے مؤثر اقدامات کیے۔ امتحان میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے والے طلبہ کو انعامات دے کر علم کی حوصلہ افزائی کی۔ غربی گھر ۲۰۰ بچوں کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظائف دیے۔ اب بنگلی پیدا کرنے کے کئی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ کچھ چوک لاہور پر غلطی اور کے بعد اب مسلم ٹاؤن موٹر پورام کی سہولت کے لیے غلطی اور بنایا جا رہا ہے۔ سی این ٹی بسوں کے بعد اب تیز رفتار بسوں کا منصوبہ ہے جن سے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ کینال روڈ کو کھلا کیا جا چکا ہے۔ لاہور اور دیگر امریکی شہروں کو خوبصورت بنایا جا رہا ہے۔ ان تمام خدمات کے عوض آپ تنخواہ بھی نہیں لیتے یہ ساری اچھی باتیں ہیں مگر کسی بھی حکومت کا اہم ترین فرض لوگوں کی جان و مال کا تحفظ ہے۔ لاہور میں روزانہ بے شمار ڈاکے پڑتے ہیں۔ اخباری اطلاع کے مطابق ایک ماہ میں ۶۵۰ ڈاکے پڑے۔ تقریباً ہر گلی میں لوگوں نے خود بخود پھانک لگوائے اور وہاں ذاتی گارڈ رکھے ہیں۔

لوگ باہر جائیں، تو وہاں ذریعہ تعلیم بھی زبان ہے۔ اس لیے طلبہ کو انگریزی آتا ضروری ہے، مگر ہمارے ملک میں صرف اہل فیصلہ لوگ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے بھی صرف اہل فیصلہ کے لگ بھگ مزید تعلیم کے لیے باہر جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں ایم اے اے ان فیسات میں تیری جماعت میں تقریباً ۲۰۰ طلبہ تھے۔ ان میں سے صرف میں اعلیٰ تعلیم پانے امریکا گیا اور میں نے چھٹی جماعت سے انگریزی پڑھنا شروع کی تھی۔ اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی کہ صرف اہل فیصلہ لوگوں کے لیے پوری قوم کو انگریزی پڑھانی جائے۔

سرکاری جھگے کرپشن اور کام چوری کے عظیم مرکز کیوں ہیں۔ اس کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ میں جوہر ٹاؤن میں جی ون مارکیٹ کے سامنے سے روزانہ کم از کم ۲۰۰ مرتبہ گزرتا ہوں۔ تقریباً ۵۰ ماہ لگا ایک دن میں وہاں سے گزرا تو دیکھا کہ شافقت سکول کی دیوار کے ساتھ کی بلڈور، ٹیکس اور دوسری مشینیں کھڑی ہے، ساتھ ہی وہاں کئی جینے لگے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہاں موٹروے بنے گا ہے۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ اس سڑک کو کھلا کیا جاتا ہے۔ اسے تقریباً ۲۰۰ فٹ سے ۳۰۰ فٹ تک کھلا کرنا تھا۔ کافی دن تک وہاں میں نے کام ہوتے نہ دیکھا۔ بعد ازاں ابھی ہجھار دو چار لوگوں کو کام کرتے دیکھا۔ ایک دن میں نے سڑک کی پینش کی تو معلوم ہوا کہ وہ صرف آدھ کلومیٹر پٹی ہے۔ اب میں یہ نوٹ کرنے لگا کہ کس دن کام ہوتا ہے۔ پینش کریں کہ پہلے ۳ ماہ میں نے صرف ۹ دن کام ہوتے دیکھا۔ ملازم سارا دن درختوں کے نیچے سوئے رہتے۔ نتیجہ یہ کہ سڑک بننے تقریباً ۵ ماہ ہو گئے ہیں۔ آدھ کلومیٹر سڑک کی توسیع کا کام ابھی تک مکمل نہیں ہوا جبکہ یہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا کام تھا۔ ۲ کلومیٹر کی سڑک ۲۰ سال میں بنی ہے۔ جبکہ یہی سڑک بحرے ٹاؤن میں صرف ۲۰ دن میں مکمل ہو چکی ہے۔ پھر سڑکیں مکمل ہوتے ہی نوٹ چھوٹ کا کھڑا ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑے ٹھیکیدار کے مطابق پنجاب میں تعمیرات

شرکات داروں سے براہ راست ویڈیو کانفرنس کر سکیں۔

کمپیوٹر ماہرین کے مطابق مستقبل میں ہر جگہ فائبر آپٹک تاریں بچھ جائیں گی کہ یہی انٹرنیٹ کا مستقبل ہے جس ملک نے یہ تاریں نہ بچھائیں وہ دنیائے انٹرنیٹ سے کٹ کر رہ جائے گا

وہ دنیائے انٹرنیٹ سے کٹ کر رہ جائے گا

ابھی سب رفتار نیٹ کی وجہ سے کبھی آواز نہیں آتی اور کبھی تصویری رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ممکن ہوگا کہ وہ ایک شاخے میں گاہکوں سے رابطہ کر سکیں۔ چنانچہ تیز رفتار نیٹ خصوصاً چھوٹے کاروباروں اور تاجروں کی ترقی میں مدد و معاون بنے گا۔ لہذا ماہرین کو امید ہے کہ چھوٹے کاروبار کے شعبے میں نئی نئی جدتیں سامنے آئیں گی۔

ڈاکٹر اور ہسپتالوں کو یہ بھولتے ملے گی کہ وہ ایم آر آئی اسکین یا دیگر بیماری فائلیں بذریعہ نیٹ منزل تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ ہسپتال یا لیبارٹریاں ہر محلے میں محض ایک کمپیوٹر اور نیٹ کنکشن کی مدد سے اپنے دفاتر کھول لیں گی۔ بریسروں کو پھر ہسپتال یا لیبارٹری جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

تیز رفتار انٹرنیٹ مقامی حکومتوں یا بلدیہ کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔ مثلاً ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے ممکن ہوگا کہ بلدیہ کے کم از کم اہم اجلاس کی کارروائی شہریوں تک پہنچائی جائے۔ یوں ”ناؤں ہاں گھر میں“ والا نظریہ عملی جامہ پہننے لے گا۔ مزید برآں شہریوں کو یہ بھولتے بھی ملے گی کہ وہ بلدیہ کے کتب خانوں سے کوئی بھی کتاب براہ راست ڈاؤن لوڈ کر سکیں۔ یوں علم تک رسائی میں آسان ہو جائے گی۔ نیز طلبہ و طالبات کو موقع ملے گا کہ وہ انٹرنیٹ پر دستیاب لاکھوں کتب سے مطلوبہ تعلیم پائیں۔

نیٹ کا مستقبل

ماہرین کمپیوٹر کے مطابق مستقبل میں ہر جگہ ۲۴۲ آڈیو ڈیجٹ اپریل ۲۰۱۲

فائبر آپٹک تاریں بچھ جائیں گے کہ یہی انٹرنیٹ کا مستقبل ہے۔ جس ملک نے تاریں نہ بچھائی، تو وہ دنیائے انٹرنیٹ سے کٹ کر رہ جائے گا۔ اگرچہ ہر تیکنالوجی کے مانند یہ بھی خاصی سستی ہے مثلاً ایک امریکی شہر چٹانوکا میں کچل کی ایک کمپنی صارفین کو امریکا کا نیٹ فی سیکنڈ کی سہولت فراہم کر رہی ہے، تاہم ہر صارف اسے ہر ماہ ۳۵۰ روڈار (۳۱،۵۰۰ روپے) فیس ادا کرتا ہے۔ چونکہ یہ خاصی سستی نہیں ہے، لہذا عام ہی لوگوں نے اسے اپنایا ہے۔

لوگ نے ابھی نہیں بتایا کہ وہ کنساس سٹی کے شہریوں سے کتنی فیس لے گی۔ تاہم کمپنی کا کہنا ہے کہ وہ ”مناسب“ ہوگی۔ بہر حال یہ عیاں ہے کہ شہریوں کی اکثریت اس تیز ترین انٹرنیٹ کو اپناتے گی۔ وجہ یہ ہے کہ اب سارے موبائل فونوں کا دور آپٹک لہذا ان کے لیے یہ تیز رفتار نیٹ بہت موزوں ہے۔

ایک ماہر کا کہنا ہے کہ تیز رفتار انٹرنیٹ عام ہونے میں کئی برس لگائے گا اور اس کے فوائد بڑھتی جاتی جائیں گے مثلاً جب تک آنی، تو لوگوں نے پہلے پہل اسے اسی لیے اپنایا کہ لائین جلانے کی محنت برداشت کرنے سے بہتر تھا کہ بہن دبا کر بلب جلایا جائے۔ تب شاید کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ کچل جی ہمارا سامنے، معاشرتی معاشی اور کاروباری زندگیوں میں انقلاب لا کر ہمارا معیار حیات بلند کرنے والی ہے۔ کیا یہی کام مستقبل میں تیز ترین انٹرنیٹ بھی انجام دے سکتا ہے۔



صغیر ہاشمی

ایک

ادبی مجلس میں دیوان سگھ کا ذکر تھا۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے ان کی صاف کوئی کے مختلف واقعات بیان کرتے ہوئے کہا ”آرود کی ہفتہ وار اخبار نویس میں صرف ۳۳ پرچے ایسے ہیں جو مر کر بھی زندہ رہیں گے۔ الہلال، اودھ پتھر اور ریاست۔ الہلال کا ہمیشہ ادب کیا گیا۔ اودھ پتھر خود ہنستا اور ہنساتا رہا لیکن ریاست ایسا پرچہ ہے جس سے ارباب اقتدار خوف کھاتے رہے۔“ چراغ حسن حسرت نے کہا ”مفتوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں چار کر کے لکھتا ہے، عام ایڈیٹروں کی طرح آنکھ پھولی نہیں کرتا۔“ احمد شاہ بخاری نے صادقاً ”مفتوں بت کہہ میں اذان کی آواز ہے۔“

نقابیل فراموش

بے باک صحافت کے داعی اول

دیوان سنگھ مفتوں

آنکھیں چار کر کے لکھنے والے ایڈیٹر کا ماحیرا

مولانا عبد المجید سادک بھی ان سے متفق تھے۔ انھوں نے اتنا اضافہ اور کیا ”مفتوں نے ہفتہ وار اخبار نویس کی تنہا نویس کی عمارت کھڑی کی ہے۔“ شورش کا شیری ان باتوں کے راوی ہیں۔

دیوان سنگھ مفتوں کا نام سامنے آتے ہی بے باک صحافت کے حوالے سے نئی جہت سامنے آتی ہے۔ ایک بار ثقہ ادیبوں کی محفل میں یہ سوال زیر بحث تھا کہ آرود اخبار نویس کی کتنے ایڈیٹر ایسے ہیں جن کے قلم سے انسانوں کے بڑے بڑے کردہ نے محبت کی اور جن کی تحریروں کا دبدبہ تنی گرو میں جھگانے پر قادر رہا یا پھر جنھوں نے اپنے قلم کی طاقت سے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ ایسے مباحث میں ایک بات پر متفق ہونا مشکل ہے، لیکن تقریباً

سارے ادبا کا اتفاق تھا کہ ہفتہ وار صحافت میں طویل عرصے تک جو درجہ و مکالم دیوان سنگھ مفتوں کو حاصل رہا، وہ بے مثال ہے۔ مفتوں اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے واحد ایڈیٹر ہیں جنھوں نے ربع صدی تک پورے

ہندوستان میں اپنا کسک بٹھایا۔ ان کے ہم عصروں نے انھیں رشک سے دیکھا، وہ دستوں نے فخر کیا اور مخالفوں نے سر چھپانے میں خیر نہ سمجھی۔ دیوان سنگھ حافظ آباد (گوجرانوالہ) کے کتہہ کھتری سنگھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا سیاب ڈاکٹر تھے۔ ۴۰ء دن کے تھے کہ والد چل بیے اور بیٹی نصیب میں آئی۔ والد کے ترکہ سے ۱۲ سال اخراجات چلتے رہے۔ بھائی بیٹوں کی شادیوں میں پھر نہیں لیکن پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ چنانچہ غصی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ۱۲ سال کے تھے کہ حافظ آباد کے ایک ہندو بڑا بڑا کے ہاں ۵ روپے ماہوار پر ملازمت ملی۔ ان کا کام گاؤں کو کپڑے کے تھان کھول کر دکھانا تھا۔ اس ملازمت میں ایک واقعہ کا اثر ان کے دل پر نقش ہو گیا جو آئندہ زندگی ان کے کام آیا۔

اپنی اپنی ”نا قابل فراموشی میں خود لکھتے ہیں۔ ”ہندو بڑا بڑا کے ہاں ایک سلمان بوڑھا درزی اور اس کا جوان بیٹا سلائی کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک بار بوڑھے درزی کو کسی شادی کے سلسلے میں باہر جانا پڑا، عدم موجودگی میں وہ اپنے بیٹے کو کام سپرد کر گیا تا کہ جب وہ آئے تو گاؤں کا کاغذ ملے جو جب وہ واپس آیا تو گاؤں کے کسی بچہ کا سبز ٹمبلین کوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جلدی میں بیٹے نے بجائے سبز کے سفید دھاگے سے کوٹ کی سلائی کر دی



تھی۔ بوڑھا درزی اپنے اوپر قایم نہ رکھ سکا۔ اس نے زور دار پختہزبان جوان بیٹے کو مارا اور کہا: ”تالا ق!“ اور دیہات میں رہنے والے جاٹ کے بیٹے پر دم نہ کھاتا مگر اس عمل پر تو برس کھاتا جس کا تو نے ستیا ناس کر دیا۔“

بوڑھے باپ نے اسی وقت بیٹے کو کوٹ کی ساری سلائی اویڑی اور بڑی محنت سے دو بارہ کوٹ کو سبز دھاگے سے سیاہ۔ یہ سارا قصہ دیوان سنگھ کے سامنے پیش آیا۔ تھے معصوم ذہن پر یہ بات نقش ہو گئی۔ تمام عمر انھوں نے خواہ اپنا کام کیا یا ملازمت کی، اُسے محنت اور تربیت سے انجام دیا۔

انھوں نے اخبار ریاست ۱۹۲۳ء میں نکالا اور ۳۳ برس تک اس کی شہرت میں چنداں فرق نہ آنے دیا۔ حق کو اپنایا۔ مظلوموں کے لیے جانے پناہ بنے۔ تحقیق کرنے کے بعد حمایت کے لیے کمر بستہ ہو جاتے۔ والیان ریاست کے ستائے ہوئے لوگوں کی ہفتے بڑی پامردی سے مقابلہ کر کے ہتھار کو اس کا حق دلاتے۔ پوچھنے لگا، پٹنہ رشت کے راز، دیسی راستوں کے اسرار، ان کے مظالم، سازشیں، رشوت، حکومت کی چیرہ دہتیاں، جیلوں کی زندگی، اخلاقی پستی اور نمک حرامی کے حیرت انگیز واقعات ان کی زندگی میں پیش آئے۔ ۵۱ بار بار گرفتار ہوئے۔ ہر جیلوں کے ایسے رہے، لیکن ان پر سختی مصیبتیں نازل ہوئیں، جتنے مقدمات چلے، اپنی قدر ان کی عزت اور شہرت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ جانتے تو گھر بیٹھے دولت کا انبار جمع کر لیتے مگر بڑی سے بڑی رشوت اور بڑے سے بڑا لالچ انھیں متاثر نہ کر سکا۔ انھوں نے صرف پانچویں تک تعلیم حاصل کی تھی۔ حالات نہ آگے بڑھنے

کا موقع نہ دیا۔ لیکن ان کے شوق، محنت، عزم اور شب و روز مطالعے نے انھیں صحافت کی صنف اول میں کھڑا کر دیا اور ان کے اخبار کو آزادی رائے، بے لاک تنقید اور زور بیان بخشا۔ وہ خود کامیابی کا راز محنت اور صرف محنت اور کام کی لگن میں سمجھتے تھے۔

وہ ایک کہنہ مشق اور کامیاب ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ جن لوگوں نے ان کا اخبار پڑھا ہے، انھیں آج بھی مفتوں کا انداز بیان یاد ہوگا۔ سیدھے سیدھے، بے تکلف انداز میں صحیح تصویر کشی کرنا ان کا مقصد تھا۔ اخبار میں ناقابل فراموش کالم کے مضامین شائع ہوتے تو لوگوں کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ یہی وجہ ان کی کتاب ”نا قابل فراموشی“ کو طوطی طاس لانے کی بنی۔ انھوں نے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ نواب بھوپال والے مقدمہ میں جب ۳ ماہ ناگ پور جیل میں رہے تو ریاست کے مستقل کالم ”جذبات شرقی“ کے لیے ہندی کے بہترین شعراء کے کلام کا ترجمہ کیا۔ وہ بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ان کی دونوں کتابوں کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

وہ خود لکھتے ہیں ”میں نے مسیح اور درست اردو بولنے اور لکھنے کے لیے ملاوا دھاری یا بیگم مرزا، بہادر شاہ ظفر اور بادشاہ کے خاندان کی ایک مرحوم خاتون اور دوسرے دوستوں کی امداد حاصل کی، لیکن میں ایمانداری کے ساتھ اس کا اقرار کرتا ہوں کہ ۱۲ برس دل میں رہے اور بھڑا جھوٹ کرتے رہے“ کے مصداق ۳۳ برس میں اردو پر قادر نہ ہو سکا۔ جو شخص پنجاب میں پیدا ہوا ہو اور کہے، وہ اردو زبان پر قادر ہے تو وہ یقیناً غلط ہی میں مبتلا ہے۔ اس کے ثبوت میں مرحوم پروفیسر محمد حسین آزاد کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔“

مرحوم پروفیسر محمد حسین آزاد دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر فارسی زبان کے عالم تھے۔ اپنی علیت کے باعث ساہیا سال تک کوٹھنٹ کا کالج لاہور میں فارسی پڑھاتے رہے۔ آپ کو اس بات کا وہم تھا کہ آپ ایران کے

اہل زبان کا فارسی میں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی غلط فہمی میں مبتلا ایران گئے تاکہ وہاں فارسی دانی کا کسک بٹھاسکیں۔ تہران میں ایک عالم اور مستفک کے مہمان ہوئے۔ دوسرے تیسرے روز کا ذکر ہے کہ آپ تہن میں بیٹھے تھے، قریب ہی چھاپا جل رہا تھا۔ اتنے میں دہنگی زادہ آنچ ہونے کے باعث اہل پڑی۔ مولانا پاس بیٹھے یہ دیکھ کر سوچنے لگے کہ دہنگی کی اس کیفیت کو کیا کہنا چاہیے۔ اتنے میں گیس کے اندر سے ایک چھوٹی بچی آئی۔ جب اس نے دہنگی کا یہ حال دیکھا تو بے ساختہ ماں کو متوجہ کرتے ہوئے بولی:

”ااا، اااا، دہنگی سر کردہ۔“

مرحوم پروفیسر کو تب احساس ہوا کہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، کوئی شخص کی غیر زبان میں کتنا بھی علم حاصل کر لے، وہ زبان پر قادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پروفیسر واپس تشریف لے آئے۔“

دیوان سنگھ کو بڑا بڑی دکان پر کام کرتے چند روز گزرے کہ محلے والوں کو پتا چل گیا۔ ان کی کئی سی ایک امیر برہمن رہتا تھا۔ اس نے بھی مفتوں کے والد سے رقم لی تھی۔ اس نے انھیں بلا کر کہا، تم بڑھنا چاہتے ہو تو سارا خرچہ میں اٹھاؤں گا۔ اس بات کا ذکر مفتوں صاحب نے گھر آ کر والدہ سے کیا۔ والدہ نے انکار کرتے ہوئے کہا ”لوگ کیا کہیں گے؟ یہ ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔“

والد نے بہت کچھ پھڑپھڑا تھا۔ روپیہ اور پھر زیور شرم ہوا تو گھر کی اشفا فروخت کر کے گزارا ہوا۔ چنانچہ عرصے تک یہ کام جاری رہا، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ کہتے ہیں جو لوگ عوام میں عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر کردار پیدا کریں۔ دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں، انسان کو اپنی عزت پر دولت قربان کرنی پڑتی ہے۔ عزت جب ہی حاصل ہوتی ہے۔ جو دوستوں کے ساتھ بددیانتی کرے، وہ اعتماد کس ہے۔ بازار کا ایک کتاب بھی اس سے

اچھا ہے جو اپنے دوست اور دشمن میں تیز کرتا ہے اور دوستوں کے ساتھ ضراری نہیں کرتا۔

شروع میں دیوان نگہ نے لاہور میں مختلف اخبارات میں دو تین لکھنے کا کام کیا۔ مالی حالت چندان اچھی نہ تھی۔ وہ اپنے اپنی زندگی کا ناکام روز تصور کرتے تھے۔ اکثر ۲۰ سینٹر صحافیوں لالہ رام چچا لکھ شیدہ اور لالہ بانکے دیال کے ساتھ وقت گزارتے۔ ایک روز پنڈت راج نرائن امرام آئیں ملے۔ باتوں باتوں میں بتایا، پھر حکومت کا کچھ حصہ ان کے پاس ہے۔ پھر حکومت نادر و نایاب کتاب ہے اور علم جوئی کے موجد، پھر گورنری کی تصنیف ہے۔ ہزار ہا برس پہلے لکھی گئی۔ کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ مکمل کتاب کا وزن کئی من ہے۔ کتاب میں دنیا میں لکھنے لوگ پیدا ہو چکے، موجودہ اور آئندہ، برآئے والے انسان کا راز بھی نہیں اس کے ہر جہم کا حال بھی لکھا ہے کہ آئندہ وہ کہاں پیدا ہوگا۔ مفتوں لکھتے ہیں ”میرا زانچہ بھی لیا۔ پھر ہزار ہا کنڈ لیں ہیں۔ اسے میری کنڈی (زانچہ) ملائی اور نتیجہ مجھے پڑھ کر سنایا، وہ مجھے بات تک یاد ہے۔

”انسان مکمل میں ہوگا تو آپ کی صحت کرنی شروع ہو جائے گی۔ پیدا ہونے کے ۱۶ ماہ کے اندر باپ اغفال کر جائے گا۔ بہت ہوشیار ہوگا۔ ۱۸ برس کی عمر میں زمین طے لے گا۔ ۱۷ برس کی عمر میں ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا اور بہت تکلیف اٹھائے گا۔ لڑکی کے ساتھ اس انسان کا پچھلے جنم میں تعلق تھا۔ اس نے لڑکی کو پچھلے جنم میں تکلیف دی تھی۔ یہ لڑکی پچھلے جنم کا بدلہ اس جنم میں لے گی جب اس کی عمر ۱۷ سال ہوگی۔ یہ انسان پچھلے جنم میں بنارس کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ انسان بہت خوش نصیب اور خوش بخت ہے۔ زندگی میں لاکھوں انسانوں کے داغ پر حکومت کرے گا۔ چڑھنے کے لیے سواری نصب ہوگی۔ لاکھوں روپیہ پیدا کرے اور لاکھوں روپیہ خرچ کرے گا۔ ہمیشہ مقرر رہے گا۔ زندگی پھر دشمنوں کا مقابلہ کرتا اور ان کو نیچا پھونک رہے گا۔ راجوں، مہاراجوں کے مقابلہ تک ہوگا۔ اس کا رزق اس کے

وطن سے مشرق کی طرف ہوگا۔ ۸۰ برس کی عمر کے بعد یکدم حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہوگی۔“

دیوان نگہ لکھتے ہیں ”یہ مختصر حالات سن کر میں حیران رہ گیا۔ کڑے واقعات بالکل سچے تھے۔ آئندہ زندگی اتنی شاندار ہوگی، یقین نہ آتا تھا۔ میرے والد میری پیدائش کے ۲۰ دن بعد فوت ہو گئے تھے۔ تعلیم پانچویں تک حاصل کی۔ ۱۸ برس کی عمر میں زمین تقسیم ہوئی تو ملی۔ ۱۷ برس کی عمر میں جب دھرم سنگھ خلیفہ فیروز پور میں تھا، مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ آپ یقین نہیں کریں گے اس زمانے میں مجھے عورت مرد کے تعلقات کا علم بھی نہیں تھا۔ اس لڑکی سے میں نے بھی بات بھی نہیں کی لیکن ایک برس تک مجھے نیند نہ آئی، بے چین رہا۔ ۲۰ سال بعد وہ لڑکی مر گئی۔ جب میں نے یہ خبر سنی میرے ہاتھ میں کچھ سامان تھا، وہ گر گیا۔ اب بھی جب بھی اس کی یاد آئے، پورے جسم میں شش دوڑ جاتی ہے۔“

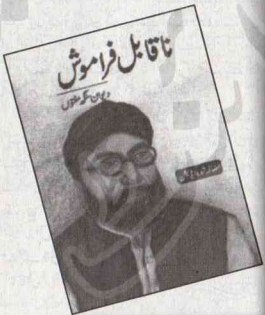
اٹھارہ انیس سال کے تھے کہ ذوق صحافت کی عقلی دور کرنے کے لیے لکھنؤ سید جالب مرحوم دہلی ایڈیٹر ہمہ کے دفتر پہنچے۔ انھوں نے کہا کوئی جگہ نہیں، کہا، چڑا ہی رکھ لیجئے۔ وہ بات بھی زد ہو گئی۔ انکار میں جواب سن کر کہا ”آپ کو مفت کام لینے میں کوئی اعتراض ہے؟“ سید جالب نے کہا، مفت کام لینے میں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اگلے روز ”ہمہ“ کے دفتر میں معاوضے کے بغیر کام شروع کر دیا۔ مہاجلا دھرم سنگھ کی یاد بعد میں دیوان نگہ ”اس وقت میری ذاتی آمدنی اور خرچہ روزانہ آٹھ آنے سے زیادہ نہیں تھا۔“ پھر آپ نے میدان صحافت میں جو عمر کے انجام دیے، انھیں دیکھ کر ہاپائے صحافت سید جالب دہلی نے کہا ”میرے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان نگہ ہے۔ اس کی کامیابی پر مجھے غر ہے۔“

اخبار ریاست کی ایڈیٹری پھولوں کی بیج نہیں ملے تیار کی حداری تھی۔ ریاستوں کے راجے، مہاراجاں کے خلاف تھے، لہذا مقدمے قائم ہوتے رہے۔ تلاشیاں

ہوئیں اور زندگی کے تلخ تجربات سے گزرتا پڑا۔ پھر پور زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات انھوں نے اپنے خاص رنگ اور اسلوب میں تحریر کرنا شروع کیے جو ”ناقلی فراموش“ کا حصہ بنے۔

ہندی شاعری میں عوام کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ یہاں کی ریت، ریتیں، محبوبہ کے انگ انگ کی تصویر کشی، مٹیوں کا بانک پن، موموں کے رنگ، چھپر، چھڑا، سون کی آگ، جن کا سر پشہ جھج جھج عوامی زندگی سے ہے اور ان کو بڑے طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

دہلی میں محلہ گڑھیہا میں اخبار ریاست کا دفتر تھا۔ چلی منزل میں میرے ابا سید مہربان حسین سبزواری رہتے تھے۔ اس وقت دستور تھا، گھر میں کوئی چڑ پتی تو پڑوس کے دو دروازوں میں ضرور بھجوا جاتی۔ میری امی خاندان داری میں کمال رکھتی تھیں۔ انھیں ڈیرا سن بنانے اور کشیدہ کاری کرنے کا شوق تھا۔ پردے کے باوجود انھوں نے کشیدہ کاری کے مقابلوں میں انعامات حاصل کیے تھے۔ دیوان نگہ کے ہاں بھی تیسرے چوتھے دن کھانا پکا سبکی میں خوان بچھا اور پور سر پوش ڈال کر بھجواتیں۔ کڑے سر پوش دیکھ کر دیوان نگہ بہت خوش ہوتے۔



انھوں نے خواتین مشرق کے ایڈیٹر، عبداللہ فاروقی سے بات کی اور امی کو بھلوا کر کشیدہ کاری کی اپنی کتابیں شائع کر دائیں۔ امی نے کراچی، دکن، کشیدہ کاری، کریشیا کے بارے اور بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ اس طرح کچھ بیٹھے آمدنی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ دیوان نگہ کی کتاب ”ناقلی فراموش“ میں کھانے کی لذت کے عنوان سے ہمارے ہی گھر کا کچھ یوں ذکر ہے۔ ”دہلی کے مسلمانوں کے ہاں خاص قسم کی ماش کی پھریری والی کرتی ہے۔ یہ دال بے حد لذیذ ہوتی۔ اس گھر میں پتی تو مانگن اپنے ملازم کے ہاتھ یہ دال ضرور مجھے بھجوا کرتی۔ میں نے ایک روز اس خاتون کو بھلا بھیجا کہ میں کسی عورت کا انتقال کرتا ہوں پر پردہ نہ کرنا۔ آپ اس عورت کو دال پکانا سکھا دیں تاکہ وہ مجھے سکھا دے۔ میری اس درخواست پر اس خاتون نے جواب دیا، میں دال پکانا تو اس عورت کو سکھا دوں گی، مگر یہ تو اپنا اپنا ہاتھ ہے۔ تمام عورتیں کھانا پکاتی ہیں، کوئی لذیذ اور کوئی بد مزہ یہ ضروری نہیں کہ وہ عورت یا آپ بھی ایسی ہی دال پکا سکیں۔ اس جواب پر میں نے عورت بھیجے کا ارادہ ترک کر دیا۔“

مفتوں صاحب اسلام کی حقانیت کے قائل تھے۔ آپ یقین میں لکھتے ہیں۔ ”ایک بار دہلی میں تھیں تھا۔ وہاں کانپور کے احراری مولوی عبدالقیوم دن رات ساتھ رہے۔ ہر بات میں یہ مخلص شخصیت مذہبی سنجیدگی کرتی۔ ایک روز جہانما گاندھی کی زندگی اور حق پرستی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ان کی صاف بیانی کا ذکر کرنے کے بعد مولوی عبدالقیوم نے ایک حدیث سنائی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”دنیا میں سب سے بڑا جہاد خواہش کے منہ پر حق صداقت کی آواز بلند کرنا ہے اور اگر یہ شخص کسی سزا کی پروا نہیں کرتا تو اس شخص کا یہ فعل تمام جہادوں میں سب سے بڑا جہاد قرار دیا جائے گا۔“

مولوی عبدالقیوم کے منہ سے یہ حدیث سن کر میں سوچنے لگا کہ جو رسول ﷺ حق و صداقت کی آواز بلند



مشورہ حاضر ہے

صغیرہ بانو شیریں

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، چھوٹے چھوٹے
مسکوں کے چھوٹے چھوٹے عمل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

ذہنی تندرستی

چند ماہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میری بیوی فوت ہو گئی۔ دو بچے ہیں۔ جب گھر آتا ہوں تو عجب کیفیت ہوجاتی ہے۔ منہ خشک ہونے لگتا ہے۔ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ سر میں ایسا لگتا ہے کوئی اسے دبا رہا ہے۔ بعض دفعہ پیٹ میں درد ہوجاتا ہے۔ گھر آتے ہی یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ کچھ گھنٹوں بعد معمول پر آجاتا ہوں۔ رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ اس بارے میں ضرور لکھیے۔ میرے دوست کہتے ہیں، تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ آپ بتائیے میری کیا مدد کر سکتی ہیں؟ (ب۔م)

بھائی! آپ کو کچھ نہیں ہوا۔ نہ جادو ہے نہ سحر کا اثر، اسے آپ ذہنی دباؤ کہہ سکتے ہیں۔ اکثر بیوی کے سر جانے یا کسی اجابک ذہنی صدمے سے یہ حال ہوجاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کسی بقیہ فقیر کے پاس جانے سے اس کی نظر کاٹھ ہوجاتا اور مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہاں اپنے دل کی بات کہنے سے بوجھ ہٹا کر ہوجاتا ہے۔ آپ اپنے کسی دوست سے، بھائی سے بات کر کے بوجھ کم کر سکتے ہیں۔ آپ نماز کی پابندی ضرور کریں۔ نماز کے بعد دعا کرنے سے آپ کو اپنے اندر ایک نئی تبدیلی کا احساس ہوگا۔ ذہنی اور جذباتی دباؤ کو Stress بھی کہتے ہیں۔ دودھ، دہی، شہد، گنے کی راب، الفا الفا کے سچ، کدو اور سورج کھی کے سچ آپ کے لیے مفید ہیں۔ اہلی اور بچی براں صحت بخش ہوتی ہیں۔ بے خوابی ہو تو سونے سے پہلے درجن پی پی ہوئی ۷ بجے گرم دودھ میں ملا کر ایک چمچ شہد ڈال کر پینے سے بہت سکون ملتا ہے۔ اپنے ڈاکٹر سے پوچھ کر حیاتین جو بڑا کراکتے ہیں۔ تلی سے چھوٹے چھوٹے دس بارہ پتے چھانے سے ذہنی دباؤ میں فرق پڑتا ہے۔ صبح شام کھانے سے آپ سکون محسوس کریں گے۔ کیلے کے لیے اچھے ہیں۔ دو کیلے روزانہ کھائے یا ایک شیک بنا کر پی لیجیے کوئی اچھی خاتون ملیں تو شادی کر لیجیے۔ ایسی خواتین ہیں جو سوئیٹ پیچوں کو اپنا بچہ مان کر پیال پی ہیں۔ ماں کی محبت دیتی ہیں۔

کلیننگ ملک

میری دوست بازار سے کلیننگ ملک خرید کر لاتی ہے۔ اس کے کیا فائدے ہوتے ہیں اور اسے گھر کیل طور پر کیسے بنا سکتے ہیں؟
(شاہین ملک)

بازار جائیں تو طرح طرح کے لوٹ، کریمیں، ماسک نظر آتے ہیں اور قوت خرید سے باہر۔ پہلے زمانے میں بھی سنگھار

دیوان سنگھ منتوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے، انسان کی محنت بھی رابڑوں نہیں جاتی۔ اس کا پھل اسے ضرور ملتا ہے۔ ایک معمولی پڑھا لکھا انسان صرف اور صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر آگے اور آگے بڑھنے کی جدوجہد میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ خوب حسن نظمی اور دیوان سنگھ نے مل کر ایک اخبار نکالا۔ یہ واحدی صاحب کے مکان کے ایک حصہ میں رہے جہاں اخبار کا دفتر بھی تھا۔ بھوک لگتی تو بازار سے کھانا منگوا کر کھا لیتے۔ صبح سویرے نکلنے سے پہلے اٹھ کر کام کرنے لگتے۔ اتفاق سے ایک رات واحدی صاحب ۱۰ بجے آئے تو دیکھا، دیوان سنگھ کام کر رہے ہیں۔ رات ایک بجے پھر غسل خانے جانے لگے تو دیکھا، دیوان سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے پوچھا، آخر تم کا اتنا کام کیوں کرتے ہو؟ دیوان سنگھ نے کہا ”انسان کی کامیابی زندگی کے لیے ضروری ہے وہ سخت محنت کا عادی ہو اور اپنی زندگی میں بہت کام کرے۔“

انسان محنت کرتا ہے تو اسے روپے کی محسوس نہیں ہوتی۔ ایڈیٹر ریاست کے ساتھ بھی جی پی کچھ ہوا۔ لوگوں نے قدر داری کی بنیاد پر چپ چاپ اور دل سے زبردستی مدد کی۔ ان کا کہنا تھا ”عوام کا کام کرنے والے جو لوگ کہتے ہیں کہ روپہ نہیں ملتا، وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور ان میں اخلاص اور ایمان دہاری کی کمی ہے۔ عوام کی آواز کام کرنے والوں کے ایمان اور اخلاص کا سب سے بڑا تھرمو میٹر ہے۔ عوام کی آواز بھی غلط نہیں ہوتی۔“

اس دنیائے فانی میں کوئی ہمیشہ نہیں رہتا، ایک نہ ایک دن سبھی کو جانا ہے، لیکن دیوان سنگھ منتوں کی بے باک صحافت کا قہقش آج بھی لوگوں کے دلوں میں رقم ہے۔ ان کی تحریر کردہ دونوں کتابوں، ناقابل فراموش اور جذبات مشرق کو لوگ بھلا نہیں سکے۔ حضرت مولانا عبدالرازق صاحب بیچ آبائی نے کہا تھا ”دیوان سنگھ بے شک فانی انسان ہے، کسی دن مری جائے گا مگر اس کی ”ناقابل فراموش“ غیر فانی ہے۔“

دیوان سنگھ خطوں میں لکھتے:
”مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسلام صرف عورتوں اور یتیموں کے لیے آیا تھا۔“

کرنے کو جہادوں میں سب سے افضل ترین جہاد قرار دے، ان کے بلند ہمتی پرست اور قابل احترام ہونے سے انکار کرنا کتنا قدر شرمناک اور باطل پرستی ہے۔

مولوی عبدالقیوم کے منہ سے یہ حدیث سن کر اسلام کے متعلق میرے ذہن میں انقلاب پیدا ہوا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے موقع ملا، میں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کیا اور مختلف موضوعات پر قرآن کے احکام سمجھنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ میرے دل میں گویا بعض مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر ان کے لیے نفرت ہے مگر رسول اللہ ﷺ، قرآن اور اسلام کے لیے اپنے دل میں اتنی ہی عزت اور احترام محبت کے جذبات رکھتا ہوں جتنے کہ ایک مسلمان کے دل میں ممکن ہیں۔“

دیوان سنگھ اکثر خطوں میں لکھتے ”مجھے ایسا لگتا ہے، اسلام صرف عورتوں اور یتیموں کے لیے آیا تھا۔“ عورت کی زیور حالی دیکھ کر پریشان ہوجاتے۔ کہتے عورت کی فطرت میں قدرت نے فاضی کے ساتھ رحمہ کی اور محبت کا مادہ کوٹ کوٹ کر رکھا ہے اور انسانوں ہی نہیں حیوانوں میں بھی ایسا دیکھا گیا۔ اگر مادہ رہتی فاضی کا شکار ہو جائے تو نہ زہر نہ بھگ جاتا ہے۔ اگر نہ زہر نہ کوئی لگ جائے تو مادہ ہرن اس کے قریب ہی کھڑی رہتی ہے۔ عورت کی اسی رحمہ کی اور محبت کا دوسرے لوگ فائدہ اٹھا کر اسے بدنام کرتے ہیں۔

معاون ثابت ہوتے ہیں۔ روزانہ غذا میں شامل کریں۔ سادہ اور متوازن غذا صحت مند رکھتی ہے۔ کبھی کے کباب، انار، دانہ، لہسن، پودینہ کی سلاخ کے ساتھ کھائیں۔ کبھی کا عرق بھی کھیں لوگ استعمال کرواتے ہیں۔ اس سے خون بہتا ہے۔

تارامیرا کے بیج

بیگم حمید سہیل سے تارامیرا کے متعلق پوچھتی ہیں اور ہریتر پھلکس کا علاج۔ ہمارے رسالے کی پُرانی قاری ہیں۔ گزشتہ ایک شمارے میں ”مشورہ حاضر ہے“ شائع نہیں ہوا تو بہت سارے قارئین کی طرح پریشان ہو کر فون کیا۔ تحریرت معلوم کی۔ یہ کہتی ہیں کہ ۶/۷ برس کی خاتون کا بانی بلڈ پریشر تارامیرا سے ٹھیک ہو گیا۔ وہ تازہ پانی کے ساتھ چائے کا ایک بیج تارامیرا کے بیج کھاتی تھیں۔ اب اس بارے میں مزید معلومات چاہتی ہیں۔

تاراکے کی نام ہیں۔ ترمرا بھی کہتے ہیں۔ بھجانی میں جوں ہولتے ہیں، جریج بھی کہتے ہیں۔ تارامیرا کا ساگ بھجنا میں بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ مولیٰ کے چھوٹے پتوں کی طرح کے پتے سلاخ میں شامل کیے جاتے ہیں۔ سرسوں کے ساگ میں تارامیرا کا ساگ، مالک، بھوا ڈال کر پکایا جاتا ہے، اس سے ذائقہ بہتر ہو جاتا ہے۔ تارامیرا کا تیل بھی ملتا ہے جو بہت تیز ہوتا ہے۔ حاس لوگ لگائیں تو بہت لگن اور کھلی محسوس ہوتی ہے۔ پشاور کی ایک بزرگ خاتون نے بتایا کہ ٹھوڑے سے روز بچو کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ جسم کا درد ختم ہوتا اور اس کا تیل لگانے سے خارش سے آرام آتا ہے۔ تیل لگاتے ہیں جلن کا احساس ہوتا مگر یہ جلد کے جراثیم ہلاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خارش، جھجکی کے مریض دو تین ہفتے اس کے بیج کھائیں اور اس کا تیل لگائیں تو آرام آ جاتا ہے۔ تارامیرا کے پھول پیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ذائقے میں تیزی ہے، زبان پر اکثر خارش ڈال دیتے ہیں۔ ساگ پکانے میں اس کے پھول بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ تارامیرا کا بیج اور تیل پشاور یوں کے ہاں سارا سال دستیاب ہوتا ہے۔ اس کے تیل میں کھانا بنایا یا پکڑوے کئے جائیں تو جسم کے درد میں آرام آتا ہے۔

حکیم نور احمد مرحوم معدے کی تیزابیت کے مریضوں کو تارامیرا کے لٹو یا بیڑے بنا کر کھانے کی تاکید کرتے تھے۔ بیج کوٹ کر دودھ میں پکا کر کھوایا جانے پر چینی ملا کر بیڑے بناتے ہیں۔ ایک دو بیڑے کھلا کر چائے یا کسی پینے کو کہتے ہیں، اس سے معدہ صحیح کام کرنے لگتا ہے۔ پیٹ میں بھی بھجی نہیں بنتی اور بھوک لگتی تھی۔ پُرانے طبیب تارامیرا کے بیجوں کی خاصیت جانتے تھے۔ وہ بیج پھل کر ٹھوڑے سے دہی میں ملا کر چہرے کے داغ دھبوں پر لگواتے، اس سے رنگ صاف ہو جاتا۔ تارامیرا کے بیجوں کو احتیاط سے لگائے۔ اگر زیادہ جلن ہو تو آپ فوراً منہ دھو کر غرق گلاب لگائیں۔ حکماء اسے کئی طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ خون بڑھانے، مردانہ کمزوری دور کرنے، ریح کا درد اور قبض دور کرنے کے لیے زمانہ قدیم سے تارامیرا کے بیج استعمال کیے جا رہے ہیں۔ پہلوان تیل کی ماسج بھی کرواتے ہیں تاکہ ان کا جسم سڈول اور مضبوط رہے۔ برہنہ کا علاج ڈاکٹر خالد غزویٰ کرتے تھے اور دوائیاں بھی طب نبوی ﷺ کی ہوتی تھیں۔ ان کے کلینک پر بے شمار لوگ آتے۔ آپ کسی اچھے حکیم کو دکھائیے۔ یہ ہناری بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ہو بیوی پتھک سے بھی اس کا علاج ہے۔ ہناری کا علاج موجود ہے، پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہر بیڑے کے لیے کئی لوگوں سے رابطہ کیا ہے۔ جیسے ہی کچھ پتا چلا، آپ کو ضرور بتاؤں گی۔

السر اور بھولنے کے مرض کے لیے

میرے شوہر کو السر ہے۔ وہ آج کل IR-5 استعمال کر رہے ہیں، تھوڑا سافرخ ہے۔ اس بارے میں کیا بتائیگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں باجوہ دو کوش کے سب بھول جاتی ہوں۔ اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ (اتم شفیق کراچی)

ہوتا تھا۔ چہرے کا خیال رکھا جاتا۔ سرسوں کی کھل، چنبیلی کی کھل، تلون کی کھل، بیسن، جو کا آنا وغیرہ گھر میں ہوتا تھا۔ صابن کا استعمال کم تھا۔ تلون کی کھل میں ہلدی، خوشبو ملائی جاتی، یوں گھریلو اجتن تیار ہو جاتا۔ اسی سے منہ دھوئے، نہاتے تھے، کلیننگ ملک کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ سائولی سلونی لڑکیاں، رنگت کھانے کے لیے چار پانچ پیچھے دودھ لے کر اس میں آدھے لیوں کا رس ملائیں، دودھ پیٹ جاتا تو اسے چہرے پر لگایا جاتا۔ آدھے گھٹنے بعد منہ دھو کر گلاب کا عرق لگایا جاتا۔ جس لڑکیوں کی جلد بہت خشک ہوتی، وہ ایک بڑے پیچھے بالائی میں چھوٹا پیچھے لیوں کا رس ملا کر چہرے پر لگا تھیں اور بعد میں بیسن سے منہ دھو لیتیں تھیں تو چہرہ صاف ہو جاتا۔ آپ تازہ دودھ لے کر اس میں روٹی بھجوا کر چہرہ صاف کر سکتی ہیں۔ سارا تیل دودھ سے صاف ہو جاتا ہے۔ بازار میں کئی طرح کے کلیننگ ملک ملتے ہیں۔ اچھی کھنی کا، کچھ کر خریدیے ورنہ گھریلو طور پر آپ دودھ اور لیوں والا ٹونکا استعمال کریں۔

سرورو

میری عمر ۲۸ سال ہے۔ ۱۲ بچے ہیں۔ میرے سر میں بہت درد ہوتا ہے۔ کبھی آدھے سر میں اور کبھی پورے سر میں۔ درد کے لیے روز گھٹے کوٹھا کھانڈ پڑتی ہے ورنہ میں کھر کا کام نہیں کر سکتی۔ انجمن ہوتی ہے، مجھے مشورہ دیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ (نیکمہ بھادوا)

سرورو کی وجہ ہیں۔ اسی طرح آدھے سر کے درد کا علاوہ علاج ہے۔ ہمارے ہاں گھریلو طور پر ڈسپینر درد کے لیے کھائی جاتی ہے اور درد کو سکون دینے میں کام میں لگ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں، سرورو میں زیادہ گولیاں نہیں کھانی جائیں، نقصان ہوتا ہے۔ مابعد اثرات صحت کو تباہ کر دیتے ہیں۔ آخر یہ درد کیوں ہوتا ہے۔ آپ ہر کام کو بوجھ تو زیادہ نہیں لیتیں، کمزوری اور لٹکان تو نہیں؟ اسی طرح آپ کی غذائی عادات کیا ہیں؟ آپ کیا کھاتی ہیں؟ بعض مریض کھانا وقت پر نہ کھانے سے بھی درد ہو جاتا ہے۔ اپنی غذا کا خاص خیال رکھیے۔ موٹی پھل، برسی سلاخ، خشک پھل ضرور کھائیے۔ نیند پوری کریں۔ نیند کی کمی بھی سرورو کا باعث بنتی ہے۔ سر میں ضرور تیل لگائیے۔ بادام روغن مل جائے تو رات کو کپٹنی پر ہلکی مٹی ماسج کریں۔ چائے میں دودھ کے بجائے آدھا لیوں گھوڑ کر شہد ملا کر پینے سے فرق پڑ جاتا ہے۔ آپ کسی اچھے حکیم کو دکھا کر دوائیں۔ ہمدرد مطلب جا کر دکھائیے، ان شاء اللہ آرام آجائے گا۔ آخر وٹ، بادام، سونف، وغیرہ مفید ہیں۔ بادام سونف مصری پھلں کر ہم وزن رکھ لیں، دودھ کے ساتھ صبح شام کھائیں۔ درد کی گولیاں کھانی بند کریں۔ آپ کو کوئی کھانے کی عادت ہوگئی ہے، اسے ترک کریں۔

خون کی کمی

خون بڑھانے کے لیے کون سی غذا بہتر ہے۔ خون میں سرخ ذرات کم ہو جائیں تو غذا میں کیا کھانا چاہیے؟

(مکاشان)

آپ اپنے ڈاکٹر سے غذائی چارٹ بنوائیں۔ حکیم پہلے زمانے میں بھی کھلاتے تھے تاکہ خون کی کمی دور ہو جائے۔ کبھی کے کلرے فرنی پین میں ڈالیں اور بلا سا نمک، کالی مرچ، اورک، لہسن، پٹا ہوا ملا کر تیل یا گھی ڈال کر ہلکی آٹھ پر پکائیے۔ پانی خشک ہو جائے تو آٹار کر کھائیے۔ اسی طرح آپ کبھی کو مسالے ڈال کر بھون کر اس میں تازہ میٹھی کے پتے ڈال کر پکائیے۔ کبھی اور میٹھی بہت لذیذ بنتی ہے۔ ہفتے میں ۲ بار ضرور کھائیں اور اس کا سالن بھی میزدار ہوتا ہے۔ اس میں سوگی میٹھی ڈالی جاتی ہے۔ میٹھی کا بنا ہوا سالن خون بنانے میں مدد کرتا ہے۔ سلاخ دھو کر بنائیے، سلاخ کے پتے، چنند کے ٹکڑے، کیلا، سڑا برسی، پیاز، مولی پتوں کے ساتھ اور نمناک کر رکھیے۔ بادام، شہد، جزی بڑیاں، تازہ پھل خون بنانے میں

اقبال کی سوچ کا مرکزی خیال

قیوم انصاری



”چاچا خوشیا“ نے ایک انٹرویو میں اپنے دوست ”ہالے“ اقبال کے بارے میں ایک واقعہ سنایا جس سے اقبال کی خودداری، دردمندی اور عزت نفس کا اظہار ہوتا ہے۔ ”ہالے“ سے میری لڑائی زندگی میں صرف ایک بار ہوئی۔ ہم دونوں نے دوسرے دوستوں سے چھپ کر امام صاحب کا میلہ دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ۲۰ راتے ”ہالے“ نے نہر سے لیے اور میں نے والد اور والدہ سے لڑ بھڑ کر انہی حاصل کی۔ میلے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اٹھی بھی بالے کو دے دی کیونکہ وہ پیسوں کو بڑی احتیاط سے رکھا کرتا تھا۔ میلے میں ادھر ادھر گھومنے کے بعد میں نے اُس سے کہا، بار! کچھ کھانا پینا چاہیے۔ ہالے نے مسکرا کر جواب دیا لیکن میری جیب میں تو پھونٹی کوڑی نہیں۔ میں نے تمام پیسے اندھے فقیر کو دے دیے ہیں جو رو رو کر میلہ دیکھنے والوں کو امداد کے لیے بیکار رہا تھا۔ مجھے غصہ آگیا اور میں نے درشت لہجے میں کہا، اپنا پیٹ کاٹ کر

کے فلسفہ اور شاعری کا مرکزی نقطہ اخلاقیات ہے۔ انہوں نے سیاست، معیشت اور معاشرت کے تصورات کی بنیاد ہی اخلاقیات پر رکھی۔ اقبال کے فلسفہ خودی اور ”مردمومن“ کی روح بھی انسانیات اور اخلاقیات ہی میں شہیدہ ہے۔ انہوں نے ”اسلام کا اخلاقی اور سیاسی تصور“ کے عنوان سے ایک تاریخی مضمون لکھ کر اسلام کے اخلاقی اصولوں کی وضاحت کی۔ اقبال نے اپنی ذاتی زندگی میں بھی بہترین اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ وہ شریف انفس، دیانت دار، وضع دار اور احتسرام آدمیت میں لازوال یقین رکھنے والی شخصیت تھے۔ انہوں نے نہریلو زندگی میں بھی ہمیشہ سادگی اور کفایت شاعری کا مظاہرہ کیا۔ اُن کی تعلیم و تربیت ہی صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی لہذا زندگی کی آخری سانس تک محبت اور اخوت کا مظاہرہ کرتے رہے۔

اقبال

ہمارے ایک محترم قاری ڈاکٹر سہیل محمود اکثر رابطہ میں رہتے ہیں اور کوئی نہ کوئی آزمودہ ٹوکانا بتاتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے خربوزے کے چھلے ہوئے بیج بتائے۔ تین ٹیبل سپون چھلے ہوئے خربوزے کے بیج لے کر تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر سرپل پر پھین لیں۔ پختی بن جائے گی۔ رات کو سوتے وقت اسے کھائیں اور صبح کے وقت سہلو بوٹی کا سٹوف چائے کے چھوٹے پیچھے سے ڈرا کر لے کر پانی کے ساتھ کھائیں۔ اسے آپ کپسول میں بھر کے بھی کھا سکتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ناشتا کریں۔ سہلو بوٹی پسناری کے ہاں مل جاتی ہے۔ اس کے ساتھ آپ R-5 کے قطرے دن میں بی سکتے ہیں۔ صرف خربوزے کے چھلے بیج لیے ہیں۔ چاروں مغز لیں۔ بھولنے کے مرض میں کلونجی اچھی ہے۔ ڈاکٹر سہیل کہتے ہیں، کلونجی صاف کر کے پیس کر رکھ لیں۔ رات کو سوتے وقت ایک چنگی کلونجی لے کر ایک چمچہ شہد میں ملائیں اور اسے کھائیں۔ پابندی سے کھائیں، فرق پڑ جائے گا۔ اپنی غذا میں سلا، پھل، گرمی دار میوے، دودھ، دہی، سبزی شامل کریں۔ ایک دوا خروٹ روز کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ خروٹ کی گری انسانی دماغ کی طرح اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ سردی کے موسم میں ضرور کھائیں، بچوں کو بھی دیں۔ سونف، بادام بھی اچھے ہیں، نظرتیز ہوتی ہے۔ پڑھنے والے بچوں کو میوہ جات ضرور دینے چاہئیں۔

پیٹ کی تکلیف

میری بہن پچیس سال کی ہے۔ ایک ڈیڑھ ماہ بعد اس کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ بار بار درد، مروڑ اور مت آنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر کی دوا سے آرام آتا ہے مگر پھر یہ تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بارے میں بتائیں؟ (عزیز احمد) ایک بار میرے والد کو یہی تکلیف ہوئی تھی۔ چاول کا پانی پیتے تھے۔ کھانا پینا مشکل تھا کسی کام سے مظفر نگر چلا پڑا۔ وہاں ان کا حال دیکھا تو ہماری ایک عزیز رشتہ دار نے ان کے لیے کچھ بیٹھے تیل گری کے چند دانے لا کر دیے۔ صبح شام چند تھیلے کھاتے، سات آٹھ دن وہاں رہے اور تیل گری کھاتے رہے۔ آتے وقت تیل گری کا مریا ساتھ لے کر آئے۔ ان کی پرائی تکلیف دور ہوئی۔ لاہور میں بھی تیل گری مل جاتی ہے۔ پسناری کے ہاں خشک ٹکڑے ملتے ہیں۔ اس کا شربت بھی مزے کا بنتا ہے اور کچا ہوا پھل محاسا لیے ہوتا ہے۔ تیل گری کا مریا مل جائے تو وہ لا کر بہن کو کھائیں۔ گھر بطور پر خواتین سونف کو بھون جاتی ہیں۔ اس میں ہم وزن سادی سونف ملا کر دھنیا، مصری اور تیل گری کا سٹوف ملا کر رکھ لیتی ہیں۔ دن میں تین چار بار کھانے سے آرام آتا ہے۔ اسپتال کی بجوری دہی میں ملا کر کھانے سے فرق پڑتا ہے۔ لیوں پانی بھی مفید ہے۔ یہ تو غذائی ٹوکے ہیں۔ پیٹ کی تکلیف میں جیکی علاج فائدہ مند ہے۔ آپ کسی اچھے دوا خانے جا کر بہن کو دکھائیں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

جما ہوا شہد

میرے پاس شہد کی بوتل ہے۔ سردی میں شہد جم گیا ہے۔ مجھ ہوئے شہد کو کیسے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ بتائیے؟ (زرینہ عمران) کسی برتن میں پانی گرم کریں۔ اس میں شہد کی بوتل رکھیں۔ پانی کی حرارت سے شہد آہستہ آہستہ پگھل جائے گا۔ آپ اسے استعمال کر سکتی ہیں۔ شہد نکال کر براہ راست گرم نہ کریں۔ سردیوں میں عام طور پر شہد جم جاتا ہے۔ اب تو بازار میں جیم کی شیشی کی طرح شہد ملتا ہے۔ آپ آسانی سے نکال سکتی ہیں۔ شہد پگھل جائے تو اسے خود کی جیم کی شیشی میں ڈال دیجیے۔



جو محمد حرم کرے میں اسے پاس سے دوں، میرا بلونا ذکر الہی کے لیے ہو، میری خاموشی گورنگ کے لیے ہو، میرا دیکھنا عبرت حاصل کرنے کے لیے ہو۔“

(عبدالواحد عینی: مقالات اقبال صفحہ ۲۳۸)

☆☆

نواب آف بھوپال کی اقبال کی بیماری اور مالی مشکلات کے پیش نظر ان کا ۵۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تو سرگنا خان اور دوسرے اصحاب نے بھی اقبال کو مالی معاونت کی پیشکش کی۔ اقبال نے سر اس مسعود کے نام خط تحریر کیا۔

”اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوں اور روپے کا لالچ کسی طرح بھی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے مجھے اس رقم کو قبول کرتے ہوئے قناعت ہے۔“

(فتح نظام الدین: اقبال نامہ صفحہ ۳۷۳)

☆☆

اقبال کی ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کی زندگی میں اخلاقیات کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ ”میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو، وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسول ﷺ کو مدنظر رکھیں تاکہ جذبہ تقلید اور جذبہ عمل قائم رہے۔ دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا ”میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اہتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“

اس لیے علما کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوش گوار ہو جائے اور اتباع سنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے۔“

(آقبال اقبال صفحہ ۳۰۶)

☆☆

”اسلام میں اخلاقیات کی پہلی فضیلت یہ ہے کہ وہ انسان کو ہر طرح کے خوف سے نجات دلائے اور اس میں اس کی اپنی شخصیت کا احساس پیدا کرے اور اسے باخبر کرے کہ وہ قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہ خیال کہ انسان اپنی انفرادی حیثیت میں لاحدود قوت کا حامل ہے، اس میں نیک ہونے کا وثوق پیدا کرتا ہے اور جو چیز اسے کمزور کرتی ہے وہ بری ہے۔ راست بازی قوت ہے، طاقت ہے اور بدنی کمزوری ہے۔ انسان کو اس کی اپنی شخصیت کی عزت کا گہرا احساس دے دو۔ اسے خدا کی بے پایاں زمین میں خوف سے آزاد رہنے دو تو وہ دوسری شخصیتوں کی بھی عزت کرنے لگے گا اور وہ ایک راست باز باعفت بستی بن کر ابھرے گا۔“

(لیفٹ برٹھاقبہ Speeches and Writings of Iqbal صفحہ ۹۱)

”دوسرا اخلاقی اصول یہ کہ انسان آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ غنی و دارفرد ہے۔ وہ اپنی تقدیر کا خود مالک ہے اور اپنی اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسرا مداخلت کا نہیں ہے۔“

(لیفٹ برٹھاقبہ Speeches and Writings of Iqbal صفحہ ۹۲)

اقبال نے پروفیسر تھامسن کے نام ایک خط میں تحریر کیا کہ:

”آپ اطمینان رکھیے! خالص سیاسیات میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری دلچسپی دراصل اسلام بحیثیت ایک اخلاقی نظام میں ہے جس نے مجھے سیاسیات کی طرف دھکیل دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہندویشیزم بالآخر اتحاد کی سمت لے جائے گا اور میرے علم کے مطابق مسلمان اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے سبب اس

نام نہادیشیزم کے سیلاب میں نکلنے کی طرح بہہ جائیں گے۔ ان حالات میں میرا فرض ہے کہ آگے بڑھوں اور یہی نسل کے سامنے اسلامی تعلیمات کے حقیقی معانی رکھ دوں۔ میں خوش ہوں کہ انہوں نے میری بات سن لی ہے اور انگریزوں نے بھی کچھ حد تک اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور انہیں اپنے اصولوں کے مطابق آزادانہ ترقی کے کے مواقع ملنے چاہئیں۔“

(اقبال کا تھامسن کے نام خط ۱۵ جون ۱۹۳۱ء زندہ رود صفحہ ۳۸۲)

☆☆

اقبال نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں حضور اکرم ﷺ کے اخلاق اور کردار کے بارے میں تحریر کیا:

”رسول اکرم ﷺ بڑے بے تکلفانہ انداز میں عام لوگوں سے میل جول رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کے کردار میں دوسروں سے بالاتر ہونے میں کوئی امتیازی علامت موجود نہ تھی۔ عوام کے ساتھ آپ ﷺ کا ربط ایسا تھا کہ جب کوئی اجنبی مسجد میں مسلمانوں کے اجتماع میں آتا تو اسے دریافت کرنا پڑتا کہ ”تم میں سے محمد ﷺ کون ہیں۔“ آپ ﷺ بطور محبران اپنے پکڑے بینا، اپنے جوئے مرمت کرنا، اپنی پیکریوں کا دودھ دہنا، اپنے گھر کی صفائی کرنا اور امور خانہ داری میں اہل خانہ کا ساتھ بنانا اپنی کسر شان نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ سفر میں تھے۔ جب کھانا پکانے کا وقت آیا تو ہر شخص نے اپنے حصے کا کام سنبھال لیا۔ رسول پاک ﷺ بھی اس کام میں شریک ہوئے اور لکڑیاں جن لائے۔ جب آپ ﷺ کے پیروکاروں نے کہا کہ آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تو آپ ﷺ نے واضح طور پر جواب دیا کہ مجھے اپنے حصے کا کام کرنا ہی چاہیے۔“

(عبدالواحد عینی: مقالات اقبال صفحہ ۳۵۷)

☆☆

”دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ”بہشت

لاتمسه مکام الاخلاق“ یعنی میں نبییت اعلیٰ اخلاق کے اقام کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے علما کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوش گوار ہو۔ حضرت مولانا روم بازار میں جا رہے تھے۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان سب نے مولانا کو سلام کیا اور مولانا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لیے دیر تک کھڑے رہے۔ ایک بچہ کچھ دور کھیل رہا تھا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا، حضرت! ابھی جا جائے گا نہیں۔ میرا سلام لیتے جا جائے تو مولانا نے بچے کی خاطر دیر تک توقف فرمایا اور اس کا سلام لے کر گئے۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ نے بچے کے لیے اس قدر توقف کیا، کیا آپ نے فرمایا اگر رسول اللہ ﷺ کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضور اکرم ﷺ بھی یوں ہی کرتے۔“

(عبدالواحد عینی: مقالات اقبال صفحہ ۳۳۰)

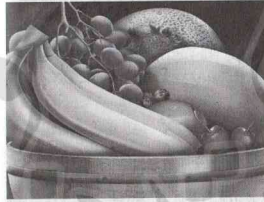
اقبال نے اخلاقیات کے سہری اصولوں کو اپنے ان اشعار میں بیان کیا:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں
بنوں میں پھرتے ہیں مادے مانے
میں اس کا بندہ بنوں گا
جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

تمیز بند و آقا فساد آہستہ ہے
حذر اسے چہرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغناء
دل بیدار پیدا کر دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاہی نہ میری ضرب ہے کاہی
آہ وہ مردان حق! وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم، صاحب صدق و یقین

اُردو ڈائجسٹ کا ایک اور قابل قدر سلسلہ



وزن کم کریں مگر صحت نہیں

نوشین ناز

ہمیں آپ کی صحت ہی کی نہیں وزن کی بھی فکر ہے

آج کی خوبصورت، کامیاب اور لمبے پختہ مصروف زندگی میں ہر کام کے لیے وقت مل جاتا ہے، سوائے اپنی صحت اور وزن پر دھیان دینے کے۔ پھر جب جوڑوں کے دور کو، گروں کے اسمراس جیم کا راستہ دیکھ لیتے ہیں تو صحت اور خوش رہن مشکل ہو جاتا ہے۔ صحت از ماہر شہناز انیسٹ نوشین ناز صاحبہ نے ہماری درخواست پر اس سلسلے کو بات احمدی کے کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے

”زندگی میں محنت کرنا کمال نہیں بلکہ مسلسل محنت کرنا کمال ہے“

یہ اصول اپنی زندگی میں جہاں بھی لاگو کریں گے، ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ ہمارا مشاہدہ بھی ہے اور ذاتی تجربہ بھی۔ بالکل اسی طرح ایک دن اچھی غذا کھانا کمال نہیں بلکہ روز بہ روز زندگی کی طرف بڑھنا کمال ہے اور یہ اچھی متوازن غذا سے ہی ممکن ہے، ورنہ غذا سے صحت ملتی ہے نہ خوشی۔ بالکل یہ کیفی اور ناخوشی جسے میں آتی ہے۔ اسی طرح یوں سمجھئے کہ ایک دن سخت ورزش یا فوڈ پلان پر چلنا واقعتاً کوئی کمال نہیں ہے۔ بلکہ تھوڑی تھوڑی مسلسل محنت کرنا اور روزمرہ کی کمال بھلانے کا اور اسی کا آپ کو فائدہ ہوگا۔ آپ ارادہ کر لیں، ان شاء اللہ ارادے کی تکمیل کا راستہ دکھا دیں گے۔ مدد کے لیے ہم آگے کھڑے ہیں۔ پہلے اس ماہ کے چند منتخب سوال اور مسائل پھر ہمارے مشورے اور حل۔

وزن اتنا بڑھ گیا کہ خوف آتا ہے (نورین - لاہور)

میری عمر ۳۴ سال ہے۔ میرا وزن ۱۰۰ کلو گرام اور قد پانچ فٹ چار انچ۔ میں نے ڈیڑھ سال قبل سخت جم اور کم کھانے سے ۵۰، ۱۰ کلو گرام کم کر لیا تھا۔ یہ ایک کریش پروگرام تھا جس کی مدد سے میں نے وزن کم کیا۔ پھر میں نے اپنے شوہر کی بیماری کی وجہ سے جم اور ڈائٹ چھوڑ دی اور اب میرا وزن پھر سے اتنا بڑھ گیا ہے کہ خوف آتا ہے۔ میرے کھانے کا معمول یہ ہے۔ میں صبح چائے اور بریڈ لیتی ہوں۔ پھر ۱۰ بجے چائے نمکد وغیرہ لیتی ہوں۔ دوپہر کو کھانا پیٹ بھر کر کھاتی ہوں چاہے وہ بریانی ہو یا پھر کچرے کے چاول۔ شام میں چائے لیتی ہوں اور پھر رات میں ٹھیک ٹھاک کھانا کھاتی ہوں۔ میں ہر وقت کی ڈائٹنگ سے تنگ آ گئی تھی کیا کرتی۔

جواب: نورین آپ کا مسئلہ سب سے پہلے لینے کا مقصد یہ تھا کہ یہ بتایا جاسکے، آپ نے جس طرح کے کریش پروگرام پر عمل کر کے پندرہ میں کلو وزن کم کر لیا، وہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے منفی نتائج دیکھتے پڑتے ہیں۔ ڈائٹ کا مقصد یہ نہیں ہونا کہ خود کو کوئی غیر مرئی مخلوق بنا لیا جائے اور الگ سے کوئی دنیا بنا لی جائے۔ گھر کے سب افراد جو کھا رہے ہیں، آپ ان نعمتوں سے محروم رہیں، یہ نیچر نہیں۔ یہ حسرت بھی بڑھاتا ہے اور رد عمل بھی پیدا کرتا ہے۔ آپ کا ڈائٹ پلان دیا جا رہا ہے، اُمید ہے کہ مسلسل عمل کرتی رہیں گی تو ان شاء اللہ وزن کم کر لیں گی۔

صبح (1) 6:00AM Meal اور خج

(2) 7:00AM Meal لیونس پانی اور اسپنول چھلکے کے ۲ چمچ

(3) 9:00AM Meal پانی اور اٹھ اور چائے

(4) 11:00AM Meal ایک پیالہ سبز ابری (پاؤ بھر)

(5) 1:00PM Meal گھر کا بنا سائمن اور فور گرین آنے کی ایک روٹی + ایک سلاک پیالہ

(6) 4:00PM Meal چائے + ایک بسکٹ

(7) 6:00PM Meal دودھ کی پیالی

(8) Meal گھر کا بنا سائمن + ایک روٹی استعمال کریں۔ لٹچ اور ڈز کے بعد گرین ٹی کا استعمال کریں۔

زچگی کے بعد سے بڑھا ہوا وزن (کرن - بمبیرہ)

وزن ۹۵ کلو گرام ہے۔ پانچ فٹ قد اور عمر ۳۳ سال ہے۔ یہ پوسٹ ڈیوری ویت ہے۔ صبح ناشتے میں پرٹھا، اٹھ۔ دوپہر گھر میں بنا جو کھا اور اسی طرح رات کا کھانا کھاتی اور وقت چھٹی رہتی ہیں۔ سستی اور تنگی بہت زیادہ ہے۔

جواب: ڈیزیز کرن آپ کا وزن زیادہ اور انرجی لیول کم ہے۔ آپ کو فوڈ کوئی ملٹی وٹامن استعمال کرنا چاہیے۔ صبح ناشتے میں سادہ روٹی کر دیں۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے اسٹیک ٹائم میں ایک پیالی دہی استعمال کریں۔ دوپہر کھانے سے پہلے ڈیڑھ کپ پانی پئیں۔ نماز سلاک کا استعمال کریں اور گھر کے بنے سائمن کے ساتھ ایک چٹائی استعمال کریں۔ اسی طرح شام کے اسٹیک میں پھل استعمال کریں اور رات بھی لٹچا کھانا استعمال کریں۔ لٹچ اور ڈز کے بعد گرین ٹی کا استعمال کریں۔

ایک گھنٹہ برسک واک (خیر چال قدمی) کریں۔ دن بھر پانی معمول سے زیادہ پیئیں۔ پانچ وقت کی نماز بہت ٹھیک رکوع سجدے سے ادا کریں۔ یوگا کے سارے پوز نماز پڑھنے سے بنائے گئے ہیں۔ اگر آپ نماز ٹھیک سے پڑھتے ہیں تو ایسا کم ہی ہو سکتا ہے کہ کسی کی توند بھر نکلتی آئے۔ آپ سب کے لیے میں ایک ایسی بات شیئر کرتی ہوں کہ آپ سب کو پیارے اللہ پر بے حد پیار آئے گا۔

ایک حیران کن بات وضو کے حوالے سے

بیرون ممالک میں ڈھیروں پاگل خانے ہیں۔ اسی طرح نفسیاتی ادارے ہیں اور وہاں مریضوں کی تعداد روز بروز بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن یہی آپ نے اپنے ملک میں پاگل خانے گئے ہیں؟ نفسی کے چند پاگل خانے ہیں۔ اس کی وجہ ہے ہمارا کوڈ آف لائف اللہ کی راہنمائی ہے۔ مثلاً ”وضو“ کو بھی لیجیے۔ یہ خجراتی اثر کی حامل عبادت ہے۔ یہ وہ واحد چیز ہے جو ہمیں جنونی ہونے سے بچاتی ہے۔ باہر کے ملک میں جنونی مریضوں کے علاج میں ریکورڈ میں پُر گردن کے پیچھے روزی پڑنے سے کیا کیا جاتا ہے۔ ہمارے پانچ وقت وضو میں مسح وہ چیز ہے جس میں سر کے بعد گردن گیلی ہوتی ہے۔ یہی چیز ہمیں جنونی ہونے سے بچاتی ہے۔

اگر ہم پانچ وقت وضو کرتے ہیں تو ہم کبھی جنونی نہیں ہوتے چاہے جنون کسی نفسیات کی گرہ ہو یا پھر کھانے کا جنون۔ چ تو یہ ہے کہ اپنی زندگی کو جتنا آپ رب رحمان کے بتائے طریقوں کے مطابق کریں گے، اس کے دیے ہوئے کوڈ آف لائف کے قریب کریں گے، اسی قدر آپ کا سایہ رہیں گے، صحت مند رہیں گے۔

ناروے والے انکل سے معذرت

ناروے سے ایک انکل کی کال آئی تھی۔ ان کی ہسٹری کبھی تھی مگر ہو گئی۔ اگر آپ دوبارہ رابطہ کریں تو آپ کا پلان ان شاء اللہ گاہ آجائے گا۔ اللہ آپ سب کو صحت کی نعمت اور زندگی کی آسائیاں عطا فرمائیں۔

سب قارئین سے التماس تھی کہ فون 03014585405 پر رابطہ کلینک پر مشورے کا نام ۱۲ بجے دوپہر سے ۲ بجے تک تھا۔ یہ ہر بار بہت وضاحت سے لکھا اور بتایا۔ پریشانی جب عرب پر پہنچی جب رات کے ذیہ دو بجے کال آئے لگیں۔

یہ بہر حال میرے کلینک کا وقت نہیں ہوتا۔ پہلی کال پر معذرت کرتے ہوئے میں نے پہلی بار سوچا Was it a joke? لیکن جب یہ سلسلہ مسلسل سامنے آیا تو حیرت کے ساتھ پریشانی ہوئی کہ آدھی رات کو کون مشورہ کر سکتا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ۱۲ بجے کا انتظار کر رہی تھی۔ آنکھ لگ گئی اب آگتے ہی کال کر دی ہے۔ پھر وہ مشورے کے لیے بھی مصر تھیں۔ اس لیے آئندہ سب قارئین سے التماس ہے کہ آپ اپنا مسئلہ SMS کر دیا کریں۔ اس کے لیے دن اور رات کا وقت مخصوص نہیں ہے۔ جو بھی مجھے وقت ملے گا، جواب دے دیا کروں گی۔ آئندہ سے کال سننے کے لیے میری طرف سے معذرت ہے۔ امید ہے کہ آپ سب میری پریشانی سمجھ چکے ہوں گے۔ اکثر لوگ جس وقت ان کا بلی چاہے، کال کر لیتے ہیں۔ پھر اصرار کرتے ہیں کہ کارڈ وڈ انجسٹ والے ہیں۔ ہمارا مسئلہ ابھی حل کرو۔ کیا تو باقاعدہ ”تزیان“ لگائے لگ جاتے ہیں کہ مشورے کا وقت نہیں ہے تو کیا ہوا، ہم نے فون تو کر دیا ہے۔

سارا دن فاقہ وزن پھر بھی کم نہیں (سدرہ)

سکات لینڈ سے تھیں۔ وزن ۱۱۰ کلو گرام تھا۔ ۳۴ رسال ہے۔ قد ۵ فٹ تھا۔ وہ سارا دن فاقہ کا تاقی ہیں لیکن وزن کم نہیں ہوتا۔ زیادہ وزن کی وجہ سے بچے بھی نہیں ہو رہے۔

جواب: یہ درست ہے کہ اولاد کے نہ ہونے کی ایک وجہ عورت کا بے حد موٹا ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ آپ فوراً اپنا لائف اسٹائل بدلیں، اپنے کاد خود کریں، لفٹ کے بجائے سیرجیوں کا استعمال کریں۔ اپنی زندگی میں سے جبک فوڈ نکال باہر کریں تاکہ آپ کی خوشیاں واپس آسکیں۔ ناشتے میں پھلوں کے رس یا ٹماٹر کارس، ابلانہ۔ چائے اور کافی بغیر چینی کے،

۲۶۰ انڈو انجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

اگر دودھ ڈالنا ہے تو سسڈ ملک ڈالیں۔ مذہب میں ایک سبب لیں۔ میں بھی ایک گلاس لینن واٹر+ اسپول کا چمکالیں + انڈہ ابلانہ ہوا یا نیم ابلانہ ایک عدد سسڈ ملک ایک گلاس، سلاواؤس۔

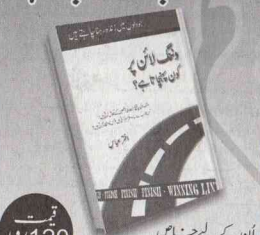
شام کی جائے جیکٹ یا پھر گریپ فروٹ کا رس لیں۔ ڈنر کے لیے سلاڈ چمک اور سرکے کے ساتھ ۳ راؤس، براؤن ڈیل روٹی ایک عدد سلاؤس، کھیر ایک عدد، گوشت چار چری کی ۹۰ گرام یعنی ایک دو یوٹیاں گریزین کی رات سوتے میں لیتی ہے۔ ان شاء اللہ وزن کم ہوگا۔ بخود نہ رہیں، پانچ وقت کی نماز اور دعا کریں۔ خوش رہیں۔ اللہ جی آپ کو اولاد عطا فرمادے ضرور دیں گے۔ کس سٹریس (Stress) نہ لیں، سٹریس سے بھی وزن بڑھتا ہے۔

اپنے مسائل اگر لکھ کر بھیجیں تو اور بھی اچھا ہے۔ نام، عمر، قد، وزن، صحت کی کوئی منتقل یا عارضی خرابی۔ کسی کریٹش پر مگر ام کے تحت وزن کم کیا ہوا یا ادویات استعمال کی ہوں وزن کم کرنے کے لیے، ان کا ضرور بتائیے۔ اپنے ڈاکٹر اور یونیورسٹی کنسلٹنٹ سے کوئی معمولی بات بھی نہیں چھپانی چاہیے۔ فوڈ پلان کا معاملہ تو ایسا ہے کہ یہ صحت، قدم عمر اور جنس کے اعتبار سے تجویز کیا جاتا ہے، بھی زیادہ مفید ہوتا ہے۔



”چھٹا ہواؤدھ“ ”مسامارٹا“ اور ”مٹاموٹی پیچھوڑ“
پچھوڑتے ہوئے فون نمبروں کے بعد
فائل کے اختراع سب کی ہی کتاب
نہال سلیم کا

ونگ لائن پر کون پہنچتا ہے؟



آپ کے لیے حس
جو دنوں میں
زندہ رہنا چاہتے ہیں
ادارہ مطبوعات طلبہ
۰۴۲-۳۷۵۵۳۹۹۱

آپ کے بچوں کے لیے
کبھی گئی محبت بھری کتاب

آداب زندگی کی

35000

کاپیوں کی اشاعت مکمل ہونے پر ہم فاضل مصنف

جناب اختراع سب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں

نیٹس کے لیے ان کی دیگر پینڈ کی جانے والی بہترین کتابیں،
جو والدین اور استاد بھی اپنے بچوں کو بخشنا دیتے ہیں

- ★ جملہ صحت
- ★ دہ آسو
- ★ تین گول
- ★ سن سہار
- ★ پہلے باز
- ★ آؤ گرواؤ
- ★ دس کی پہلی بات بچوں کی
- ★ دس کی پہلی سزا
- ★ کبھی بھری کسانیاں
- ★ فریڈ سٹریٹ
- ★ فٹن کسان سے آئی
- ★ سدرہ کی

۲۶۱ انڈو انجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

انچارج کوئٹہ: حافظ فراز

[illegible]

جوابات بھیجئے کا پتہ: مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

[illegible]

گزشتہ ماہ کے
درست جوابات

سوال (۱) (الف) طارق بن زیاد (ب) اندلس
سوال (۲) (الف) گاما پہلوان (ب) امرتسر
سوال (۳) (الف) کیپٹن محمد ورشید (ب) نشان حیدر

قرعہ اندازی کے ذریعے مارچ ۲۰۱۲ء قصہ کوئٹہ میں انعام پانے والے خوش نصیبوں کے نام

۱۔ ہادیہ عدنان، معرفت لطیفینٹ کرل عدنان اجمیل، ۷۷-۷۸، بلوچ، کشور کینٹ، کشور

۲۔ محسن حبیب، مکان نمبر ۲۶۱، گلی نمبر ۵، پشتی پارک، چک رب/۲۲۳، فیصل آباد

سلطنت آسٹریا و ہنگری کا فرماں روا آرچ ڈیوک
فریڈرک، صوبہ بوہیمیا کے دارالحکومت سراہوو کی ایک
سڑک پر اپنی گاڑی میں بیٹھا جا رہا تھا۔ اثناء میں ایک
سرچرے سے رہائی آنے والی پندو جوان نے تانے کا کر ایک
فائرنگ اور فرماں روا کی لمبے جاں بچ ہو گیا۔ یہ ایک
موت مندی ہی جیتی جانوں کے زیاں کا باعث بنی۔
دیکھتے ہی دیکھتے ایک سے دوسرے ملک جنگ کی آگ
پھینکنے لگی۔ اس جنگ میں ایک کرڈ سے زیادہ ہلاکتیں
ہوئیں جبکہ دو کرڈ سے زیادہ انسان ناکارہ ہو گئے۔

(الف) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس واقعے کے نتیجے میں کون سی جنگ کا آغاز ہوا؟
(ب) اس جنگ میں فاتح کون تھا اور مفتوح کون؟

دشمن کا لشکر بہت زیادہ تھا اور لشکر بھی ایسا کہ پہلی رو
سداہائے ہوئے جنگی اہلیات کے تھے جن کا مقابلہ آسان نہ
تھا۔ کانڈر کو اس تھا کہ اس کی فوج قلیل سے اور مقابلہ
انتہائی سخت۔ اس نے سوچ بچار کے بعد حکمت عملی وضع کی
اور جنگ کو اندھا ہونے تک روکے رکھا۔ اندھیرے کی
سایا چاروں طرف پھیل گئی تو اس نے ایک عجیب و
غریب کام کیا۔ بہت سے بیلیوں کو جمع کیا اور ان کے
میتلوں پر کیڑوں کے گھسے اور گھاس پھوس باندھ کر آگ
لاگادی۔ آگ کے شعلے پھڑکے تو بیلیوں کو دشمن کے لشکر کی
طرف بھاگا۔

سنگلوں پر بھڑکتے شعلے لیے ہوئے یل جب دشمن کی طرف بھاگے تو دشمن ہولکا گیا۔ رات کے اندھیرے میں بڑی بڑی مشکل لیے یہ کون پوری قوت سے بھاگا چلا آ رہا ہے؟ اگر بڑی دشمن تو شہد تھائی خود اس کے لشکر کے ابھی بھی ہولکا لیے اور اپنے حواس باختہ ہوئے کہ پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے ہی سپاہیوں کو کچل دیا۔ بیلوں کے دماغ

جب آگ کی شدت سے جلنے لگے تو وہ بھی پاگل ہو گئے اور دشمن کے لشکر میں ایسے آگے پیچھے ہوئے کہ دشمن تڑپتا رہ گیا۔ ساری صف بندی ختم ہو گئی۔ یوں ایک ذہین کمانڈر نے گور یا جنگ کا حربہ آزمایا دشمن پر قابو پایا۔

(الف) اس عسکری لیڈر اور بہادر کمانڈر کا نام بتائیے؟

(ب) اس حکمران اور جرنیل کا بیٹا بھی حریت پسند مجاہد تھا، اس کا نام بھی بتائیے؟

(۱) بچہ پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ ماں سے بچہ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ماں اس پہاڑی سے لے کر اس پہاڑی تک کہاں کہاں نہیں دوڑتی کہ کسی طرح بچہ کے لیے چند گھونٹ پانی میسر آجائے۔ بچہ بلکہ ایک کرو رہا ہے۔ اس کیفیت میں ماں کا کچھ پشنا جا رہا ہے۔ اس کی کچھ نہیں آ رہا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

اے میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوتا ہے۔ بظاہر
مقابلہ نقیضین گرد مرسل حقیقت۔ بچہ جس جگہ پر لیٹا ہوا
رہا ہے، وہیں ایزیاں لرڑنے کی جگہ زمین سے پانی
بھٹوت پڑتا ہے۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے
چمک اٹھتی ہیں۔ وہ سچے کو پانی پاتی اور اس عین غیب پر
سے حد شکر گزار ہوتی ہے۔ پانی کا وہ چشمہ آج بھی لاکھوں
لوگوں کو سیراب کر رہا، لوگ اس پانی کو آبِ شفا سمجھتے،
تعظیم سے پیتے، احترام سے اٹھاتے ہیں اور رکھتے ہیں۔
اس پانی کا تختہ دنیا اور لیٹا عثِ سعادت سمجھا جاتا ہے۔

(الف) اس پانی کو آپ اور ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

(ب) اس ماں اور بچے کا نام بھی بتائیے جن کی وجہ سے چشمہ پھوٹنے کا واقعہ ظہور پذیر ہوا؟

(قصہ کوثر کے تخلیق کار جناب سلیم مغل ہیں)

آرڈوڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۳ء ۲۶۳

کھیلوں کی دنیا

رانا محمد شاہد

واٹس ور..... ۱۶/۱۶ لاکھ ۲۰ ہزار روپے
ماہانہ کے عوض کوچنگ

دلبرداشتہ عاقب جاوید
(متحدہ عرب امارات کے ہیڈ کوچ)

پاکستان کرکٹ ٹیم کے سابق باؤلنگ کوچ عاقب جاوید نے متحدہ عرب امارات کرکٹ ٹیم کے ہیڈ کوچ کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ ذرائع کے مطابق سابق ٹیسٹ کرکٹر عاقب جاوید اپنے اہل خانہ کے ہمراہ دہلی روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے متحدہ عرب امارات کرکٹ بورڈ حکام سے ملاقات کی اور ۱۲ سالہ کنٹریکٹ پر دستخط کر دیے۔ عاقب جاوید کو یو اے ای بورڈ نے ۱۵ ہزار ڈالر تنخواہ اور دیگر مراعات کی پیشکش کی تھی جسے قبول کرنے کے بعد انہوں نے پاکستان کی کوچنگ سے استعفیٰ دے دی۔ عاقب جاوید بی بی سی نے ۱۱ سال تک شملک رہے اور ماہانہ ۱۲ لاکھ روپے تنخواہ وصول کرتے تھے۔ عاقب جاوید کو سابق پاکستانی کرکٹر کبیر مینڈا کی کوچنگ مقرر کیا گیا۔

اڑانے کا عالمی ریکارڈ

امریکی نوجوان نے ۲۲۶ ریفٹ کے فاصلے تک کانفیڈ طیارہ اڑا کر عالمی ریکارڈ اپنے نام کر لیا۔ کانفیڈ طیارہ اڑانے کا یہ دلچسپ مقابلہ امریکی شہر سائمریٹھو کے قریب ایئر فورس اڈے پر ہوا۔ وہاں جوئے ایوب نامی نوجوان نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کانفیڈ طیارہ ہوا میں بلند کیا تو اس کی پرواز دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ طیارے نے جب ۲۲۶ ریفٹ اور دس انچ کا فاصلہ

سابق آسٹریلیوی ٹیسٹ کرکٹر، سری لنکا اور بنگلہ دیش کے سابق کوچ ڈیوڈ امور نے پاکستانی کرکٹ ٹیم کے نئے کوچ کا عہدہ سنبھال لیا۔ ان کے معاہدے کی مدت دو سال ہوگی۔ ڈیوڈ امور کو ماہانہ ۱۸ ہزار ڈالر تنخواہ کے علاوہ بلٹ پروف گاڑی، سفری سہولیات اور فائینسار ہائش بھی دی جائے گی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۳۶ء میں کلہو میں پیدا ہونے والے ڈیوڈ امور نے آسٹریلیا کی جانب سے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز ۱۹۷۹ء میں پاکستان کے خلاف بلیرن میں کھیلے گئے ٹیسٹ سے کیا۔ یہ وہی ٹیسٹ ہے جس میں سرفراز نواز کی تباہ کن باؤلنگ کی بدولت پاکستان نے ۱۱ رنز سے کامیابی حاصل کی۔ سرفراز نواز نے اس ٹیسٹ کی دوسری اننگز میں ۹۶ رنز دے کر ۴۹ آسٹریلیا کے بولرز کو پویلین بھیجا اور پاکستان کو ناقابل یقین فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ ڈیوڈ امور نے آسٹریلیا کی جانب سے ٹیسٹ میں ۲۲،۵۳۳ کے اوسط سے ۲۹۳۳ رنز سکور کیے۔ ان کا بہترین سکور ۷۷ رہا۔ انہوں نے اپنے واحد ایک روزہ میچ میں ۲۳ رنز سکور کیے۔ بحیثیت کوچ وٹامور کی وجہ شہرت سری لنکا کو ۱۹۹۶ء کا ورلڈ کپ جیتوانا ہے۔ ڈیوڈ امور سے پہلے جنوبی افریقہ کے رچرڈ ڈائی بس، جنوبی افریقہ کے بی باب وولمر اور آسٹریلیا کے جیف لائن بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کوچ رہ چکے ہیں۔

لے کیا تو نوجوان کی انتہائی خوشی کا کہنا تھا۔ کانفیڈ طیارہ اڑانا تو معمولی بات ہے لیکن عالمی ریکارڈ اُن کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس سے پہلے یہ اعزاز ان کے ایک ہم وطن کے پاس تھا۔

ویسٹ انڈین بلبے باز
ٹریننگ حادثے میں ہلاک

ویسٹ انڈیز کرکٹ ٹیم کے مایہ ناز بلبے باز رونا کو مارٹن ٹریننگ حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ ویسٹ انڈین میڈیا کے مطابق بلبے باز رونا مارٹن ایک ٹریننگ حادثے میں شدید زخمی ہوئے تھے۔ مارٹن کی گاڑی تیز رفتاری کے باعث سڑک کنارے لگے کھجے سے ٹکرائی گئی۔ جس سے گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ مارٹن کو مقامی ہسپتال کے انتہائی عمدہ دشت کے وارڈ میں منتقل کیا گیا جہاں وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے۔

کرکٹ کیریئر..... ۱۹ کھلاڑی حادثات
ویناریوں کے بھینٹ چڑھے

کرکٹ کیریئر کے دوران اب تک ۱۹ کھلاڑی مختلف حادثات و بیناریوں کا شکار ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں انگلینڈ کے ۱۹ سالہ فریڈرکس ٹومونا، ۱۹۲۸ء میں انگلینڈ کے ۳۷ سالہ رولے کلیر معادی بخار، ۱۹۳۰ء میں انگلینڈ کے ۳۱ سالہ ڈوڈ کیوسل بلڈوزنگ، ۱۹۳۳ء میں آسٹریلیا کے ۳۳ سالہ آرکی جیکسن تپ دق، ۱۹۳۵ء میں جنوبی افریقہ کے ۳۰ سالہ جوک ٹیرون ٹامپاٹیک کا شکار ہوئے، ۱۹۳۸ء میں ویسٹ انڈیز کے ۲۳ سالہ کیرل کرستینی ٹیلیریا، ۱۹۴۱ء میں انگلینڈ کے ۳۰ سالہ کین فارض ہجاز کے حادثے، ۱۹۵۲ء میں جنوبی افریقی ۳۱ سالہ فی ٹین کینز، ۱۹۵۵ء میں بھارت کے ۳۱ سالہ کین سدا شوشندے ٹامپاٹیک، ۱۹۵۹ء میں ویسٹ انڈیز کے ۲۶ سالہ کولی اسمتھ کا حادثہ، ۱۹۷۶ء میں نیوزی

لینڈ کے ۲۹ سالہ لین واڈ سوتھ جلدی سرطان، ۱۹۸۰ء میں سری لنکا کے ۲۳ سالہ سٹیو ڈی سلوا موٹر سائیکل حادثے، ۱۹۸۹ء میں ۳۳ سالہ انگلینڈ کے ولف سلک دوران میچ کرنے، ۱۹۹۸ء میں بھارت کے ۳۸ سالہ رامن لامبا گیند لگنے، ۲۰۰۱ء میں زمبابوے کے ۲۳ سالہ ٹریور رادونڈو ملیریا، ۲۰۰۲ء میں انگلینڈ کے ۲۳ سالہ ٹین ہولینک کار حادثے، ۲۰۰۷ء میں بنگلہ دیش کے منظور اسلام رانا موٹر سائیکل حادثے اور ۲۰۰۸ء میں نیڈرلینڈ کے ۲۵ سالہ مورس وان ٹیروپ بلندی سے گرنے کی وجہ سے چل بسے تھے۔

جراثیم کے ڈر سے ہاتھ
نہ ملانے کی تجویز مقرر

برطانوی حکومت نے جراثیم سے محفوظ رہنے کے لیے لندن اولمپک گیمز کے دوران زیر بان کھلاڑیوں کو حریف کھلاڑیوں سے ہاتھ نہ ملانے کی تجویز مقرر کر دی ہے۔ یہ تجویز برٹش اولمپک ایسوسی ایشن کے چیف میڈیکل آفیسر ای بی میک کرڈی نے حفظان صحت کے اصولوں کو بنیاد بنا کر دی تھی۔

لیبیا میں بائسنگ کے کھیل پر پابندی ختم

لیبیا میں سابق صدر قذافی کی ۳۸ سالہ پابندی ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر بائسنگ کا کھیل شروع ہو گیا ہے۔ لیبیا میں سابق صدر معمر قذافی کے دور حکومت میں بائسنگ کے کھیل پر ۱۹۷۴ء میں پابندی لگا دی گئی تھی جس کے باعث بائسنگ کے شائقین نوجوان خاصے مایوس نظر آتے تھے۔

پہلی اور ایک ہزارویں پتھری

ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کی اولین پتھری میلورن میں کھیلے جانے والے اولین ٹیسٹ میچ میں آسٹریلیا کے اوپنر چارلس بینز مین نے بنائی تھی۔ چارلس نے انگلینڈ کے ۲۶۵

حلاف ۱۶۵ رز سلاور تھے۔ دسمبر ۱۹۶۸ء میں ویٹ انڈیز کے خلاف ایان چیمپل نے شاندار لمبے بازی کے ذریعے اپنا سکور تین ہندسوں تک پہنچایا تو آئین ٹیسٹ کرکٹ کی ۱۰۰۰ ادویں پختی بنانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ ہزاروں پختی بھی ملیوں کے ہی میدان میں بنائی گئی اور بنانے والے کا تعلق بھی آسٹریلیا سے تھا۔ لیکن سب سے جرت انگیز بات یہ ہے کہ ایان چیمپل نے بھی پہلے پختی چارلس بیٹزمن کی طرح ۱۶۵ رزری بنائے۔

اعصام الحق ٹاپ ٹین سے خارج

پاکستانی ٹیس سٹار، اعصام الحق کی اوپس میں شرکت کی امیدوں کو دھچکا لگے۔ اعصام ڈبلز ریننگک میں ٹاپ ٹین سے باہر ہو گئے۔ اگر وہ مارچ کے آخر تک ٹاپ ٹین کھلاڑیوں کی فہرست میں شامل نہ ہوئے تو لندن میں ہونے والی اوپس گیمز میں شرکت نہیں کر سکیں گے۔

وہ ایک دلچسپ ترین کی بعد ۱۱ ادویں نمبر پر پہنچ گئے ہیں۔ اعصام الحق کو لندن اوپس میں ڈبلز کا رڈ کے ذریعے انٹری کرنا پڑی۔ اعصام الحق کے ساتھی بالینڈ کے چین جولین راہر ۳۸ ادویں نمبر پر ہیں جبکہ ڈبلز پریم ریننگک میں اعصام اور چین جولین راہر ۷۰ ادویں پہنچے جاتے ہوئے ۲۵ ادویں نمبر پر چلے گئے ہیں۔ امریکا کے باب براؤن اور مائیک براؤن پہلے نمبر ہیں۔ روہن بوہادی اوپن کا ٹائٹل جیتنے کے بعد تین میڈیاں چڑھ کر ۸ ادویں نمبر پر آگے ہیں۔ سنگر میں نوادک جو کوچ پہلے، رائٹل ڈنڈا دوسرے اور راجر فیڈر دستور تیسرے نمبر پر ہیں۔ خواہن سنگر ریننگک میں پیلارس کی رکنوری اڈار کا پہلے، روس کی مارا پراپا دوسرے اور چیک ری پبلک کی پیٹرا کوپووا تیسرے نمبر پر ہیں۔ ڈبلز میں بھارتی ٹیس سٹار غانیہ مرزا ۷۰ ادویں نمبر پر موجود ہیں۔



نوٹس طلبی ٹینڈر

مندرجہ ذیل کاموں کیلئے روڈ ورکس کی فیئلڈ میں سی ایئرڈ ڈبلیو ڈبلیو سپارٹس/ ڈبلیو اینڈ لیس ڈبلیو سپارٹس سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور کے ہاں انسٹلڈ ٹھیکیداروں/ فرموں سے ٹینڈر روڈز مارکیٹ ریش (ٹینڈر وصول کرنے کی تاریخ تک ترسیم شدہ) پر مبنی سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں ٹینڈر دستاویز ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر (روڈس اینڈ سروسز) ڈسٹرکٹ آفیسر روڈ ہائی وے سٹی ڈویژن نمبر لاہور سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور کے دفتر سے تحریری درخواست جس کے ہمراہ مصدقہ نقول انسٹنٹ / اتحال تجدیدی لیٹر اور فیس رسید منسلک ہوں اور لاگو اصل PEC لائنس برائے کیلنڈر سال رواں 2011 ٹھیکیدار/ فرم کے پیڈ فارم پر اتھارٹی پراٹھارٹی لیٹر فرم کنٹریکٹر/میجک پارٹنر کا CNIC پمہرا مختار نامہ اور ہر کام کے سامنے درج ٹرانسپیر کی ادائیگی کی مقررہ فیس بشکل بینک چالان جو اکاؤنٹ نمبر 1240-PW Receipt (ڈسٹرکٹ گورنمنٹ اکاؤنٹ IV) بحق ڈسٹرکٹ آفیسر (روڈز/ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور کی ادائیگی پر حاصل کی جاسکتی ہے ٹینڈر فیس کیش کی صورت میں قابل قبول نہ ہوگی۔ ٹینڈر مذکورہ دفاتر سے 12-04-12 کے دفتری اوقات کے دوران جاری کیے جائیں گے۔ ٹینڈر ریش لفظوں

اور ہندسوں دونوں میں تحریر کیے جائیں اور ٹینڈر پر ٹینڈر دستاویز میں درج جزر ڈسٹرکٹ ٹینڈر کے مطابق دستخط کیے جائیں۔ ٹینڈر ڈسٹرکٹ ٹینڈر و بورڈ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور زیر دھنکی کے دفتر میں 12-04-13 کے 2 بجے دن کو وصول کرے گا اگر ٹینڈر 12-04-13 کو وصول نہ ہوئے تو یہی ٹینڈر 12-04-14 کو وصول کیے جائیں گے اور کسٹی/ حاضر ہونے کے خواہشمند ٹھیکیداروں یا ان کے مجاز نمائندوں کی موجودگی میں کھولے گا۔ ٹینڈر کے کھلنے کے وقت پر مبنی سے عملدرآمد کیا جائے، کیونکہ ٹینڈر وصول کرنے کے لیے مقررہ وقت میں توسیع نہیں کی جائے گی۔ مشروط ٹینڈر اور جن ٹینڈروں کے ہمراہ ضمانت بشکل ڈبلیو اینڈ کال رسید جاری کردہ ٹینڈر ول بینک اور مصدقہ نقول رجسٹرڈ ڈسٹرکٹ نامہ اور مختار نامہ بصورت فرم منسلک نہیں ہوگا وہ قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ضمانت 2 فیصد ہے اور اگر ٹینڈر کردہ لاگت تخمینہ لاگت سے 5 فیصد یا 5 فیصد سے زائد کم تحریر کی تو سب سے کم بولی دہندہ کو حکومت پنجاب کی راج ہدایات کے مطابق تخمینہ لاگت سے کم درج کردہ رقم کے مساوی پرو فارمنس سیکورٹی بشکل کال ڈبلیو اینڈ جاری کردہ ٹینڈر ول بینک جمع کرانی ہوگی۔ کسی قسم کی دیگر معلومات/ تفصیلات بابت کام درج ذیل ٹینڈر ڈویژنل ہینڈلر/ ہیڈ ڈسٹرکٹس سے دفتری اوقات کے دوران حاصل کی جاسکتی ہیں۔ زیر دھنکی کو حقوق حاصل ہیں کہ بغیر کوئی وجہ بتائے کسی ٹینڈر کو منظور کرے یا تمام ٹینڈروں کو مسترد کر دے۔ ٹینڈروں کا اجراء کام کی کوئی پراکریس کی یقین دہانی کے لیے جو ٹھیکیدار کی جانب سے دی گئی ہے اور جس پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی جاتی ہے ڈسٹرکٹ گورنمنٹ پالیسی کے تابع ہے ٹینڈروں کی منظوری بھی B&R کوڈ کے مندرجات سے مشروط ہے۔

نمبر	کام کی نوعیت	تخمینہ لاگت	مدت	ٹینڈر فیس
شار		ضمانت	میں	
1-	محال لنک سٹریٹ جامع خوشہ چاہ فضل چاکیاں پوس 101 اور رانا سٹریٹ ٹال والی گلی سی سی اور سیور پوس نمبر 107 بی بی-148 لاہور	Rs: 2.533 Rs: 50660/-	ایک ماہ	1267/-

پراجیکٹ بذریعہ ریڈینٹ کنٹریشن سیرویژن/ تحریڈیالائی ویلڈیشن منجانب عیساک (پرائیویٹ لمیٹڈ کنسلٹنٹ ہوگی۔

ڈسٹرکٹ آفیسر (روڈز)

(IPL: 3806)

ہائی وے سٹی ڈویژن نمبر 1 لاہور

حوالہ میری پسند کا

غزل

یہ کشرہ سازہ وقت کی مری جاں زندہ نظیر ہے
جو امیر تھا وہ امیر ہے جو فقیر تھا وہ فقیر ہے
مری خواہشوں کی بساط پر ہے جو ایک سرخ کلبہ ہے
یہی سرخ کلبہ تو نئے موسموں کی سفیر ہے
مرے ہم جن مرے ہم زبان، بڑے خوش بیاں بڑے خوش
گماں کوئی غلطیوں کا غلام ہے کوئی روشنی کا امیر ہے
نہ وہ سرزمین نہ وہ آسمان مگر آج بھی سر دھت جاں
وہی مشک ہے، وہی پیاس ہے، وہی تپ ہے وہی تیر ہے
کسی لب پہ حرف ستم تو ہو کوئی دکھ سپرد قلم تو ہو
یہ بجا کہ شہر لال میں کوئی درد ہے کوئی سیر ہے

چند پسندیدہ اشعار

کبھی زمیں تو بھی چرخ کے عتاب میں ہوں
نہ پوچھ مجھ سے پتھر کر میں کس عذاب میں ہوں
دیدہ دل لبو کریں کس کے لئے غزل کہیں
شہر میں ایک ترے سوا کون سخن شناس ہے
دکھائے ہیں کچھ ایسے نئے موسموں نے رنگ
ہوئی اگر زبان تو دروہام بولتے
عجب شخص ہوں یادوں کے لالہ زار میں ہوں
جو وقت بیت گیا اس کے انتظار میں ہوں
کھٹے روختہ ڈریں احباب موسم سے
میں ایک سوکھا ہوا پیڑ کس شمار میں ہوں
آشنا ہے کوئی دیوار نہ در اپنا ہے
پھر بھی یادوں کا گماں ہے کہ یہ گھر اپنا ہے

پروفیسر منظر ایوبی

بھارت کے صوبے یوپی کے شہر بدایوں میں ۱۹۳۲ء
میں ولادت ہوئی۔ ثانوی تعلیم و اعلیٰ تعلیم رہیں حاصل کی۔
۱۹۵۰ء میں ہجرت کی اور کراچی کو مستقل مقدر بنایا۔ ۱۹۵۰ء
سے ۱۹۶۱ء تک مرکزی وزارت عتلا (بھارت) میں
ملازمت کی۔ اسی دوران پنجاب یونیورسٹی سے
”ادیب فاضل“ اور جامعہ کراچی سے بی۔ کام اور ایم اے
کی ڈگریاں حاصل کیں۔
مرکزی حکومت کی اسلام آباد منتقلی کے نتیجے میں
سندھ کے محکمہ تعلیم میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ
ہونا پڑا۔ صوبے کے مختلف ڈگری کالجوں میں تدریس اور
انتظامی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۹۳ء میں بحیثیت
سینئر پروفیسر پریسل ملازمت کی مہم شروع ہوئی۔

۱۹۳۶ء سے جس تخلیقی و فنی سفر کا آغاز ہوا تھا، وہ
تادم تحریر جاری ہے۔ ان پینٹھ (۲۵) برسوں میں جہاں
بین الاقوامی مذاکروں اور عالمی شاعروں کی شرکت سے
آویں دنیا کی سادست نصیب ہوئی وہاں بیشتر اصناف سخن پر
مبتمل نو (۹) ضخیم مجموعے مصنف شہود پر آئے۔ نیز اس
سے زیادہ مقدار میں ادبی اثاثہ طاعت کا منتظر ہے۔ اس
بندۂ ناچیز پر رب العزت کی رحمتوں کا سلسلہ جاری رہا تو
بجز پور زندگی گزارنے کی طرح باقی غیر مطبوعہ مواد بھی جلد
منظر عام پر آجائے گا۔ (ان شاء اللہ)

میر تقی میر

میر تقی میر کی رحلت کو صدیوں سے زائد مدت گزر
چکی ہے مگر ان کی توقیر و عظمت، قدر و منزلت، احترام و
عقیدت اور مقبولیت و شہرت میں ڈرہ برابر کمی نہیں
ہے۔ وہ آج بھی شائقینِ کلم و ادب کے دلوں کی دھڑکن
ہیں، جب کہ اس مدتِ دراز میں آسمان شاعری پر ان
گنت شعرا، مہر و ماہ کی مانند طلوع ہوئے اور اپنی تمام جلوہ
سامائوں اور حسن آرائیوں کے باوصف اس طرح غروب
ہوئے کہ اردو شاعری کیست ارتقا میں صرف ان کے
اساتذہ گرامی زندہ ہیں۔ البتہ وہ چند شعرا ہیں جن کی فکر و
دانش کے چراغ تیرہ و تار فضاؤں میں بھی روشن رہے اور
نشیب و فراز زمانہ کے باوجود جن کے پائے ثبات میں
لرزش نہیں آئی، ان قدماء میں سب سے زیادہ ممتاز نام میر
تقی میر کا ہے۔ میر کی مقبولیت و محبوبیت کا خاص باب ان کا وہ
شیوہ گفتار ہے جس کی دل کشی، خوش و خفی، رزمائی اور
دل آویزی پر ہر صاحبِ ذوق میری طرح جان چھڑکتا ہے۔

متفرق اشعار

برسوں گئی رہی ہیں جب مہر و مدہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحبِ نظر بنے ہے
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تمام حتام لیا
پاس ناموں عشق تھا ورنہ
تنتے آنسو پلک تک آئے تھے
ہم خاک میں ملے تو ہیں لیکن اے سپر
اس شوخ کو بھی راہ پر لانا ضرور تھا
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے
اگر نصیب ترے کوچہ کی گدائی ہو
دیدنی ہے غفلتِ دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

جوش ملیح آبادی

جوش کا کثر سے کثر مخالف اس امر کی گواہی ضرور
دے گا کہ قدرت نے جوش کو جن عظیم تخلیقی صلاحیتوں سے
نوازا تھا وہ انہیں بدرجہ اتم بروئے کار لائے جس کے نتیجے
میں بیسویں صدی کی تاریخ سخن میں اقبال کے بعد جوش کا
نام آتا ہے۔ میری نظر میں جوش کی جملہ نظموں میں سب
سے زیادہ ”ایٹ انڈیا مینی کے فرزندوں کے نام“ نظم
پسند ہے جسے عہدِ غلامی کی لکس دستاویز کہنا چاہیے جس میں
انہوں نے انگریز حکمرانوں کو بری طرح لاکڑا اور دھکا دیا تھا۔

کس زبان سے کہہ رہے ہو آج سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل کے واسطے
ہندویوں کے جسم میں کیا روح آزاد ی نہ تھی
بچ بٹاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی
اپنے ظلم سے نہایت کا قسانہ یاد ہے
کچنی کا پھر وہ درد مجرمانہ یاد ہے
دستکاروں کے انگوٹھے کا کٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گھروں کو پاستے تھے تم
کیا اووہ کی بیٹیوں کا بھی ستانا یاد ہے
یاد ہے بھجائی کی رانی کا زمانہ یاد ہے
ہجرت سلطان دہلی کا ساں بھی یاد ہے
شیر دل شیو کی خوشیں داستاں یاد ہے

اسی طنطنے اور طعراق کے ساتھ یہ نظم
ان اشعار پر ختم ہوئی

خیراے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرماں کے آگے جھکاؤ گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی



علامہ اقبال اور ان کے کلام سے میری دلچسپی، پسندیدگی اور عقیدت کا بنیادی سبب ان کی شاعری کا ایک ایسا لائحہ عمل اور دستور حیات ہے جو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب یعنی نوجوان انسان کے لئے یکساں طور پر مفصل راہ کا کام دیتا ہے۔ دو تین سے قطع نظر میرے نزدیک اقبال پہلا شاعر ہے جس نے مغربی تہذیب و تمدن، مغربی ثقافت و فکرمندی کی جملہ برائیوں کا کل کر پردہ چاک کیا ہے، اور ان عہد غلامی ہی میں تنقید و تنقیص کا ہدف بنایا۔ اپنے سائنٹفک اور فلسفیانہ شعری رویوں سے مشرقی اقوام کی خوابیدہ رگوں کو بیدار کیا۔ ان کے کلام میں انسانیت کی وہ گونج سنائی دیتی ہے جسے سننے کے لئے صدیوں سے انسانوں کے کان نا آشنا تھے۔

اقبال نے اسلام کو جس تین تین اعتماد کے ساتھ اپنی شعری گوئی کا شمع و مرکز بنایا اردو کے شاید ہی کسی شاعر کے یہاں اس طور پر اسلامی تصورات، نظریات، قرآنی اصولوں اور ضابطوں کی عکاسی ملتی ہو۔ اس حوالے سے اقبال کے کلام کو مقصدیت سے پر قرار یا جاتا ہے۔ اس

سے چراغ با ہوئے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر لکھن اور مارکس کا فلسفہ حیات اور ان کا نظریہ ارتقاء دنیا کے بیشتر عوام کی دلچسپی اور عمل کا باعث ہو سکتا ہے، اگر شکسپیئر کے خیالات اور فرمائے کے نظریات انسانیت کی بقا کے ضامن ہو سکتے ہیں، اگر مغرب کے بیشتر مفکرین اور دانشوروں کے انکار و خیالات کو عیسائیت اور رہبریت کے باوصف بلند درجہ عطا کیا جا سکتا ہے تو کلام اقبال اس زمرے میں کیوں شامل نہیں ہو سکتا۔

کیا اقبال کی معرکتہ الآرا نظموں، مہمہ قرہ، ہسپانیہ، شکوہ جواب شکوہ اور جبریل و ابلیس وغیرہ کا فنی، اسلوبیاتی، موضوعی اور افادی لحاظ سے آفاقی سطح پر عالمی ادبیات سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا؟ کیا بین الاقوامی زبان و ادب میں ان جیسی مثالیں موجود ہیں۔

اگر کج رو ہیں انجم آسمان تیرا ہے یا میرا مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لا مکان خالی خطا کس کی ہے یارب لا مکان تیرا ہے یا میرا

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا مگر یہ حرف شیریں ترہاں تیرا ہے یا میرا

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اس غزل کے علاوہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ سلسلہ روز و شب نقش گرِ حادثات

سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تا رہِ حریر دو دگ
جس سے بناتی ہے از قہقارے ثبات

احمد ندیم قاسمی

شاہ عبداللطیف بھٹائی، بجل سرمست، ان دو سندھی شاعروں کے علاوہ اردو کے صرف تین شعرا، اقبال، فیض اور ندیم قاسمی کو ان کی یادیں متعقد تقریبوں پر منظم خراج عقیدت پیش کیا جاتا تھا۔ اپنی پسند کے حوالے سے اس نظم کا اقتباس قارئین کی غیبت طبع کے لئے حاضر ہے۔

اس کا موضوع سخن، نوع بشر کی عظمت
حریت، امن، مساوات، دیانت، چاہت

اس کا ہر شعر ہے سچائی کا منظر لوگو
ایک اک کونے میں ہے بند سمندر لوگو

قصہ زلف بھی ہے، تذکرہ دار بھی ہے
روح کا کرب بھی ہے جسم کی چکار بھی ہے

وہ سمجھتا ہے قلدکار کی عظمت لوگو
اس کو معلوم ہے الفاظ کی طاقت لوگو

ندیم کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

جب ترا حکم ملا ترک محبت کردی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کردی

تجھ سے کس طرح میں اظہار محبت کرتا
لفظ سوچا تو معانی نے بغاوت کردی

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیرہ الفت نے محبت مری قسمت کردی

پوچھ بیٹھا ہوں تجھ سے ترے کوسے کا پتا
تیرے حالات نے کسی تری صورت کردی

خالد علیگ

ہم معصوم شمعاً میں خالد علیگ مجھے اس باعث پسند ہے کہ اس نے خود کو ایک دائرے میں محصور نہیں کیا۔ وہ اپنے معاشرے اور سماج کا سچا منور ہے۔ زندگی اور کائنات کی ایک رچی تصویر اور روایتی فلسفیانہ نظریے کا قائل نہیں۔ وہ دنیا، سماج، معاشرے اور انسانی رویوں کو جس طرح دیکھتا، پرکھتا اور سمجھتا ہے انہیں تجربات و مشاہدات کی اساس پر شاعری کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

اس دور میں بھی عشرت دارو دین تو ہے
ہم انقلابیوں کی یہ رسم کہن تو ہے

تم کو چاہا ہے تم کو پوچھا ہے
ہم محبت میں اور کیا کرتے

اے مہ دلو، سنگ دلو تم ہی پہ کیا ہے
دنیا میں تو پوچھے گئے پتھر کے صنم بھی

مرے خدا نے مجھے بولنا سکھایا ہے
تو پھر جو حرف لیتیں ہے وہ کیوں نہ بولوں

چراغ رہ زگر بن کے جل رہا ہوں
مجھے خبر ہے کہ کار چھیری کیا ہے

اقطاع میں مرنے ہی چلی جاتی ہے یہ قوم
خالد اسے جینے کا ہنر کیوں نہیں آتا

وقت کے حاکم کو اک مجذوب نے دی ہے دعا
جا تجھے بھی ایک دن مجھ سا مرا مولا کرے

ماگتے والے اپنا ظرف کبھی دیکھ
سر کٹائے گا کربلا لے گا

تفہیل پاکستان کے بعد اردو شاعروں کی جونی نسل پروان چڑھی اس میں سر فہرست نام افتخار عارف کا ہے۔ اس نے اپنی قدرتی صلاحیتوں، ذہنی کاوشوں اور علم و فن سے فطری لگاؤ کے طفیل اپنے ہم عصر قلم کاروں میں بہت جلد اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ دس عزیز میں اسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں، عینی مطالعہ اور گہرے مشاہدات و مظاہر فطرت اور مناظر قدرت کو بروئے کار لانے کے لئے کھلا میدان ملا۔ لہذا اس نے شب و روز کی ریاضت اور مسلسل مشق کے بل بوتے پر جملہ خارجی و داخلی حالات سے استفادہ کرتے ہوئے بہت جلد ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کر لی۔ ہم عصر شاعروں کی بھیڑ میں اپنے منفرد اور دل کش اسلوب کی نئی راہ تراشی۔ جدید سوچ اور فکر، دلوں کو موہ لینے والے انداز میں دھل کر قرطاس کی زینت بنی تو قارئین کے دل و دماغ کو مسحور کرتی چلی گئی۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس کا کہ اس نے شعری روایت کو ذوق سے جڑا رکھا۔ ادبی ضوابط و قواعد کی پاسداری کی۔ فنی لوازمات کا التزام برقرار رکھا لیکن عصریت کو ہر حال میں مرکز فکر بنایا جس کی وجہ سے نادر شبیہوں، استعاروں اور علامتوں کو سنے مفہام ملے۔

اس کے لیے کی نفسی، غنائیت، لفظوں کی کھلک، تشبیہوں، استعاروں اور نئے اچھوتے مضامین کی بو قلمونی رنگارنگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ دراصل افتخار عارف کے اسی فنی رچاؤ اور سوچ لانے مزاج نے اس کے کلام کا حسن دو بالا کر دیا ہے۔ بے شک وہ عہد تازہ کا نمائندہ عکاس اور اپنے عصر کی بہت توانا آواز ہے۔ افتخار عارف کا ایک مشہور شعر ہے۔

جگہ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

”کتاب“

بنی کا شوق شروع ہی سے ہمارے ہاں پروان نہیں چڑھ سکا۔ اب کمپیوٹر اس کے لیے تازہ زبان ثابت ہوا ہے۔ دوسرے ملکوں میں کمپیوٹر نے بک پچھڑ کو مٹا کر نہیں کیا۔ وجہ شرح خواندگی ہے۔ بک پچھڑ کے لیے کمپیوٹر چیلنج نہیں برسرِ ٹیکہ شرح خواندگی بڑھ جائے۔ کتابوں کی قیمتیں کم ہو جائیں اور حکومت بک انڈسٹری کی سرپرستی کرے تو کتاب کو کھویا ہوا مقام مل سکتا ہے۔ لوگ اب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سونے سے پہلے زر مطالعہ کتاب سے بہتر زندگی کا کوئی ساتھی نہیں ہو سکتا۔ آپ محقق، شاعر اور افسانہ نگار ڈاکٹر شاہد دلاور شاہ کے سائزٹاز پڑھ رہے تھے۔

گزشتہ ماہ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو سعودی عرب سے تشریف لائے تھے، انہوں نے بتایا کہ چند سال قبل سعودی عرب میں پاکستانی اخبارات ہزاروں کی تعداد میں آتے تھے لیکن اب ان کی تعداد گھٹ کر یکڑوں میں رہ گئی ہے، لوگ اخبار بنی کا شوق کمپیوٹر سے پورا کر لیتے ہیں۔ کتابیں بھی کمپیوٹر پر پڑھی جاتی ہیں۔ نئی نسل تو ماشاء اللہ انگریزی پڑھتی ہے، کمپیوٹر کو پکڑ کر بیٹھی ہوتی ہے جو اس کے خیال میں اس کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

اردو ڈائجسٹ اردو زبان کی ترویج، اور اعلیٰ وطن کے دل میں قومی زبان کی کتب و رسائل میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مقدور ہجر کوشش کر رہا ہے۔ ”مطالعے کی میز پر“ یعنی آپ کی مطالعے کی میز پر ہر ماہ نئی سے نئی کتب ہوتی جائیں۔ ہم چند کتب کا تعارف یہاں پیش کر رہے ہیں۔

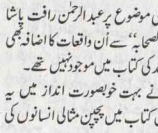
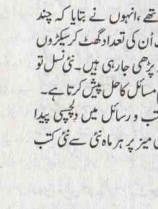
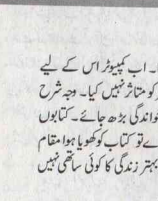
نقوش صحابہ

یہ کتاب خالد محمد خالد کی عربی کتاب ”رجال حول الرسول“ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن یہ اس کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ ارشاد الرحمن نے اس میں بہت سے ترمیم

واضافے کیے ہیں۔ اسی موضوع پر عبد الرحمن رافت پاشا کی کتاب ”صورتن حیاۃ الصحابہ“ سے اُن واقعات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جو خالد محمد خالد کی کتاب میں موجود نہیں تھے۔

ادارہ منشورات نے بہت خوبصورت انداز میں یہ کتاب چھاپی ہے۔ اس کتاب میں بچپن مثالی انسانوں کی

مطالعے کی میز پر



یا کیزہ زندگیاں کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے اولئک الذین صدق اللہ والولئک ہم اولوا الالباب (سورہ الزمر، آیت ۱۸) کا ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت سے نوازا اور انہی لوگ دانش سے بہرہ مند ہیں۔ حضرت محمد ﷺ نے کیا خوب فرمایا: اسمانی کا انجیم (صحابہ کرام ستاروں کی کھٹکان ہیں)

صحابہ کرامؓ نے قرآن اور حضرت محمدؐ کی تعلیمات کو عمل کی شکل میں تبدیل کر کے دکھا دیا تھا۔ آج امت مسلمہ کو اگر کوئی مسئلہ ہو تو یہی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو حق بجانب سمجھتی ہے لیکن عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ کتاب ہر سرسری طور پر پڑھنے والے دماغ کے لئے بہتر ہے کہ تلاوت قرآن اور مطالعہ حدیث کے ساتھ ساتھ ردوانہ ایک صحابی کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے اور اس بات پر غور و فکر کیا جائے کہ ان لوگوں کی زندگی میں قرآن کیا انقلاب لایا تھا۔ اقبالؒ نے ان مثالی انسانوں کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

تمدن آفریں، خلاق آئین جہاں داری
وہ صحرا سے عرب یعنی شتر بانوں کا گہوارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اسنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرائیں میں کیا تھے
جہاں گدو جہاں دارو جہاں بان و جہاں آرا
تجھے آیا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا

درج ذیل صحابہ کرام کے حالات زندگی اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں:

(۱) حضرت مصعب بن عمیرؓ: اللہ کی قسم، آپ کی داستان کس قدر دلربا ہے، آپ مصعب النیرؓ تھہرے۔
(۲) حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ: یہ وہ ہیں جن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا: ”ہر امت کا امین ہوتا ہے اور اس

امت کا امین ابوعبیدہ بن جراحؓ ہے۔ یہ وہ ہیں جنہیں سب سے پہلے ”امیر الامراء“ کا لقب ملا۔ (۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: آپ ان تھے آدمیوں میں سے پہلے آدی تھے جو حضورؐ پر ایمان لائے تھے (۴) حضرت سلمان فارسیؓ: آپ نے مدینہ کے گرد خندق کوونے کی تجویز دی تھی۔ خندق نے لنگار کو بے بس کر دیا۔ (۵) حضرت ابوذر غفاریؓ: آپ پہلے آدمی ہیں جس نے حضورؐ کو اسلام کا تبلیہ (سلام) پیش کیا اور پھر یہی سلام عام رائج ہو گیا۔ (۶) حضرت بلال بن رباحؓ: آپ کی داستان عزیمت تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ آپ کو حضورؐ نے پہلا موزن بنایا۔ (۷) حضرت عبداللہ بن عمرؓ: آپ وہ جلیل القدر صحابی ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے اپنے تعلق کا آغاز تیرہ برس کی عمر میں کیا۔ (۸) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا اور پہلے ہی شخص ہیں جنہیں تیر لگا۔ آپ وہ واحد شخص ہیں جن کے اوپر حضورؐ نے اپنے والدین کو مٹا کرنے کے الفاظ ادا کئے۔ (۹) حضرت معاذ بن جبلؓ: آپ کسی موقع اور غزوہ میں رسول ﷺ سے پیچھے نہ رہے۔ (۱۰) حضرت مقداد بن عمروؓ: آپ راہ خدا میں محوئے سپرد ہوا کر میدان میں نکلنے والے پہلے شخص ہیں۔ (۱۱) حضرت سعید بن عامرؓ: آپ کی عظمت و بزرگی آپ کی ظاہری سادگی اور اندرونی بایکڑی میں پوشیدہ تھی۔ (۱۲) حضرت حذوہ بن عبدالمطلبؓ: آپ نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی تمام طاقتیں اور صلاحیتیں اللہ اور دین اسلام کی نظر کر دیں۔ (۱۳) حضرت ذہیفہ بن یمانؓ: آپ کو چہروں کے پڑھنے سے فن میں تھیں خاص کا درجہ حاصل تھا۔ (۱۴) حضرت خباب بن ارتؓ: آپ ان لوگوں میں سے ایک تھے جن کے دفاع میں قرآن نازل ہوا۔ (۱۵) حضرت عمار بن یاسرؓ: آپ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا: ”مارسے سے پاؤں تک ایمان سے لبریز ہیں۔“ (۱۶) حضرت عثمان بن مظعونؓ: آپ مدینہ میں وفات پانے والے اولین مہاجر اور جنت البقیع میں دفن

ہوئے والے اولین مسلمان ہیں۔ (۱۷) حضرت زید بن حارثہؓ: آپ کی شہادت کی خبر سن کر حضورؐ رو پڑے، فرمایا: ”ایک محبوب کا اپنے محبوب کے غم میں رونا ہے۔“ (۱۸) حضرت جعفر بن ابی طالبؓ: آپ صورت و سیرت میں تمام لوگوں میں سب سے زیادہ حضورؐ سے مشابہ تھے۔ (۱۹) حضرت عبداللہ بن رواحہؓ: آپ جنگ موتہ میں شہید ہوئے اسی وقت حضورؐ کو مدینہ میں اس کی خبر اللہ نے دی۔ (۲۰) حضرت خالد بن ولیدؓ: آپ نے احد کے روز مسلمانوں کو گھما دیا اور باقی تمام زندگی اعدائے اسلام کو ناکوں بنے چھوئے۔ (۲۱) حضرت عیمر بن وہبؓ: حضورؐ کوٹھل کرنے کے لیے مکہ سے مدینہ آئے اور جب حضورؐ کے سامنے پہنچے تو کلمہ شہادت پڑھ کر گئے۔ (۲۲) حضرت ابوذرؓ: وہ صحابی جس کو اللہ تعالیٰ نے موناذہ فرست، فلسفیانہ مہارت، پنجواںویں تجربہ اور صحابیانہ بصیرت سے نوازا۔ (۲۳) حضرت زید بن خطابؓ: آپ حضرت عمر بن خطابؓ کے بھائی ہیں، ان سے پہلے مسلمان ہوئے اور پہلے شہادت پائی۔ (۲۴) حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ: آپ تمام غزوات میں اگلی صفوں میں ہوا کرتے تھے۔ (۲۵) حضرت زبیر بن حواصؓ: حضورؐ نے فرمایا: ”ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر بن حواص ہے۔“ (۲۶) حضرت غیب بن عدیؓ: آج تک کسی کو معلوم نہیں آپ کی قبر کہاں ہے۔ (۲۷) حضرت عیمر بن سعدؓ: حضرت عمرؓ تمنا کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے ”کاش مجھے عیمر جیسے افراد جاسین اور میں مسلمانوں کے امور حکومت میں ان سے مدد لوں۔“ (۲۸) حضرت زید بن ثابتؓ: قرآن کو فتح و مدون کرنے کا چہرہ ہوگا تو آپ کا تذکرہ بھی ناگزیر ہوگا۔ (۲۹) حضرت خالد بن سعیدؓ: نبی کا کوئی غزوہ ایسا نہیں جس میں آپ پہلی صفوں میں نہ ہوتے۔ (۳۰) حضرت ابوالوہاب انصاریؓ: تری کے شہر اشتیول میں آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو دفن کیا گیا۔ (۳۱) حضرت عباسؓ بن عبدالمطلبؓ: حضورؐ نے فرمایا: ”لوگوں کو کہ عباس میرے لیے باپ کی جگہ ہیں، جس

نے ان کو تکلیف دی گویا اس نے مجھے تکلیف دی۔“ (۳۲) حضرت ابوہریرہؓ: آپ اپنے دور میں حدیث بیان کرنے والوں میں سب سے زیادہ قوت حافظہ رکھتے تھے۔ (امام شافعیؒ) (۳۳) حضرت براہ بن مالکؓ: میدان جنگ کے اندر جو شخص بھی آپ کو دیکھتا وہ حیرت بالائے حیرت کا اظہار کرتا۔ (۳۴) حضرت عتبہ بن غزوہؓ: آپ سات افراد میں سے ساتویں ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ (۳۵) حضرت ثابت بن ثعلبہؓ: اسلام میں آپ کی وصیت کے علاوہ کوئی فت شدہ کی کوئی وصیت نہیں جو اس طرح پوری کی گئی ہو۔ (۳۶) حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ: حضورؐ نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا ”عبد الرحمن بن عوف جلتی ہیں۔“ (۳۷) حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرامؓ: جنگ بدر میں شہادت کے بعد آپ کے فرزند حضرت جابرؓ سے حضورؐ نے فرمایا: ”اے جابر، اللہ تعالیٰ جب بھی کسی سے ہم کلام ہوتا ہے تو پر دے کے پیچھے سے ہم کلام ہوتا ہے، لیکن تمہارے والد سے روز بروز ہم کلام ہوا ہے۔“ (۳۸) حضرت عمرو بن جموحؓ: احد کے مقام پر شہید ہوئے، دفن کر دیا گیا۔ ۳۹ برس بعد پانی کے ریلے سے بچانے کے لیے قبر کھدائی کی گئی۔ آپ سوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ (۳۹) حضرت حبیب بن زیدؓ: آپ ان ستر باریک آدمیوں میں شامل تھے جنہیں بیعت عقبہ ثانیہ کا شرف و اعزاز حاصل ہے۔ (۴۰) حضرت ابی بن لعبؓ: آپ کو حضورؐ نے علم و فہم کی نعت الہی پر مہار کی تھی۔ (۴۱) حضرت اسید بن حذیرؓ: آپ ہمیشہ گہری متوازن، واضح اور پر سکون سوچ بچار کے ذریعے معاملات کو سمجھتے تھے۔ (۴۲) حضرت سعد بن معاذؓ: آپ کی شہادت کے موقع پر حضورؐ نے فرمایا: ”سعد بن معاذ کی موت سے زمین کا عرش لرز اٹھا۔“ (۴۳) حضرت سعد بن عبادہؓ: شہادت آپ کی مضبوط شخصیت کا مزاج تھا۔ آپ حق کے معاملہ میں شدید تھے۔ (۴۴) حضرت عباد بن بشرؓ: تمام غزوات میں اگلی صفوں میں رہ کر ایسی جرات و شجاعت سے راہ خدا میں جہاد کرتے کہ عقلیں دنگ رہ

جائیں۔ (۳۵) حضرت اسامہ بن زیدؓ حضرت محمدؐ آپ سے جوشیدہ محبت تھی اس پر ساری دنیا رنگ کرتی تھی۔ (۳۶) حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ آپ سے مخاطب ہو کر حضورؐ نے فرمایا ”اس اللہ کا شکر ہے جس نے تجھے جیسے آدمی میری امت میں پیدا کیے۔“ (۳۷) حضرت عبدالرحمنؓ: آپ کسی غزوہ سے پیچھے رہے نہ کسی فرض کیے گئے جہاد سے پہلو ہٹوئی کی۔ (۳۸) حضرت عبدالرحمن بن عمرو بن العاصؓ: آپ عبادت کی طرف اس قدر مائل تھے کہ غصہ تھا کہ اس سے آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ (۳۹) حضرت عمران بن حصینؓ: آپ مسلسل تیس برس ایک موذی مرض میں مبتلا رہے لیکن بھی اف تک نہ کہا۔ (۴۰) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ: آپ دنیا میں آنے سے قبل ہی ہجرت کے اعزاز کے حقدار ٹھہرے۔ (۴۱) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ: آپ کی ذہانت کا توحید اور معرفت کی وسعت اس قدر تھی کہ عقلمیں حیران رہ جاتی تھیں۔ (۴۲) حضرت سہیل بن عمروؓ: آپ نے فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا۔ (۴۳) حضرت طفیل بن عمرو دؤبیؓ: ارتداد کی جنگوں میں آپ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ میدان میں آگئے۔ (۴۴) حضرت عمرو بن العاصؓ: آپ ذہانت میں تیز، اظہار رائے میں مضبوط اور معاملہ جی میں دور اندیش تھے۔ (۴۵) حضرت ابوموسیٰ اشعرئؓ: آپ کو حضورؐ کے نزدیک اعتماد اور محبت کا مقام حاصل تھا۔

ناشر: ادارہ منشورات منصورہ ملتان روڈ لاہور
صفحات: ۵۸۳
قیمت: ۳۹۰ روپے

☆ ☆

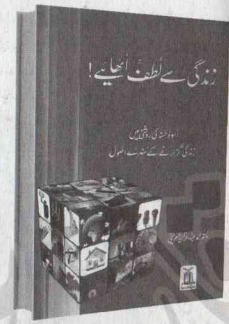
زندگی سے لطف اٹھائیے!

ادارہ دارالسلام پاکستان میں اشاعت کتب کے میدان میں ایک انقلاب لانے کا باعث بنا ہے۔ خاص طور پر ہمارے پاس دینی کتب کی اشاعت بہت غیر معیاری

۲۷۶ آرزو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

ہو رہی تھی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر ادارہ کو پوش کر رہا ہے کہ خوبصورت سے خوبصورت کتابیں شائع کی جائیں۔ ”دارالسلام“ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت اپنے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے پر لگا ہوا ہے۔ ”زندگی سے لطف اٹھائیے“ کا اتنا اعلیٰ معیار ہے کہ دیکھتے ہی منہ میں پانی آجاتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف دکتور محمد عبدالرحمن العریفی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سعودی عرب کے اصل باشندے ہیں۔ ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے بنو خالد (بنو خزیمہ) سے ہے اور یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ بنو خالد مشہور سپہ سالار، مجاہد اور صحابی حضرت خالد بن ولیدؓ کی اولاد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ سعودی جامعات سے سائنس اور بی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ آج کل الریاض کی شاہ سعود یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

عربی زبان میں ان کی ۱۲۰ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی مختلف عربی کتب کی مجموعی اشاعت ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ ”زندگی سے لطف اٹھائیے“ کی بھی ۱۰ لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کتاب کے ”پیش لفظ“ میں بتاتے ہیں ”یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں عمر عزیز کے سولہویں سال میں تھا، ذیل کاروباری کی ایک کتاب ”لوگوں سے معاملہ کرنے کا فن“ میرے ہاتھ کی۔ یہ ایک عمدہ کتاب تھی۔ میں نے اسے کئی بار پڑھا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ آدمی شخص دنیاوی خوشی اور سعادت مندی کی خاطر کتابیں لکھتا اور لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر وہ اسلام اور اس کے اخلاق و خصائل سے واقف ہو کر دونوں جہاں کی خوشیاں حاصل کر لیتا تو کتنی اچھی بات تھی۔ وہ معاملات زندگی میں کام آنے والی ان مہارتوں کو عبادت سمجھتا اور اس کے ذریعے سے اپنے رب کا قرب حاصل کر لیتا تو کیا ہی خوب ہوتا۔ پھر مجھے بتا چلا کہ کاروباری نے خوشی کی تھی تو حیرانی ہوئی کہ اس کی خوبصورت اور عمدہ کتاب نے اسے کوئی نفع نہیں پہنچایا۔



میں نے تاریخ اسلامی کی ورق گردانی کی تو دیکھا کہ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کی یہ قول اور رائے کے نمایاں افراد کی سرگزشتوں میں لطافت کے ایسے ایسے موتی بکھرے پڑے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہمیں انبیاء کے پیچھے ہوئے چراغوں کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ تب میں نے لوگوں سے معاملہ کرنے کے فن پر یہ کتاب لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ کتاب شرم ہے میری ان تحقیقات کا جن پر میں نے اپنی زندگی کے ۲۰ سال یعنی برس صرف کیے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے میں نے خون جگر کی روشنائی سے لکھا، اور جس کی سطحوں میں اپنی روح کو اندیل دیا اور جس میں میری یادداشتوں کا ٹھنڈ شامل ہے۔ مصنف کا تقاضا کرانا اور اس کے اپنی کتاب کے بارے میں خیالات سے آپ کو آگاہ کرنا بہت ضروری تھا۔ چاہتا تو تھا کہ کتاب میں بیان کردہ نکات کا خلاصہ پیش کر دوں لیکن اندازہ ہوا کہ خلاصہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جو پچھلے صفحے سے لے کر آخری صفحہ تک پڑھی جائے۔ نہ صرف پڑھی جائے بلکہ اپنی زندگی کو اس کتاب میں بیان کردہ حقائق کی روشنی میں بدلا جائے۔

مصنف: دکتور محمد عبدالرحمن العریفی
ترجمہ: حافظ قمر حسن
ناشر: دارالسلام ۳۶- لوزنل
سیکرٹریٹ شاپ، لاہور
☆ ☆

دانش عرب و عجم

ڈاکٹر غلام جیلانی برقی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: آغاز میں اسلام ۱۲ طریقوں سے پھیلا۔ اول مسلمانوں کے عمل سے، دوم عربوں کی حکایات سے۔ ان حکایات کی اساس خالص روحانی و اخلاقی اقدار پر رکھی تھی اور انداز حکامات کا اتنا دلنشین کہ بات روح میں اتر جاتی تھی۔ مسلمان جہاں بھی گئے حکایات کے ذخائر ساتھ لے گئے۔ انہیں واعظین نے مساجد میں، متعلمین نے مدارس میں اور داستان سراؤں نے کئی کوچوں میں بیان کیا اور دل و دماغ میں انقلاب آگیا۔ اس کتاب میں اس نوعیت کی ۱۲۸۱ حکایات درج ہیں ان میں سے بیشتر تاریخی ہیں۔ کتاب کا قاری نہ صرف حکایات سے لطف اندوز ہوگا بلکہ ساتھ ساتھ اپنی تاریخ بھی پڑھتا جائے گا۔ بیان کردہ حکایات دانشوران عرب و عجم کے طویل مشاہدہ و تجربہ کا نتیجہ ہیں۔ مصنف نے ہزار ہا حکایات پڑھیں اور صرف ایسی انتخاب کیں جن میں ندرت، حقیقتی اور جیٹھا پن تھا۔ دوران انتخاب ریاض الصالحین کا بھی مطالعہ کیا جس میں پانچ سو حکایات درج ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی حکایت ایسی نہ تھی جو اس کتاب میں شامل کی جاسکتی۔ یہاں اس کتاب میں بیان کردہ حکایات اور لطائف کا ایک انتخاب دیا جا رہا ہے۔

کمال غفو

ایک روز بچی برکی (۸۰۶ء) کہیں جا رہے تھے کہ ایک آدمی نے آپ کو گالیاں مکنی شروع کر دیں۔ خدام آرزو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء ۲۷۷



قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سب کالم

فہرست مضامین، بہتر جہت

بیانات تو خوش آئند ہے کہ آپ نے فہرست
مضامین کو ایک نئی اور بہتر جہت دے دی ہے
اور اب سب کچھ ایک ترتیب سے معلوم
کیا جاسکتا ہے۔ لیکن صفحات کے
نمبروں کو اس انداز میں چھپا دیا
گیا ہے کہ محض حدسہ
کے بغیر ان کو پڑھنا
ممكن نہیں۔ کافی جگہ
مہیا ہے۔ براہ کرم اس
کو اتنا واضح کریں کہ
میرے جیسا فریبھی اس
کو اپنی عینک کے ساتھ
نی ہی، پڑھ تو سکے۔

(بچے ڈاکٹر صاحب! اور واضح دیتے ہیں۔
اللہ اللہ عینک کے بغیر بھی
پڑھے جاسکیں گے۔)

(ڈاکٹر عبدالرشید ارشد۔ نیوٹن پارک، لاہور)

تیسری نسل کا نشہ

اردو ڈائجسٹ میری پیدائش سے پہلے شروع ہوا اور
۱۹۶۳ء کے رسالے بھی ہمارے گھر موجود ہیں۔ میرے
والد صاحب پی ایچ ڈی انجینئر ہیں اور علیک ہیں۔
یو ای ٹی میں پڑھا یا، پھر جدہ یونیورسٹی
کراچی، سرسید یونیورسٹی، سب جگہ پروفیسر تھے۔ اب
ریٹائر ہیں۔ میں نے کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز میں
گولڈ میڈل لیا ہے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی
اردو ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ شادی ہوئی تو شوہر بھی
رہا نہیں گئے۔ (وہ خود انجینئر ہیں اور ساس ادارے میں
اعلیٰ کریڈٹ میں ہیں)۔ اب بچے ہوئے تو وہ بھی اتنے رسیا

گیا، لیکن حضرت خواجہ صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دن نکلے
گئے بادشاہ منزل پر منزل پایہ تخت کی طرف بڑھتا رہا یہاں
تک کہ وہ دہلی کے قریب ایک مقام افغان پور میں پہنچ
گیا۔ جب یہ خبر آپ کے مریدوں تک پہنچی تو وہ سخت
مضطرب ہوئے اور آپ سے عرض کی کہ حضرت اب کوئی
تدبیر سوچنی چاہئے بادشاہ دہلی پہنچنے والا ہے۔ آپ نے
تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور پھر فرمایا۔
(ہنوز دہلی دور راست) (کرنا بھی دہلی دور ہے)
اللہ کی شان کہ درات کو کھانے کے بعد بادشاہ کے پیٹ
میں درد توج اٹھا اور چند گھنٹوں میں تڑپ تڑپ کر مر گیا، ایک
اور روایت ہے کہ بادشاہ پر محل کی چھت گر پڑی تھی۔

نظام دکن اور نظام الدین

۱۲ء میں مغلیہ فوج کے ایک سردار قمر الدین علی
خان (۱۷۳۸ء) کو تیسرے دن کا خیال آیا وہ شیخ کلیم اللہ
شاہ جہان آبادی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے
روحانی مدد چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ دکن کا علاقہ شیخ نظام
الدین اورنگ آبادی (۱۷۳۰ء) کے سپرد ہے، ان کے
پاس جاؤ۔ قمر الدین نے کہا کہ کوئی سفارش عطا فرمائیں۔
شیخ نے اسے ٹالنا چاہا لیکن اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ اس
پر آپ نے ایک ٹھیکری پر یہ جملہ لکھ دیا۔ ”سنا آ رہا ہے
بڑی ڈال دو“

جب وہاں پہنچا اور وہ ٹھیکری شیخ نظام الدین کی
خدمت میں پیش کی تو آپ نے پہلے اس ٹھیکری کو چوما پھر
قمر الدین کے سر پر ایک زرد رومال باندھ کر فرمایا ”آج
سے تو نظام ہے۔“

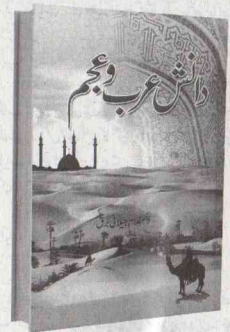
وہاں سے رخصت ہو کر قمر الدین نے حیدر آباد پہ حملہ کیا
اور ساری ریاست فتح کر لی۔ اپنا پتلہ نظام الملک آصف جاہ
رکھا اور زورورنگ کی دستار کو شامی لباس کا بڑو بنایا۔

مصنف: ڈاکٹر غلام جیلانی برق
ناشر: ”القیصل“ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
قیمت: ۲۲۰ روپے

جب اسے سزا دینے کے لیے آگے بڑھے تو بھینچی نہ روک
دیا اور اس شخص کے پاس جا کر فرمانے لگے:
”کیا تم جانتے ہو کہ میں سلطنت کا وزیر اعظم ہوں؟“
”میں جانتا ہوں“
”کیا یہ بھی جانتے ہو کہ میں تمہیں موت کی سزا دے
سکتا ہوں؟“
”یہ بھی جانتا ہوں“
”اور یہ بھی جانتے ہو کہ میں تمہیں معاف بھی کر سکتا ہوں“
”ہاں یہ بھی جانتا ہوں“
”تو پھر جاؤ میں نے تمہیں فی سبیل اللہ معاف کیا“
اتفاق کی یہ بلندی دیکھ کر وہ شخص بھینچے کے پاؤں پر گر پڑا۔

ہنوز دہلی دور است

سلطان غیاث الدین تعلق (۱۳۲۰ء-۱۳۳۳ء) کو
حضرت نظام الدین اولیا (۱۳۳۵ء) سے خواہ مخواہ کا حیر
تھا۔ جب ۱۳۳۵ء میں بنگال کے سفر سے واپس آ رہا تھا
تو اس نے حضرت محبوب الہی کو پیغام بھیجا کہ میرے
دہلی پہنچنے سے پہلے دہلی سے نکل جاؤ ورنہ سخت مواخذہ کروں
گا۔ اس حکم سے آپ کے مریدوں میں بڑا اضطراب پھیل



تبرہ کے جواب میں مجھے تادیب خط معمول ہوتے رہے۔ ”مطالعے کی میز پر“ کے حسن اسلوب پر میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس اعزاز نے کتاب پڑھنے کی طرف رغبت اور بڑھا دی ہے۔
(امین بنیم، انکمن لائبریری، چیئرمین، کراچی)

مندوبہ

آرڈوڈائجسٹ کی مثال اس بند ذہن کی سی ہے جس میں علم و حکمت کے چند بیش قیمت گنگے چن کر رکھ دیے گئے ہوں۔ ذہن سارا پڑا ہوا ہے اور ہر کسی کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ جو کوئی ایک مرتبہ وہ دیکھنے دیکھ لیتا ہے، اس کی سوچ میں وسعت اور عقل و دانائی کا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ آرڈوڈائجسٹ کی ہر تحریر اپنے قاری کے ذہن کے در پیچ واکرتی ہوتی اس کے قلب میں اتنی چلی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آرڈوڈائجسٹ بے لوث ہو کر آرڈو کی ترقی میں مصروف ہے اور آرڈو روٹل کے طور پر آرڈوڈائجسٹ کی ترقی کا باعث۔ ایک صنفی مشاہیر عالم کے اقوال کے لیے مختصر کر دیجیے۔ اصلاحی زبان بہت مفید ہے، اسے جاری رکھیے۔ (محمد کمران۔ طالب پنجاب کالج آف انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد)

پُر امید قوم کا آسرا

آرڈوڈائجسٹ میں ہر بار کچھ نہ کچھ ضرور نظر آتا ہے۔ مارچ ۲۰۱۲ء کا شمارہ تو بالکل ہی نیا تھا۔ صوفی زار پہ انٹرویو اور پھر بے حد معلوماتی اور عمدہ تھا۔ میں سمجھنے کے لیے ایسی ہی مثالوں کی ضرورت ہے۔ آپ کی مہربانی ہے جو مجھ سے یا ستمناؤں کے انٹرویوز سے ہمیں پتا رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ انٹرویو ایک پُر امید قوم کا مضبوط آسرا ہیں۔ ظفر خاں کی بیوی جی جی بی بی نوٹس لکھنا تو خیر تو ہم سے جو اچھی توقعات ہیں وہ ہمیں پوری کرنی چاہئیں۔ یہ ضرور بتایا کریں کہ یہ کامیاب لوگ اپنے لوگوں پر

صرف چیر بی/خیرات ہی نہیں بلکہ وظیفہ کے لیے کیا اور کتنا کام کر رہے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ایک ایک مضمون، تحریر اور کہانی پر تبصرہ کروں۔ کیا کل دستہ بنادیا ہے کہ کسی ایک پھول کے رنگ پچھتے ہیں۔

(مدثر عزیز۔ کوٹ مٹن، سرگودھا)

نئے لکھاری کا انتظار

کیا ہوا جو ہم نے لکھاری تھے۔ کئی ماہ ہو گئے لیکن آپ نے میرا سفر نامہ شامل نہیں کیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ غریبوں کو ڈائجسٹ میں جگہ ہی نہ دیتے ہوں۔ کیا میرا سفر نامہ شائع ہوگا یا دل میں حسرت لیے ردی کی نوکری کے سپرد ہو گیا ہے۔
(آپ کچھ نیا اور مختصر لکھ سکتے ہیں۔ بہتر ہے پہلے فون کر کے مشورہ کر لیں۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ رسالہ بغور پڑھیں۔ مزاج جان لیں۔ پھر اس کے لیے کچھ ایسا سوچیں جو شامل نہ ہونے سے رہ نہ سکے۔)

(ساجد پرویز آسن۔ ملتانوی)

لائبریریوں سے محروم نسل

ہر آدمی کے بچپن میں ایس کوئی نہ کوئی جگہ ضرور ہوتی ہے جس سے اس کی آن گشت یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک ایسی جگہیں کھیل کود کے مواقع کے علاوہ فکری اور تخلیقی جہت بھی فراہم کرتی ہیں۔ انفس کی بات ہے کہ آج کی نسل بے شک آبادیوں کے سبب ایسی جگہوں سے محروم ہو چکی ہے۔ نہ لائبریری بنی نہ اس کا کچھ۔ پوری کی پوری نسل کتابوں اور ان کی محنت سے بے نیاز محروم ہو گئی۔ کس سے امید کروں کہ ہر طبقی ادارے اور ہر مسجد کے ساتھ ساتھ ہر رہائشی بستی میں لائبریری بنانا لازم کر دیا جائے۔ اس سے قوم اور ملک کو بے حد فائدہ ہوگا۔

(سعید سعید۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور)

اجتماعی ضمیر

”ایسا کھل میرے کس کام“ پڑھا تو تسلی ہوئی کہ کوئی

تو ہے اس موضوع پر بات کرنے والا..... درود لکھنے والا اور مسئلے کو اس کی روح کے ساتھ سمجھنے والا۔

بھیم کا قاتل تیار کروانے کی فکر کرنے والا۔ مجھے تقریباً ۷ سال بعد وطن واپس آکر پاکستانی چینلوں



دیکھنے کا موقع ملا۔ یقین مانے ایک ٹاک شو کے دوران اسنے وہابیات کمرشل دکھائے گئے کہ وہ شو اور چھوڑنا پڑا۔ ہمارا میڈیا اس وقت روٹی کی ایسی ایسی تفصیلات پیش کر رہا ہے جو اسلامی معاشرے کے ہی نہیں کسی شائستہ غیر مذہبی معاشرے کے مزاج کے بھی بالکل خلاف ہے۔ یوں سب کے سامنے فحش باتوں کا تذکرہ اور تیرت اس بات پر ہے کہ اجتماعی ضمیر معمولی سا احتجاج کرنے کا بھی روا دار نہیں ہوا۔

(ہت نظام الدین۔ ضلع جنگ)

لا جواب شمارہ

آرڈوڈائجسٹ کا شمارہ لا جواب ہوتا جا رہا ہے۔ مارچ کا شمارہ بھی خوبصورت تحریر اور پھر پور معلوماتی مواد سے پُر ہے جس کے لیے قدام اداری اراکین شکر ہے کے مختار ہیں۔ انٹرویوز کا سلسلہ نہایت قابل قدر ہے۔ فون پر گفتگو کے بعد تحریر بھیجتا رہتا ہوں آپ کی میز تک پہنچتے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔

(مخدوڈاک دالوں سے تعلقات بجز کریں حضور)

(غلام حسین مین۔ حیدر آباد)

میں نے مضمون ”جانا میرا شہر لاہور“ بھیجا تھا۔ کچھ ہفتے بعد پھر پڑھا تو جاندار نہ لگا۔ سمجھتا ہوں کہ اس کو نہ چھاپنے میں آپ حق بجانب ہیں۔ دراصل ۷۸۷ سال کی

عمر تک پہنچتے پہنچتے ہمارے دماغ کی ”آمد“ کے سوتے خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ خیر۔

میں نے اپنی کتاب ”واہ وادہ“ آپ کے پاس بھیجی تھی۔ اگر مناسب ہو اور آپ کے پاس وقت ہو تو اس پر مختصر سا تبصرہ ”آرڈوڈائجسٹ“ میں شائع کر دیں۔ عمر بھر لکھنے کا میں کچھ تو کر ڈیٹل جاؤں گا۔

(سید انعام علی رضا۔ احمد پور شرقیہ)

چینلو کا قبلہ۔ سنجیدہ کام کا آغاز

میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ مختلف ٹی وی چینلوں کے غیر اخلاقی اور بچوں پر غلط اثرات مرتب کرنے والے پروگرامز کو سونے والے طبقے کی توجہ اس طرف دلائی۔ ”دورل“ پر ”دنگ“ میں بہت ہی اچھی طرح اور موثر انداز سے اس مسئلہ کو اچا کر کیا اور بہت دردمندی سے ان پروگرامز کے بچوں پہ ہونے والے اثرات کا ذکر کیا۔ خدا کرے کہ ان کے تھکڑ کا قبلہ درست ہو جائے اور کوئی فردی ادارہ اس حوالے سے کسی سنجیدہ کام کا آغاز کرے۔ ماو مارچ کا شمارہ حسب معمول دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ انٹرویو بھی بہت پسند آئے۔ صحت سے متعلق مضامین بھی کا آمد تھے۔

”ہم کہاں کھڑے ہیں“ بہت فکر انگیز تھا۔ غیر ملکی ادب سے انتخاب بھی اچھا تھا۔ آرڈو آفائل ”وارث“ نے بہت متاثر کیا۔ ”دنیا کا سب سے موثر انسان“ کا چھپچھا اب چھوڑ دیں۔ اس کے بارے میں بہت کچھ سن اور پڑھ لیا ہے کہ اب کوفت ہوتی ہے۔

(عدو جی حضرت بی بی ادو دپارے انسان بنا تو ہیں پھر اس ذکر سے جان چھڑانے کا سوچیں۔ ہم تو سونے والے دماغوں سے دنگ دیتے رہیں گے، آگے بڑھنے کے راستے دکھانے اور طے ہاتے ہیں گے۔)

(سیدہ حضرت بی بی قادی۔ فیروز پور روڈ، لاہور)

کامیابی کا پیمانہ

مارچ ۲۰۱۲ء کا شمارہ دیکھا۔ حسب دستور پھر پورا اور بے حد قابل مطالعہ۔ آرڈو رسالوں میں، میں سب سے

آرڈوڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء ۲۸۱

پہلے اشتہار دیکھتا ہوں کہ رنگین کمرشل اشتہار ہی کامیابی اور مقبولیت کا پیمانہ ہیں۔ بلاشبہ آپ کا یہ پوچھا اس میدان میں بھی نمایاں ہے۔

آپ کے یہاں تنوع بہت ہے۔ تحقیقی اور تاریخی مضامین، روحانیت، مشرق و مغرب کی داستانیں، حالات حاضرہ، سائنس، مزاح، فکر انگیز اور بے، تراجم، شاعری کم سے کم لیکن صفحات پر ”کھڑکیوں“ (Fillers) کے ذریعہ آپ شوخ کلام اور غزلوں کا بھی اہتمام کر دیتے ہیں جو بہت خوب ہے۔ آپ خود بھی لکھاری ہیں اور دل پر خوب دستک دیتے ہیں۔

(نثر، بریلوی، (اے قوی، عسکری، مسجد بیت السلام، کراچی)

کردار سازِ زی

موجودہ حالات میں اُردو ڈائجسٹ نوجوان نسل کی بہترین اخلاقی تربیت اور کردار سازی کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دن دگنی اور رات چوٹی ترقی دے (آئین) مضامین کا تنوع اس قدر اچھا ہے کہ قاری حیران ہو رہا ہے۔

(محمد ادیس دانش خاوند راجپوت، سرگڑھ شہر بے نظیر آباد)

اُردو ڈائجسٹ کا ہاتھ

اس زمانے میں آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں جب دنیا کو ایک گاڑی کہا جا رہا ہے اور ہم سب ایک دوسرے سے سکنڈوں کے فاصلے پر ہیں۔ جس لمحے فیصلہ کریں اس شخص سے رابطہ میں آجاتے ہیں، جس سے بات کرنی ہو یا کچھ اظہار کرنا اور صورت دکھانا مطلوب ہو، کوئی مشکل نہیں۔ صرف ایک شرط ہے کہ سیل فون میں بیٹھیں ہو اور انٹرنیٹ کو استعمال کرنے کے لیے بجلی موجود ہو۔ اُردو ڈائجسٹ کو جس رخ پر آپ لے جا رہے ہیں یہ جملے بطور قرض تحریر کر رہا ہوں۔ ہم فرض اور فاضل دونوں کی ادائیگی میں ہمیشہ سستی دکھاتے ہیں۔ نیا شمارہ دیکھ کر منہ سے بے اختیار نکلا ”ماشاء اللہ“، ”الاحول ولا توف“، ”الا باللہ“۔ اب اُردو ڈائجسٹ کا ہاتھ وقت کی فیض پر ہے۔ اُردو کی ترقی اور ترویج اور قارئین کی ذہن سازی میں اس بھرپور

۲۸۲ اُردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۲ء

کردار کا شکر ہے۔

(خوبصورت منظر نویس صدیقی، سفاری ٹاؤن، یکن روڈ، ملتان)

اثر دکھانے میں ۷۷ سال لگ گئے کیا؟

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ایک اور تحریر ارسال خدمت ہے۔ اگر اُردو ڈائجسٹ کے معیار کی ہوتو شائع کر دیجیے گا۔ ایک دو اور موضوع بھی پانچ لائن میں ہیں، حوصلہ افزائی پر اثناء اللہ وہ بھی بھیجوں گا۔ ماشاء اللہ پوچھ سناٹھ اور ستری دہائی کی یاد دلانا رہا ہے، جب یہ اپنے عروج پر تھا۔

مارچ کے جن خیال میں انک کے عہد القیوم صاحب نے اُردو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے! اس میں کوئی شک نہیں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، جو اس میں نہیں سکتا مگر اس طرح ایک اور تقریر میں چلے جانا شکوک و شبہات پیدا کر دیتا ہے۔ عہد القیوم صاحب، اُردو رسالے کی عمر میں بل کیٹ کو ملنے امریکا کی تھی، اگر آپ کے خیال میں اُسے خدا خواست وہاں کچھ دیا ہوگا، تو کیا اس نے اپنا اثر دکھانے کے لیے سات آٹھ سال لگ دیے۔ اگر کچھ دھونڈنا ہی ہے تو انبار میں نہیں بلکہ اینٹوں میں تلاش کیجیے۔ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو بڑے غلوس سلام عرض ہے۔

(سلطان مسعود احمد، بہاولپور)

اُردو ڈائجسٹ میرا میکہ ہے

الطاف صاحب سے تو ہماری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ جس دن ان کا کالم چھپتا ہے، وہ پڑھا اور ملاقات ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب سے طویل عرصے سے بات نہیں ہوتی لیکن غرضتہ مہینوں سے اُردو ڈائجسٹ میں جو تہذیبی آئی آئی نے مجھے قلم اٹھانے



پر مجبور کر دیا ہے۔ پہلی خوشی تو اس بات کی ہوئی کہ جیسے ہم اپنی جوانی اور اوجھڑ عمری میں اسے ہر سال، ہر یک شاپ، ہر جنرل سٹور پر پڑا ہوا دیکھتے تھے، اس کی وہ حیثیت اب لوٹ کر آ رہی ہے اور یہ ہمارے لیے بہت خوش آئند چیز ہے۔ میرے خیال میں اختر عباس جیسے جوان خون نے اس میں رنگ دوڑا دیا ہے۔

مضامین میں بڑا تنوع ہے، جدت ہے۔ عصر حاضر کے نئے تقاضوں کے مطابق رنگ و روشنی کی کمی پوری کی گئی ہے۔ ایک عرصے بعد میں نے اسے پورا پڑھا۔ کہانیوں نے جکڑے رکھا۔ سفر ناموں نے محفوظ کیا۔ ست رنگ بھی کیا خوب سلسلہ ہے۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ اسے ہمیشہ عروج رہے۔

میری ترقی پند ادبی سہیلیاں اُردو ڈائجسٹ کو ہمیشہ میرا میکہ کہتی ہیں۔ مجھے بھی اپنے اس میکہ پر برتاؤ ہے۔ الطاف صاحب کی بیگم شاہدہ ہوں، ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بیگم کبیر اعجاز ہوں یا ڈاکٹر صاحب کے بچے، ہمیشہ محبت اور احترام دیتے ہیں۔ عزیزم اختر عباس سے تعلق بھی برسوں پرانا ہے۔ سعادت مند ہے ہمیشہ دعا میں لیتا ہے۔ اس کی اہلیہ کے افسانوں اور ناولوں کی تو میں دل سے (سلسلی عوان، عوان ٹاؤن، لاہور)

شکر گزار کیسے ہوا جائے

سب سے اچھی بات یہ ہے کہ رسالہ اب آن لائن دستیاب ہے۔ کل زمین بہت ہی اچھا تھا مگر دل بہت بوجھل رہا۔ ڈائجسٹ کا معیار، مضامین کی خوب صورتی اور کہانیوں کے معیار سے بنتا ہے۔ میں نے ایک آئینکل شکر گزار کیسے ہوا جائے بھیجا ہے۔ (رخسانہ شہر)

خوش خبری ہے صابروں کے لیے

اُردو کے بارے میں سب سے پہلے میں نے اس وقت پڑھا تھا جب پہلا مضمون اُردو ڈائجسٹ میں آیا تھا۔ اب بناری کے بارے میں خبر چھیل کے ذریعے ملی تھی۔ میں

اور تمام اہل خانہ بیٹی کی صحت کے لیے دعا کرتے رہے۔

اب جیسے جیسے میں اُردو کے بارے میں پڑھ رہا ہوں جذبات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔

میری اہلیہ گھر کے باہر گئی تھی وہ اک میرے پاس بیٹھ چکی ہے اور مجھ سے کچھ بات چیت کر رہی ہے۔ میں بے دھانی میں ہاں ہوں کر رہا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے جذبات پر قابو مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ آنسو بڑی مشکل سے روکے ہوئے ہوں۔ اہلیہ خفا ہو کر اٹھ جاتی ہے۔

رپورٹ ختم ہوتی ہے۔ اہلیہ کے اٹھ کر جانے سے میرے وہ آنسو جو میں بڑی مشکل سے ضبط کر رہا تھا، وہ سارے بندھن توڑ کر بہہ نکلے۔ خوب جی بھر کر رونا اور شام تک جی بہتی ہی بھاری رہا اور آنکھوں میں جی برق راری۔ میرے پاس رندھاوا شیلی کا نمبر نہیں ہے۔ میرے یہ احساسات اور جذبات کمرل احمد کریم رندھاوا اور اُردو کے والدہ تک پہنچا دیں کہ میرا کہتا ہے ”اُردو خوش خبری ہے صابروں کے لیے“۔

(نظر آقبال، بیٹا سرفراز بخشوی سکول چک ملک تحصیل ملتان کجھل)

عہدہ ٹائٹل

ٹائٹل بے حد عمدہ تھا اور اس پر سرخیال اس سے بھی عمدہ۔ کوئی نہ بھی پڑھنا چاہے آپ پر حوا لیتے ہیں۔ اسلامی زندگی کی لکھناں بہت پسند آئی۔ جس شاہ کا آتما مارک ہو۔ اب ماشاء اللہ وہ کالم نگار ہو گئے ہیں۔ قارئین کے لیے نئے نئے موضوعات یہ عمدہ تحریریں ملیں گی۔ کیا میں چیزیں طباعت کے لیے ای میل کر سکتا ہوں۔

(ضرور کر سکتے ہیں اعجاز صاحب)

(سید اعجاز احمد، فیڈرل بی ایریا کراچی)

1. Deposit-at-call (issued from the schedule Bank) for the amount noted against the work shall have to be attached with the tender documents.
2. No tender will be accepted which is received telegraphically or by post.
3. No tender will be issued after prescribed date of tenders.
4. No conditional tender will be accepted / entertained.
5. No tender will be issued to the contractor whose progress on the works already in hand is not up to the mark.
6. The lowest bidder who will quote the rates less than 5% of the approved estimated cost (DNIT) of the work, then shall have to deposit the additional performance security in accordance to the Govt. of the Punjab C&W Department Notification No. SOB-1 (C&W) 2-37/9 dated: 29-12-1999. In case of failure to deposit the additional performance security within 15 days from the date of approval of tender would result into forfeiture of earnest money (CDR) without further notice and tender shall stand cancelled automatically.
7. Rates quoted by the Contractor in the bid schedule must be clear and should not beyond 2 decimals. Tender rates beyond 2 decimals shall be rejected.
8. Detailed particulars of the works can be seen in the office of the undersigned on the working days during office hours.
9. The District Tender Board reserves the rights to reject any or all tenders without assigning any reason.

Date of issue of tender documents = 15-04-2012 upto 01:00 PM
Date of receipt of tender documents = 17-04-2012 upto 01:00 PM

SR#	NAME OF WORK	ESTIMATED COST (M)	EARNST MONEY	TENDER FEE	TIME LIMIT	T.S.NO. & DATE
SCHEMES APPROVED UNDER DISTRICT ADP FOR 2011-12.						
1	Const. of M/R from N-5 365/WB road to girls Degree College 365/WB (Missing Link) Length=0.60 K.M.	2.495	49,900/-	1,248/-	06-Months	D.O Roads Letter No. 4454 dt: 15-03-2012

Note: In case of Holiday, next date of working day will be considered.

IPL # 4007

(Fida Hussain Bhutta)
Secretary DTP District Officer Roads
Highway Division, Lodhran

دادا حضور ۱۰۰۰ رسال کے ہو گئے

میرے سر کا نام "لطیف احمد" ہے۔ اس سال ۲۰۱۲ء میں میرے سر اپنی زندگی کی ۱۰۰ برہاریں مکمل کر چکے ہیں۔ جو اپنی عمر کا سال بہ سال ورق اٹھتے اٹھتے اپنی صدی کا ورق الٹ دیں۔ میرے سر ایسے ہی خوش نصیبوں میں شامل ہیں۔ اس تاریخی موقع پر میں نے اپنے محبت بھرے جذبات کا اظہار ان صفحات میں کیا ہے جو اس خط کے ساتھ پیوست ہیں۔ آرڈو ڈیپارٹمنٹ ۳۳ سٹیشنوں سے ہمارے خاندان میں باقاعدگی سے پڑھا جاتا ہے۔ میرے والد محترم اس کے اولین قارئین میں سے ہیں۔ انکو کھولی تو آرڈو ڈیپارٹمنٹ سے تعارف ہوا اور اب میری بیٹی کے نام سے یہ رسالہ باقاعدگی سے ہمارے ہاں آتا ہے۔

(آپ کے دادا اور سنی سلامت اور اللہ کے ہاں درجات کی بلندی کے لیے ہماری بھی دعا میں ہیں۔)
(تازہ شاہدہ سیمینا صاحبہ ٹاؤن رہبرمان آباد، راولپنڈی)

قیمت معیار کے حساب سے

میں ۱۹۶۸ء سے آرڈو ڈیپارٹمنٹ پڑھتا آرہا ہوں۔ دلچسپی جناب الطاف صاحب کے اداریوں بلکہ نہایت دلیری سے کیے گئے تعمیری تہوں کو پڑھنے کی عادی ہو کر رہ گئی ہے۔ بانی مواد خال خال دیکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن اب تو ماشاء اللہ ہر صفحہ معلومات اور انکشافات کا منبع نظر آتا ہے حالانکہ سب پر متفق نہیں ہوا جا سکتا۔ مدغم شہم میں لکھے گئے بعض باریک کالم اور ٹیڑھی لکھی ہوئی لکھائی والے عنوانات اگر سیدھے کر دیے جائیں تو پڑچہ زیادہ خوبصورت نظر آئے گا۔ قیمت موجودہ معیار کے حساب سے اگر ۱۰ روپے بھی ہو جائے تو جائز ہوگی بشرطیکہ معیار اور خصوصاً محبت و وفا، اسلام اور کوشش اسلامی نظام کو قریب تر کرنے سے ہی پختہ تر ہوتا چلا جائے۔

(ڈاکٹر ملک محمد عظیم۔ شیخوپورہ)

DISTRICT GOVERNMENT LODHRAN, (WORKS & SERVICES DEPARTMENT)

SHORT TENDER NOTICE.

Sealed tenders based on item / percentage rates are hereby invited for the works mentioned below from the contractors / firms enlisted / renewed with District Government (Executive District Officer Works & Services Lodhran), Chief Engineer Punjab DS&M Department Lahore as well as Secretary to Government of the Punjab, C & W Department Lahore. (C-4 & above) in the field of highway works for the financial year 2011-12 and have paid their renewal / enlistment fee with the Department.

Tender documents can be obtained / purchased from the District Tender Board as notified by the Government of the Punjab, LG & CD Department memo No. S.O.D.G.(Dev)/LG/9-7/2009 dated: 13-12-2010, on 15-04-2012 upto 01:00 PM in the Committee Room of office of the District Coordination Officer Lodhran on the written request accompanied with the attested copies of PEC license 2011 enlistment / renewal letter, C.N.I.C. of contractor / Managing partner of the firm along with the power of attorney and on payment of prescribed tender fee @ 0.050% of tender / enlisted cost which is not refundable.

Tender documents will be received on 17-04-2012 at 01:00 PM in the Committee Room of office of the District Coordination Officer Lodhran in the presence of Convener / Members and Secretary of District Tender Board and also intending

اور ہم اس پر بات بھی نہیں کرتے

جیل روڈ کے پل سے نہر کی طرف مڑنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ اشارہ مل چکا تھا، دائیں یا بائیں سے گاڑیاں تھامنا سب سے بھائی کر زمر تھیں اور میں خوف کے عالم میں گاڑی کا بوتھ کھول کر انجن میں لگی آگ دیکھ رہا تھا۔ ایک فیوڑی تار چلنے سے آگ کا شعلہ لپکا تھا، جس سے میں شعلہ نکلا دیکھ کر آگ لگے آگے بھاگنے والا تھا، بوٹ سے نکلے دھوئیں نے انہی قدموں پر روک دیا تھا۔ بوٹ کوئلے تک آگ کہیں کے سنڈر تک پہنچ چکی تھی، پہلا خیال یہ آیا کہ اگر آگ نہ بجی تو چند من میں بس کی کٹ سے ہوئی ہوگی آگ سنڈر تک پہنچ جائے گی اور گاڑی جہاں سے ہے پھٹ جائے گی۔ ایسی آگ پانی سے نہیں بجتی۔



در دل پہ
دستک
اختر عباس

اور تو کچھ نہ سوچا بوٹ سے نکلنا اور خوف، بے یقینی اور جنون کی سہ آغوش ہوئی کیفیت سے آگ پر پل پڑا اور گاڑی اس سے ٹکڑ رہی تھیں۔ لوگ دیکھ رہے تھے، شاید شہور سے بھی دے رہے تھے مگر اس کیفیت میں جب زندگی گھول کر برزق بننے والی ہو، یہاں تک اور طرف نہیں جاتا۔ ایک صاحب نے گاڑی روک کر اپنی اہلیہ سے پانی کی بڑی بوتل لے کر مجھے تھمائی۔ میں نے ممنوعیت پھری لگا دی۔ وہ انہیں دیکھا اور دوبارہ میٹ کو انجن پر زور دے مارنے لگا۔ پھر اچانک ہی چڑھ ہوا، ایک آدمی نے تھما لیا کہاں سے دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سی مٹی لے کر آیا اور آگ بے ڈالنے لگا پٹی ڈالتی گئی، آگ کی شدت جھپٹتی گئی اور میرے رکے ہوئے سانس واپس آنے لگے۔ آگ جھپٹ کر ٹریفک جھم جھم مچ گئی، شعلہ دوبارہ بند ہو چکا تھا۔ میری نگاہیں

کاروبار حکومت ہو یا کاروبار زندگی، دھوکا دینے والے یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ انہیں اصولوں کی خبر نہ تھی۔ بحیثیت قوم میں نہیں کہیں کوئی بہت جوہری کی درپیش ہے کہ جس کے باعث اقتصاد و منصب کے اعلیٰ درجوں پر فائز اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی کام کر رہے ہیں جو ایک عام کم وسیلہ، کم علم کم فہم اور کمزور ایمان و یقین والے دیہاڑی دار سے سرزد ہوتے ہیں۔

اگر صرف پیسے اور تھوڑی سی اچھی زندگی کے لیے دھوکا دہی ہی زندگی کا کل ٹھکانہ ضرر تو دنیا میں بیسیوں ایسے لوگ کسی تو زندگی میں جنہوں نے بے اصولی اور دھوکے سے اپنے ہی کام اور فیصلے کو اوروں سے ہونے دیا۔ وہ ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ کسی کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ اصل میں تو یہ خود کو دھوکا ہے وہ چاہے کر دھوکا اربوں کا ہو یا دس بیس روپے کا۔

ابھی چند روز جاتے ہیں ڈاکٹر زبیر علی سے ذرا پہلے ایک سائیکل والا دس روپے میں جیل گمشدہ بیچ رہا تھا۔ ٹریفک کی لائین میں لگی ایک گاڑی کا شیشہ ٹپپے ہوا اور ایک صاحب نے ۲۰ روپے دے کر گھنچھڑوں کے دو لفافوں کی قیمت ادا کر دی۔ یہ صدقہ ہے کہ قیمت اور بے حیثیت گوشت کی کم ترین قیمت تھی جو ادا کر دی گئی۔ اس آدی نے سائیکل کے ہینڈل سے لگے دو لفافے اتارے اور انہیں فٹ پاتھر پر خالی کر دیا۔ اب یہ ان کوں یا جیلوں کے لیے تھا جو ذرا دور بیٹھے لپٹائی لفافوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کٹل آن ہوا۔ پھلے اور کرنے والی گاڑی یوٹی بیل عبور کر کے لفافوں سے اوجھل ہوئی، وہ سائیکل والا کسی جھوٹے جانور کی طرح ان گھنچھڑوں کی طرف لپکا جو اب اس کے نہیں تھے، جن کی وہ قیمت لے چکا تھا۔

میں کی دیر بریک لگا کر ٹھانکی باندھے اسے پوری عورت سے جھپٹے ہوئے اٹھے کر کے انہی لفافوں میں ڈالتے دیکھ رہا تھا جنہیں وہ پچھو در پہلے چھپک چکا تھا۔ اس میں اس کے ہاتھ پر کسی احساس بزم، کسی کمی کی جھوٹے نمایاں ہوئی تھیں کہ دیکھنے کا منتظر تھا۔ جو بھی اس کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں، اس نے مجھے کھورتے پایا تو کھجرا کر ایک کمینی ہی سکراہٹ سے اپنے فعل کا دفاع کرنے لگا۔ دھوکا دہی امیر کے تو بڑی، غریب کر کے تو شاید بہت ہی بڑی۔ سیانے کہتے ہیں کہ اس کے

پاس تو ہمیشہ سے دیانت، توکل اور ایماندار کی کار زیادہ سراہا ہوتا ہے۔ اس کے اندر تو لالچ اور کمینگی کی جگہ ہی کم ہوئی چاہیے۔ اشتقاق احمد اس کے باکل برکس کہتے کہ غریب آدمی کے دلے بننے میں یہی مشکل سال ہوئی ہے کہ اس کے اندر سے لالچ اور مزید کی طلب نہیں جاتی۔

تاریخ میں ایسے لوگوں اور قوموں کے ساتھ جو سلوک ہوتا رہا ہے، بے شک وہ کوئی خفیہ سبق اور داستان نہیں ہے مگر حیرت تو اس بات پہ ہوتی ہے کہ تاریخ بنانے والے بھی پورے دھڑلے سے اسی کام میں جُتے ہوئے ہیں اور پڑھنے والے بھی۔ ملک کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز دونوں شخصیات کے قصے زبان تو دعاء میں ملانے کا اتفاق ہو تو "جانے نہ جانے ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے،" والا مصرع ہر دوسری زبان میں ملتا ہے۔

میں نے پہلے بھی اس حوالے سے اتنی پریشانی محسوس نہیں کی۔ کتنے ہی اچھے بڑے اور دیکھے، جاہ حاکم رعایا کا عکس ہوتے ہیں، کہہ کر معاملہ نمٹانے کو دل نہیں مانتا۔ زوال کی شدت بڑھ جائے تو دکھ اور درد کی شدت بھی تو بڑھتی چاہیے۔ پہاڑی چوٹی سے فرد گرے یا قوم، اسے گرتے دیکھنا کوئی بہت سختی دینے والا معاملہ نہیں ہوتا۔ میں تو کوئی روکنے والے، داکٹس کھڑی کرنے والے، احساس دلانے والے اپنی کم آنکھوں سے بولتے اور روکتے نظر آئیں۔

ہوامیہ کے عہد زریں میں بارون الرشید کا نام جگ جگاتا ہے۔ اس کے عہد کے بے شمار اچھے بڑے واقعات میں سے ہر کوئی اپنی مرضی اور فتنے کے مطابق انتخاب کرتا ہے۔ مجھے بھلول مہذب یاد آئے۔ جو انسانی رویوں کی کمزوریوں اور کمزوریوں کو دیکھ رہے تھے۔ بڑے کام اور پتے کی باتیں کرتے تھے۔ ایک بار خلیفہ نے انہیں ایک چھتری دیتے ہوئے بھرے دہار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جو ہمیں ہونے سے بھی زیادہ بے وقوف نظر آئے، اسے دے دینا۔" انہوں نے سب کی طرف دیکھا اور پھر خلیفہ سے پوچھا "یہ ہاتھ بڑا بڑا فتنہ اور تمام کیوں متع ہے؟" خلیفہ نے سوال کو کم قیمت ہی نہیں کم تر جانا اور بولا "ایک چھوٹے سے سفر کی تیاری کا مرحلہ درپیش ہے تم اس کی اہمیت کو کیا جانو۔" بھلول نے دیر سے سے چھتری بارون الرشید کی طرف بوجھاتے اور اسے

تھماتے ہوئے کہا ”تلاش کے لیے کسی اور طرف جانے کی ضرورت اور حاجت ہی کہاں ہے۔ اتنے سے سفر کی اتنی بڑی تیاری۔ اور وہ جو سب سے بڑا سفر درپیش ہوگا اس کی تیاری تو یقیناً اس سے بڑی کی ہوگی۔ اگر جواب ہاں میں نہیں ہے تو پھر اس چھڑی پہ کسی اور کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟“ زمانہ اچھا تھا، دل بھی اچھے اور نرم ہوتے تھے۔ چھڑی کی نوک سے زیادہ جملے کی نوک اثر کرتی تھی۔ ہارون الرشید کی آنکھیں اس نرمی کا ساتھ دے رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا لیے سفر کی تیاری تھی ہی نہیں۔ البتہ ہم جو ”عقل کل“ ہیں، ہر سفر کی مثل تیاری کا سوچے بیٹھے ہیں۔

ایک لمحے کو اگر اہل سیاست اور اہل صحافت کو الزام دیے بنا بات مکمل کرنی ہو، کسی کو زندگی کی گاڑی کے بوٹ کے نیچے سے نکلے سیاہ دھوئیں کی لکیر دکھانی ہو تو کون ہے جو پانی، ریت اور فٹ میٹ سے اس آگ کی طرف لپکے؟ چند ہفتے پہلے اگر وہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید میں اپنے ساتھ جیتے گھٹنے ہی چھوٹے چھوٹے دھوکے اور دمبھدیاں بھی بھولا رہتا۔ نیویارک مین ہٹن میں ڈان ٹریول کے مالک مشتاق چودھری نے کل ایسی بات سنائی کہ جس نے کتنی ہی زخموں پر پھار رکھ دیا۔ ان کے برسوں کے دوست اور بزنس پارٹنر جن کا تعلق ایک عرب ملک سے تھا، اس نے ایک ہلکے سے قانونی سقم کا سہارا لے کر انہیں ایک جنیش قلم بزنس سے ہی باہر کر دیا تھا۔ انہوں نے دوست کی بدلی ہوئی نیت اور آنکھیں دیکھیں تو خاموشی سے اٹھ آئے، ہاں رک کر بولے تو صرف اتنا کہا ”برادر وحید! آپ کو یاد ہوگا عمرے کے دوران مکہ جاتے ہوئے آپ کی بس والے سے کتنی اور پھر تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ آپ نے ناراض ہو کر ویرانے میں بس کر کوئی تھی اور یہ کہہ کر اتر گئے تھے ”حسبنا اللہ ونعم الوکیل“ اور سعودی بس ڈرائیور آپ کے پیچھے مٹیں کرتا پھرتا تھا یا شیخ معاف کر دو یہیں بدلے لو۔ اللہ کو بیچ میں لا کر مجھے بربادی کے گھاٹ مت چڑھاؤ۔ وہ مصری تھا، اس لیے جانتا تھا اللہ پہ معاملہ چھوڑنے، اس سے مدد مانگنے اور اس کو وکیل کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس لیے عرب میں غصے اور دھوکے کے دوران کوئی یہ جملہ کہہ دے تو بڑی سے بڑی لڑائی رک جاتی ہے۔ ہمیں اپنی زبان نہیں آتی، عربی کیا آئے گی اور عرب کی ذہانت اور دانائی تک پہنچنا تو دور کی بات ہم اپنے مولا کی کتاب کے چار لفظوں کے معانی

تک نہیں جانتے، تپ کر کیوں کر رہ سکتے ہیں۔ وہ جس نے معمولی فائدے کے لیے دوستی، اعتبار سب قربان کر دیا تھا۔ تب مشتاق صاحب کی بات سن کر خاموش رہا تھا۔ آج ایک گردہ گنوانے کے بعد دوسرے گردے کی سلامتی کے لیے لرزاں و ترساں ہسپتال میں پڑا زندگی اور موت کے بیچ میں جھول رہا ہے اور سوچتا ہے دھوکے سے خیر کیوں نہیں پڑتی۔ مشتاق صاحب کا حوصلہ اور ظرف دیکھیے، بولے، اگر وہ میری زندگی میں اللہ کے پاس چلا گیا تو میں نے سوچا ہے اس کا دھوکا اور قرض سب معاف کر دوں گا۔ ہم سارے تو شاید ایسا کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے کوئی اور چارہ نہیں پاتے تو دھوکے کھا کر عدالتوں کے دھکے کھانے پہنچ جاتے ہیں۔ جس رسول کی ہم امت ہیں۔ ان کے مبارک ہونٹوں سے ایسے لوگوں کے لیے ناراضی سے نکلا ”مَنْ عَسَا فَلَيْسَ مِنَّا“ جس نے دھوکا دیا، وہ ہم سے نہیں۔

مجھے بھی یہ ساری باتیں یاد نہیں آتی تھیں اگر چند ہفتے پہلے وہ دل دہلا دینے والا واقعہ نہ ہوا ہوتا جب ڈبن پورہ کے دو بھائیوں نے ۱/۲ اکرے کے پلاٹ کے لیے ایک روز دھوکے سے اپنی اس بوڑھی ماں کو چنگ جی پہ بٹھایا جو کبھی گھر سے باہر گئی تک بھی نہیں آئی تھی۔ اس کی گود میں پوتے کو لٹایا اور کافی دور جا کر ایک بیٹا رکشے سے اترا۔ پھر کچھ دیر بعد دوسرا بیٹا بھی اپنا بچہ لے کر یہ کہتے ہوئے اتر گیا۔ ”ماں بیٹھو میں ابھی آیا۔“ جب بہت دیر گزری اور رکشے والے نے بوڑھی مائی کو اترنے کے لیے کہا تو اس نے کہا، میرے بچوں کو آ لینے دو۔ تب رکشے والا بولا تھا ”اماں وڈیے! ابھی چوروں کی طرح اتر کر بھاگنے والے بھی واپس آتے ہیں۔ چلو تمہارے ساتھ بھلا یہ کرتا ہوں کہ تمہیں بے آسرا عورتوں کے دارالامان چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ ان پڑھ عورت جو بڑھاپے کی آخری منزل پہ بیٹھی تھی، یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کا گھر کہاں ہے اور راستہ کدھر ہے؟ بیچ راہوں میں گئے چھوڑ کر چلے جائیں یا پرانے دھوکا دے جائیں، غم دونوں صورتیں میں بہت ہوتا ہے۔ مگر کیا کریں اب غم کی شدت اور حدت دونوں بڑھتی جا رہی ہیں اور ہم اس پر بات بھی نہیں کرتے۔ مجھے بھی بات کر کے اندر سے پچھتاوا سا ہورہا ہے۔ کتنی بار تو یہ بھول مجھ سے بھی ہوئی ہوگی۔ میں کدھر جاؤں؟ بہلول کی چھڑی کی نوک بری طرح چھ رہی ہے!

